DUE DATE

Cl. No. Acc. No.

Late Fine Ordinary books 25 Paise per day. Text Book **Re. 1/-** per day. Over Night book **Re. 1/-** per day.

افسانہ نمبر

ادب لطیف

نگران:-

فیض احمد فیض

ایڈیٹر:-

چوہدری برکت علی بی۔ اے

چوہدری نذیر احمد

مکتبہ اُردو لاہور

قیمت ۱۲ر

انڈللہ

جدید ہندوستانی ادب

کے

ہر مدرسۂ فکر کو آپ اِس میں پائیں گے

ترقی پسند افسانہ نگاروں شاعروں اور مقالہ نویسوں کے خیالات

کا البم

نئے زاویئے

مرتبہ:- کرشن چندر ایم، اے

ہندوستانی ادب کے موجودہ دَور کے ہر بڑے مصنف کی تحریر اس کتاب میں موجود ہے

فہرست:- راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، علی عباس حسینی، ایس ایچ واتسائن، ن م راشد، احمد علی، احمد عباس، احمد ندیم قاسمی، موہن سنگھ، فیض احمد فیض، دیوندر ستیارتھی، ملک راج آنند، پریش دھرم، کاشی آنند، اختر اورینوی، ممتاز مفتی، گوپال متل، شیلا سمیر، شانتا کیرتن، سہیل عظیم آبادی، سنت سنگھ سیکھوں، سلام مچھلی شہری، حیات اللہ انصاری، اوپندر ناتھ اشک، مطلبی فرید آبادی، میراجی، پریم چند، حسن نذیر، احسان دانش، جوش ملیح آبادی، اسرار الحق مجاز، کرشن چندر ایم، اے

بہترین طریق سے مجلد ؏ / بلا جلد ؏

ناشران

مکتبۂ اُردُو لاہور

فہرس

جلد نمبر ۱۳	مئی - جون سنہ ۱۹۴۱ء	شمارہ ۳ و ۴

اردو میں علم و ادب کا معیاری رسالہ

ادبِ لطیف

(ماہ جولائی ۱۹۴۱ء سے رسالہ کا نیا دور)

نگران

پروفیسر فیض احمد فیض

ماہ اکتوبر سے مندرجہ ذیل ادبی مشاہیر نے مستقل طور پر ادبِ لطیف کے حلقۂ معاونین میں شمولیت کا وعدہ فرمایا ہے علاوہ ازیں رسالہ مشرقی اور مغربی آرٹ کے بہترین نمونوں سے مزین ہوا کریگا۔

اسمائے معاونین

ڈاکٹر تاثیر	احمد ندیم قاسمی	علی عباس حسینی	گوپال متل
مولانا عبدالمجید سالک	پروفیسر احمد علی	اختر انصاری	حضرت جوش ملیح آبادی
سید امتیاز علی تاج	پروفیسر احتشام حسین	دھرم پرکاش آنند	جناب جگر مراد آبادی
رفیع پیر	پروفیسر آل احمد سرور	حیات اللہ انصاری	فراق گورکھپوری
کرشن چندر	ڈاکٹر رشید جہاں	سید حسن عسکری	احسان دانش
سعادت حسن منٹو	ممتاز مفتی	علی سردار جعفری	ن۔م۔ راشد
راجندر سنگھ بیدی	عصمت چغتائی	ابوالاثر حفیظ جالندھری	اسرار الحق مجاز
سید فیاض محمود	سید مطلبی فرید آبادی	ماہر القادری	سلام مچھلی شہری

مکتبہ اردو لاہور

اشارات

ہمیں انتہائی افسوس ہے کہ افسانہ نمبر کی اشاعت میں اس قدر تاخیر ہوئی اور ہمارے قارئین کو تاشر صبر انتظار کی زحمت گوارا کرنی پڑی۔ علاوہ اور وجوہات کے اس تاخیر کا باعث ایک یہ بھی تھا کہ اس مہینہ کے اوائل میں چوہدری برکت علی صاحب کے والد ماجد اور چوہدری نذیر احمد صاحب کے دادا راہیٔ ملک بقا ہوئے۔ اور خاندانی پریشانیوں اور مصروفیتوں کے سبب رسالہ کا کام کئی دن تک رکا رہا۔ ایسے موقعوں پر فریق ثانی کی معذرت بجا ہی کیوں نہ ہو کبھی کسی طور پر تسلی بخش ثابت نہیں ہوا کرتی۔ مثلاً اگر کھانا وقت پر نہ ملے تو باورچی کی مشکلات پر قطعاً توجہ دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ وہ لاکھ کہے جلانے کا ایندھن ختم ہو گیا تھا یا محلہ کے کنجڑوں نے ہڑتال کر رکھی تھی یا گوشت وقت پر نہیں ملا تھا۔ ہمیں یہ تمام عذرات غیر متعلق اور گھڑے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں۔ کسی رسالہ کے منتظم یا مدیر کی حالت بھی ایسے ہی باورچی کی سی ہوتی ہے۔ فرہاد مرحوم تو ایک بوئے شیر لا کر شہرت جاوید پا گئے۔ لیکن ماہواری رسالہ کے مدیر کو ہر مہینہ ادیبوں کی سہل انگاری اور کم التفاتی کے کئی پہاڑ چیرنے پڑتے ہیں اور بیکار مسودوں میں سے کاہ برآوردن کا سلسلہ اس پر مستزاد۔

افسانہ نمبر کی ترتیب قریب دو ماہ سے جاری تھی۔ لیکن اس مہینہ کی دس تاریخ تک کئی ایک مواعید کے ایفا کا انتظار رہا۔ لیکن ایک اچھے ادیب کا مضمون تو شیکسپیئر کے رحم کی طرح ہوتا ہے جس پر جبر نہیں ہو سکتا اور جو نہ جانے کب برس پڑے۔ مسودوں کی کمی نہیں تھی لیکن جی نہیں چاہتا تھا کہ یہ نمبر ہمارے چوٹی کے افسانہ نگاروں کی نگارشات سے تشنہ رہ جائے۔ کچھ یہ بھی خیال رہا کہ اس نمبر کے افسانے غزل کے اشعار کی طرح بالکل پراگندہ اور غیر مربوط نہ ہوں بلکہ اگر ممکن ہو تو ان میں تنوع کے ساتھ ساتھ ایک تسلسل اور ہم آہنگی کا عنصر بھی موجود ہو تا کہ اس نمبر کو موجودہ اردو ادب کے کسی ایک رجحان یا کسی ایک تحریک کا ترجمان اور آئینہ دار کہا جا سکے۔ تراجم میں بھی یہی بات پیش نظر تھی۔ اس نمبر کے مطالعہ کے بعد آپ غالباً ہم سے متفق ہونگے کہ ہماری کوشش رائیگاں نہیں گئی۔ بیشتر افسانے ہماری روزمرہ زندگی کے کسی نہ کسی پہلو سے متعلق ہیں۔ اور ہمارے سماجی ماحول پر قریب قریب ایک ہی نقطۂ نظر سے تنقیص و تنقید کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان پر وعظ یا خطابت کا دھوکہ نہیں ہوتا۔ رسالہ کی اشاعت میں تاخیر ضرور ہوئی۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ اس کے صفحات آپ کے وقت کا کافی سے زیادہ خونبہا ادا کر دینگے۔ لکھنے والوں میں ڈاکٹر رشید جہاں، پروفیسر احتشام حسین، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک، اختر اورینوی، اختر انصاری، محترمہ شکیلہ اختر، ن م راشد، احمد ندیم قاسمی، علی عباس حسینی، ملک راج آنند کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ تراجم میں روسی، چینی، انگریزی، اطالوی اور دوسری زبانوں کے افسانے شامل ہیں۔ ان کے مطالعہ سے دوسری زبانوں میں افسانہ نگاری کے موجودہ رجحانات کو سمجھنے میں غالباً آپکو امداد ملیگی۔

ہم نہایت مسرت سے یہ اہم اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ آئندہ مہینہ سے ہمارے صوبہ کے مشہور ادیب پروفیسر فیض احمد فیض نے ادب لطیف کی نگرانی اور ترتیب اپنے ذمہ لی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ان کی سعی و اعانت سے نہ صرف رسالہ کی ظاہری اور باطنی خوبیوں میں اضافہ ہوگا بلکہ ہمارے حلقۂ معاونین میں بہت سی ممتاز ادبی شخصیتوں کے نام بھی ایزاد ہو جائیں گے۔ جن میں سے بعض محض اس لئے "منقار زیر پر" ہیں کہ اردو میں کوئی معیاری رسالہ موجود نہیں۔ ڈاکٹر تاثیر، سید امتیاز علی تاج، رفیع پیر، مولانا عبدالمجید سالک، ابوالاثر حفیظ جالندھری، پنڈت ہری چند اختر، ن م راشد، پروفیسر تبسم، ڈاکٹر رشید جہاں، پروفیسر احمد علی، اسرار الحق مجاز اور کئی ایک دوسرے لکھنے والے شرکت کا وعدہ فرما چکے ہیں۔ مشرقی و مغربی آرٹ کے بہترین نمونوں کے علاوہ مبادیٔ تنقید، تاریخ ادب اردو، تلخیصات و تبصرات اور چند ایک دوسرے عنوانات پر اشاعت کا مستقل جزو ہونگے۔ اگلے مہینہ سے 'ادب لطیف' کا ایک نیا دور شروع ہوگا۔

نوٹ:۔ اپریل کے شمارہ میں ادارہ کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ افسانہ نمبر میں ڈرامے بھی شامل ہونگے اور منظوم افسانے بھی لیکن بعد میں چند معاونین کے کہنے پر کہ افسانہ نمبر میں صرف افسانے ہی شائع ہونے چاہئیں ڈرامے اور منظومات روک لئے گئے۔ جو آئندہ اشاعت میں شائع ہونگے۔

ط ا ، م

پروفیسر فیض احمد فیض

ہمارے افسانے

جب مشاعرے ختم ہوئے۔ تو اہلِ ذوق کی دماغی تفریح کا ذریعہ یا تو رومانی اور سراغرسانی ناول بنے یا ماہانہ رسالے۔ انگریزی تعلیم کی عمومیت اور انگریزی ناولوں کی ارزانی نے اردو ناول کو بہت پنپنے نہ دیا۔ اردو میں ناول کی ناکامیابی کی کئی اور وجوہات بھی تھیں۔ مثلاً یہ کہ ہندوستان میں ابھی تک ایک خوشحال متوسط طبقہ اتنی تعداد میں پیدا نہیں ہوا کہ وہ ناول کی سرپرستی کر سکے۔ ہمارے لکھائی چھپائی کے طریقے ابھی تک بہت پسماندہ ہیں۔ اس لئے بہت زیادہ تعداد میں اور بہت ارزاں نرخوں پر ناول چھپ نہیں سکتے۔ چنانچہ موجودہ حالات میں ہمارے ادب کی سرپرستی وہ مختصر کم حیثیت سفید پوش طبقہ کرتا رہا ہے جس کے پاس وقت اور روپیہ دونوں محدود ہیں۔ ان لوگوں میں ماہانہ رسالے بہت مقبول ہوئے اور رسالوں کی مقبولیت کے ساتھ مختصر افسانے بھی لکھے جانے لگے۔

شروع شروع میں یہ افسانے محض رسمی طور پر لکھے جاتے تھے اور بیشتر یا انگریزی سے تراجم ہوتے تھے یا انگریزی کرداروں کے نام اور واقعاتی مناظر کو اول بدل کر انہیں ہندوستانی لباس پہنانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ طبعزاد افسانے اکثر رومانوی یا سراغرسانی رنگ میں لکھے جاتے تھے۔ ان افسانوں کو نہ پڑھنے والے کوئی ادبی اہمیت دیتے تھے نہ لکھنے والے انہیں اپنی ادبی سرگرمیوں کا اہم جزو خیال کرتے تھے۔ اسی زمانے میں دو مشہور مصنفوں نے افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا۔ ایک سید سجاد حیدر یلدرم تھے اور دوسرے منشی پریم چند۔ یلدرم کی پرجوش رومانیت اور پریم چند کی مؤثر حقیقت نگاری نے اردو میں افسانہ نگاری کی بنیاد رکھی اور اس وقت سے لے کے اب تک ہمارے افسانوں میں دو واضح تحریکیں کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایک رومانوی تحریک ہے اور دوسری حقیقت یا واقعیت پسند۔ رومانوی افسانوں میں پہلے پہل پارسی مرد عورتوں کی داستان ہائے عشق بیان کی جاتی تھی اور افسانے کے مناظر اکثر کلکتہ یا بمبئی یا کراچی میں رکھے جاتے تھے۔ جب لوگ ہرمزاد جمشید جی اور زرینہ سے اکتانے لگے اور یہاں پر اونچے طبقوں میں پردے کی قیود ڈھیلی پڑ گئی تو پارسیوں کی جگہ رئیسوں، نوابوں، ان کی بیگموں اور پائیں باغوں نے لے لی۔ رفتہ رفتہ نوابوں اور رئیسوں میں بھی لوگوں کی دلچسپی ختم ہونی شروع ہوئی، مرد اور عورت کے جذباتی تعلقات پر سماجی قیود کچھ اور نرم ہو گئے تو کالج کے لڑکے اور لڑکیوں کے قصے شروع ہوئے ایک طرف لارنس باغ اور دوسری طرف کشمیر یا شملہ کی پہاڑیوں کی منظر کشی ہونے لگی۔ یہ تحریک اب مدھم ضرور پڑ گئی ہے لیکن ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ہمیں اس پر اخلاقی یا فنی نکتہ چینی کا حق نہیں ہے لیکن اول تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو لوگ محض عشقیہ قصے لکھنا چاہتے ہیں انہیں اس قدر دور دراز کی مسافت طے کرنے کی کیا ضرورت پیش آتی ہے عشق تو شہر کی تیرہ و تار گلیوں اور دیہات کے ہرے بھرے کھیتوں میں بھی ہوتا ہے۔ انہیں چھوڑ کر جھیل ڈل اور شملہ کے مال روڈ پر گھومنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ جو عشقیہ معاملات ایسی کہانیوں میں پیش کئے جاتے ہیں وہ قریب قریب ایک ہی جیسے ہوتے ہیں اور ایک ایسے افسانہ نویس کے مضامین کی پونجی دو چار افسانوں کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔

دوسری طرف وہ افسانہ نویس ہیں جو روزمرہ سماجی ماحول کی آئینہ داری یا ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کے پیش رو منشی پریم چند تھے۔ پریم چند کی کہانیوں میں کوئی ارادی صنعت کوئی واضح آرائش و زیبائش نہیں ہے۔ لیکن ان کا مشاہدہ اتنا صحیح، ان کا طرزِ بیان اتنا بیساختہ، انکی اپنی شخصیت اتنی شگفتہ اور انہیں قصہ گوئی کا ایسا فطری ملکہ حاصل تھا کہ انکے اکثر افسانے فنی عیوب کے باوجود فرحت کا باعث ہوتے ہیں۔ کچھ عرصے سے سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں وغیرہ کی کوششوں سے اردو افسانوں میں ایک ترقی پسند تحریک چلی ہے۔ ان افسانوں میں سماجی تنقید کا رنگ غالب ہوتا ہے اور انکے موضوعات بیشتر مزدور، کسانوں اور دوسرے غریب طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ تحریک ترقی پسند اس لئے کہلاتی ہے کہ اس کے رہنما ادب کو محض تفریحی قیمت نہیں دیتے بلکہ اسے سماجی ترقی کا ایک اہم ذریعہ گردانتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ادب کو بے مقصد اور سطحی مضامین سے الجھنے کی بجائے ایسے بنیادی مسائل سے بحث کرنی چاہیئے جو ... سماجی ترقی [illegible] [redacted]

ہے اور جب تک اس نظام کے بنیادی نقائص دور نہ ہوں ہمارے ذاتی مسائل کا حل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ترقی پسند مصنف اپنی تحریروں میں سماج کی طبقاتی کشمکش، دولت اور ذرائع پیداوار کی تقسیم، سماجی ترقی میں مزدوروں اور کسانوں کی اہمیت اور دیگر متعلقہ مسائل پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک بہت وسیع میدان ہے اور جو شدت اور تنومندی ہمارے نچلے طبقوں کے تجربات میں پائی جاتی ہے متوسط طبقہ کی سطحی اور بے رنگ زندگیوں میں موجود نہیں لیکن بدقسمتی سے بہت سے لکھنے والوں کے ذہن میں ترقی پسندی کا تصور ابھی صاف نہیں ہوا اور نہ حقیقت نگاری کے وسیع میدان سے پورا فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ اس رنگ میں لکھنے والے بہت سے نومشق ادیبوں نے اپنے مضامین نہایت محدود کر لئے ہیں اور ان کی تحریروں میں وہی یکسانیت داخل ہوتی جا رہی ہے جس کا الزام وہ رومانوی ادیبوں کو طعنہ دیتے ہیں۔

رومانوی اور ترقی پسند افسانہ نگاروں کے بین بین نوجوانوں کا ایک درمیانی طبقہ ہے جو یا تو محض غیر جانبدار واقعیت پر اکتفا کرتے ہیں یا رومانیت اور واقعیت میں سے کسی ایک نقطۂ نظر کو ترجیح دینے کیلئے تیار نہیں، کبھی ایک طرف جھکتے ہیں کبھی دوسری طرف۔ اس میں شک نہیں کہ افسانہ نگاری ایک مستقل ادبی تحریک بن چکی ہے اور کئی ایک ہونہار لکھنے والوں نے اس صنف کو اپنا واحد طریقِ اظہار ٹھہرا لیا ہے۔ لیکن اگر موجودہ افسانوں اور افسانہ نگاروں کو بحیثیت مجموعی نظر میں رکھا جائے تو چند ایک حوصلہ افزا محاسن کے ساتھ بہت سے دلشکن نقائص بھی دکھائی دیتے ہیں۔ افسانوں کے مضامین کے متعلق میں ضمناً عرض کر چکا ہوں۔ رومانوی افسانہ نگار قریباً سب کے سب اور حقیقت نگار یا ترقی پسند افسانہ نگاروں میں سے بہت سے ایسے ہیں جنہوں نے یہ تجارت بہت قلیل سرمایہ سے شروع کی ہے۔ پرانے لکھنوی شعرا کی طرح یہ لوگ بھی چند ایک مخصوص نسخوں کے مطابق افسانہ لکھتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی تحریروں میں سادگی اور خلوص پیدا نہیں ہوتا۔ پھر یہ ہے کہ بہت سے ادیب ابھی تک اپنے فن کو اپنی ذات سے جدا نہیں کر پائے ہیں۔ مرد عورت کے تعلقات کو ہی لیجئے۔ یہ ایک نہایت اہم عمرانی مسئلہ ہے لیکن ہمارے افسانہ نگار اس پر ایک خارجی، بے تعلق اور صحت مند نقطۂ نظر سے بحث کرنے کی بجائے ان کے بیان سے محض اپنی جنسیاتی بھوک کا اظہار چاہتے ہیں۔ کولھوں اور چھاتیوں کی للچائی ہوئی تصاویر ترقی پسندی کی دلیل نہیں ہے۔ جنسیاتی معاملات پر بالکل بے جھجک بحث ہونی چاہئے اور ان کے متعلق کسی اخفا یا جھوٹی شرم و حیا کی ضرورت نہیں لیکن انہیں معاملات کو اشتعال انگیز حریصانہ انداز سے لکھنا دماغی صحت کی بجائے دماغی بیماری کی علامت ہے۔

مزدوروں اور کسانوں کے متعلق لکھنے والے افسانہ نگاروں پر ایک یہ بھی اعتراض ہوتا ہے کہ وہ اکثر موت، بیماری، غلاظت اور ایسی ہی ناگوار باتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ زندگی کے خوبصورت اور روح پرور مناظر پر مطلق دھیان نہیں دیتے۔ یہ اعتراض بھی کسی حد تک صحیح ہے۔ ایک ترقی پسند مصنف کیلئے لازمی ہے کہ وہ حقیقت کی آئینہ داری کرتے ہوئے اس کے ناگوار اور بدنما پہلو بے نقاب کرے۔ لیکن اس کے لئے داروغۂ صفائی ہونا لازمی نہیں جو غلاظت کے سوا کسی اور چیز سے تعلق ہی نہیں رکھتا۔ اگر اسے مزدور کی بیچارگی اور بے پایاں مفلوک الحالی نظر آتی ہے تو اسے مزدور کی تنومندی اور بیکراں جرأت بھی دکھائی دینی چاہئے۔ اگر اسے مزدور کے غلیظ گھر سے کراہت ہوتی ہے تو اسے مزدور کے دل کے خلوص سے راحت بھی ہونی چاہئے۔ جنسیات کی طرح محض موت اور غلاظت میں دلچسپی لینا بھی دماغی بیماری کی نشانی ہے۔ ایک ترقی پسند ادیب سماجی حقیقت کو بحیثیت مجموعی دیکھتا ہے اور اس کے کسی ایک پہلو میں الجھ کر نہیں رہ جاتا۔

اب ذرا افسانہ نگاری کے فن کو لیجئے۔ عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی نوجوان افسانے لکھنے بیٹھتا ہے تو اس کی عمر کی رعایت سے اسے "ہونہار" "قابلِ قدر" سبھی کچھ کہا جاتا ہے لیکن وہ چاہتا یہ ہے کہ نوعمری کی یہ رعایت اسے تمام عمر حاصل رہے۔ اس میں فن کے متعلق ایک خاص سہل انگاری اور بے احتیاطی آ جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ تمام توقعات جو نقادوں نے اس کی ذات سے وابستہ کر رکھی ہوتی ہیں پوری ہونے میں نہیں آتیں۔ دوسرے فنوں کی طرح افسانہ نگاری بھی ایک اکتسابی چیز ہے۔ جس کے لئے مسلسل کاوش اور دماغ سوزی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے اکثر افسانہ نگار یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اگر انہیں افسانہ کا ایک مضمون سوجھ گیا ہے تو وہ اسے جس طرح بھی چاہے کاغذ پر اتار دیں۔ افسانہ خود بخود ہو جائیگا۔ اب افسانہ خود بخود تو ہوتا نہیں وہ تو میز کرسی کی طرح تراشا جاتا ہے اور اس عمل پر لوگ زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افسانوں میں کئی فقرے بہت مزے کے ہوتے ہیں، کبھی منظر کا کوئی ٹکڑا، کبھی مکالمہ کا کوئی جملہ دل میں اتر جاتا ہے، کبھی افسانہ کا آغاز بہت تسلی بخش معلوم ہوتا ہے، کبھی خاتمہ بہت ڈرامائی ہوتا ہے لیکن مجموعی طور پر افسانے کا کوئی نقشہ یا ڈیزائن نہیں بنتا۔ افسانہ نگاری کے لئے محض قوتِ مشاہدہ یا قدرتِ اظہار ہی ضروری نہیں۔ افسانہ نگاری بھی مزدوری ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ افسانہ نگاری ہمارے ادب کی سب سے کم عمر صنف ہے اور اس صنف نے ایک نہایت ہی مختصر عمر میں ارتقاء کی بہت سی منازل طے کر لی ہیں۔ لیکن دنیا کے ادب میں مستقل حیثیت حاصل کرنے کے لئے ابھی

(ڈاکٹر) رشید جہاں

قانون اور انصاف

شام کا وقت ہے۔ نشاط کلب میں آج بہت رونق ہے۔ سڑک پر دور دور تک موٹریں کھڑی ہیں۔ دیواروں پر ٹینس کے نیچے پردے کسے ہوئے ہیں۔ جو اندر کی کارروائی گندی اور غلیظ ہندوستانی آنکھوں سے چھپائے ہوئے ہیں لیکن پھر بھی کسی نہ کسی صاحب یا میم صاحب یا کسی ہندوستانی افسر پر نظر پڑ ہی جاتی ہے۔ کلب کے سامنے ہاکی کا ایک بڑا میدان ہے جس پر اپنے کئی ہندوستانی بھائی جمع ہو گئے ہیں کچھ چل پھر رہے ہیں کچھ گھاس پر لیٹے ہیں۔ لیکن سب کے سب کلب کی طرف ہیں۔ نہ معلوم وہ کیوں جمع ہیں۔ غالباً پردوں اور موٹروں کی چہل پہل نے اُن میں ایک خواہش ایک جستجو پیدا کر دی ہے اور وہ تماشہ دیکھنے کے انتظار میں جمع ہیں۔

"یار وہ دیکھو بجلی والے صاحب ہیں۔"

"اور میم کس کی بغل میں دبائے ہیں۔"

قہقہہ پڑتا ہے ——

"اجی یہ لوگ بھی خوب ہیں۔ چاہے کوئی میم ہو . . . . . "

"ارے یار اور کیا تیری طرح کہ جورو جب سے لایا ہے . . . ."

"ارے یہ کون ہیں یہ تو کالے ہیں۔ انکا یہاں کیسے گذر ہو گیا؟"

"کوا چلا ہنس کی چال۔ اپنی بھی بھول گیا۔" اس پر بہت زور کا قہقہہ پڑا۔

"اجی وہ دیکھو موٹر سے وہ جج صاحب اترے؟"

"ارے یار بڑا انصاف کرتے ہیں۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی خدا قسم! اُدھر جب میں فتو والی مارپیٹ میں پھنس گیا تھا تو جج صاحب نے صاف چھوڑ دیا۔"

"ایسے سالے چپ بھی رہ نہیں تو کھینچ دونگا ایک ہاتھ فتو سے تو پوچھ . . . . . دودھ کا دودھ پانی کا پانی۔"

"چلو یار چھوڑ اس مردود کو یہاں۔ وہ جنٹ صاحب کی لڑکی تو آتی نہیں نظر آتی۔"

آج جج رابنسن صاحب کی الوداعی پارٹی ہے۔ وہ آٹھ مہینے کی چھٹی پر ولایت شادی کرنے جا رہے ہیں۔ اپنے زمانے کے صحیح جج ثابت ہوئے ہیں کلب میں بہت ہر دلعزیز تھے۔ شہر کے انگریزوں کی تو وہ گویا جان تھے۔ ہندوستانی اعلیٰ افسروں کی پیٹھ بھی کافی تھپک دیتے تھے کبھی کبھار اُن کو کھانے یا چائے پر بھی بلا لیتے تھے۔ اس لئے وہ بھی انکی بہت قدر کرتے تھے۔ باقی "نیٹو" آبادی پر صاحب کا کافی رعب داب تھا بعض لوگ کلکٹر صاحب سے اتنا نہ ڈرتے تھے جتنا کہ ان سے۔ ان کی ایمانداری کی شہر میں بہت کافی دھاک تھی۔ قانون کو تو ایسا سمجھتے تھے کہ صوبہ میں کم جج ان کا مقابلہ کرتے تھے بس یہ کہو کہ قانون کی ترجمانی انکے برابر کوئی نہ کر سکتا تھا۔

کالے آدمیوں سے صاحب لوگ اپنی زندگی کے بارے میں ہزار چھپائیں لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ خبر باہر نکل ہی آتی ہے۔ تین سال ہوئے جج رابنسن چھٹی کا کچھ حصہ شملہ پر گذار رہے تھے۔ کہ وہ ایک مسز بلیک سے ملے۔ مسز سلویا بلیک بیس کیس سال کی خوبصورت لڑکی تھی۔ چند مہینے پہلے ایک کرنل بلیک سے شادی کرکے ہندوستان آئی تھی۔ ویسے تو وہ ہر ایک کے دل میں جگہ کئے ہوئے تھی۔ کرنل صاحب فیروزپور میں تھے اور جلدی جلدی آتے جاتے رہتے تھے۔ بیوی کی وجہ سے اُن کی بھی سوسائٹی میں بہت پوچھ تھی۔ لیکن جب رابنسن صاحب وہاں پہنچے تو دو تین دن ہی بعد دونوں میں اتنی بے تکلفی ہو گئی کہ خاصے دوست ہو گئے۔ اور بہت جلد دوستی عشق کی حد تک پہنچ گئی۔ رابنسن اُن خوش قسمت انگریزوں میں تھا جس پر کئی عورتوں کی آنکھ تھی۔ اور رابنسن جہاں جاتا ان کی آنکھوں کا تارا بنا رہتا تھا۔ عشق ایک نہیں کئی ہوئے تھے شادی شدہ غیر شادی شدہ ہر قسم کی عورتوں سے۔ لیکن یہ بھوت ہی کچھ اور تھا

اور مسز بلیک تو بس دنیا و مافیہا کو بھول چکی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا سوسائٹی میں خیال رکھا جاتا ہے کہ پردہ فاش نہ ہو۔ اس کو تو یہ کھیل جیسے آتا ہی نہ تھا۔ وہ ایک کھلی ہوئی کتاب تھی جس کا جی چاہے پڑھ لے۔ ہر جگہ بیگ رابنسن ملا ملا ہوا تھا۔ رابنسن نے اس کو سمجھایا بھی۔ اس کا جواب یہی ملا "مجھے تو کوئی ڈر نہیں۔ تمہیں ڈر ہو تو مجھ سے نہ ملو۔"

آخر کو اور بھی عورتیں ہوٹل میں تھیں جن میں سے اکثر رابنسن پر جھپٹی ہوئی تھیں لیکن سلویہ بلیک کے حسن سے تار کھائے بیٹھی تھیں۔ عشق بازی تو ہوٹل میں چلتی ہی رہتے تھے۔ چھیڑ چھاڑ ہنسی مذاق چھپ کے ملنا۔ یا آپس میں اتنا گناہ تو کچھ برا نہ تھا۔ لیکن اتنا کھلم کھلا عشق وہ بھی ایک شادی شدہ عورت۔ تو سوسائٹی کیسے برداشت کر لیتی۔ پہلے چہ میگوئیاں ہوئیں پھر باتیں ہوئیں۔ آوازے کسے گئے کرنل صاحب بھی ہنستے۔ بیوی کو کبھی اور دیکھا۔ بات کوئی نئے لیکن آخر کہاں تک۔ ایک روز مسز بلیک شہر سے غائب ہو گئیں۔ تین دن سہارنپور رہ کر آئیں۔ پتہ لگانے والوں نے لگا ہی لیا۔ پھر ادھر دونوں کا ڈبہ بھی نکل گیا۔ رابنسن ہندوستان میں تین سال سے تھا۔ اونچ نیچ کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ لیکن پھر کیا کرتا — مجبور تھا۔ جیسے اختیار میں نہ تھی۔ معاملہ طشت از بام ہو گیا۔ اور آخر کو مسز بلیک گھر چھوڑ کر کھڑی ہوئی۔ کرنل بلیک کو بھی ضد پڑ گئی۔ کہ وہ ضرور رابنسن پر اپنی بیوی کو بھگا لیجانے کا دعویٰ کرے گا۔ بلکہ اس نے وکیلوں وغیرہ سے باتیں بھی شروع کر دیں۔ رابنسن بہت چکرایا۔ لیکن کرتا تو کیا معاملہ بہت بگڑ چکا تھا۔ خود کرنل سے ملا۔ دوستوں سے کہلوایا لیکن بلیک اپنی ضد پر اڑا رہا۔ اس طرح دو انگریزوں میں کھلم کھلا مقدمہ بازی کرنا انگریزی رعب داب میں فرق ڈالنا تھا۔ لہذا ادھر گورنر تک اور ادھر کمانڈر انچیف کے کانوں تک خبر پہنچائی گئی۔ ایک زبردست دباؤ کے بعد کرنل صاحب راضی ہوئے کہ وہ بجائے رابنسن پر دفعہ ۴۹۶ کا مقدمہ چلانے کے اپنی بیوی کو طلاق دیدیں گے۔ اور مسز بلیک کو فوراً ولایت روانہ کیا گیا کہ وہ جب تک طلاق کی کارروائی پوری نہ ہو وہیں رہیں۔

اس عرصہ میں کہ طلاق کی کارروائی جاری تھی رابنسن ولایت ایک مرتبہ ہوائی جہاز سے اپنی معشوقہ سے مل آئے تھے۔ اب وہ آٹھ ماہ سے نیچے جا رہے تھے۔ ایک ایک لمحہ ہندوستان میں کاٹنا مشکل تھا ——

چلنے سے پہلے سلویہ کا ایک تار ملا تھا: "تم کو وینس پر مل جاؤں گی۔"

اس تار نے رابنسن کو بالکل ہلا دیا۔ وہ بہت دیر تک سر جھکائے سلویہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ کیا عورت ہے؟ غضب کی۔ پہاڑوں کی چاندنی راتیں۔ ہوٹل میں چھپ چھپ کر ملنا۔ ہزاروں نگاہوں سے چھپ کر راتوں کو اس کے پاس آنا۔ بیگ کی نگہداشت کے باوجود بھی آنا۔ اور پھر اس کی گود میں سر رکھ کر اس سے کہنا "کیا کروں بہت کوشش کرتی ہوں لیکن جیک تم سے محبت نہیں جاتی۔" اس کا خیال ہی چکرا دیتا تھا۔ اور پھر وہ ہاتھ۔ وہ گردن وہ جسم! جب وہ پہلی دفعہ اس کے ساتھ آئی تھی تو کیا کچھ ہیجان ہوٹل میں نہ ہوا تھا۔ لوگوں نے کیا کیا ناک بھوں نہ چڑھائے تھے۔ لیکن اس نے نہایت سادگی سے صرف اتنا کہا "جیک میں آگئی۔" گو رابنسن پارٹی میں گھوم رہا تھا۔ لوگوں سے باتیں کر رہا تھا۔ لیکن اس کا دل وہاں نہ تھا۔ اس کو تشویش تھی تو یہ کہ وہ سلویا سی لاجواب عورت کو خوش بھی رکھ سکے گا یا نہیں۔

× × × × × ×

"ملزم بھولا! تمہارے خلاف مسماۃ گجریا کو دوسری دفعہ بھگانے کا جو جرم لگایا ہے۔ وہ ثابت ہے۔ تم کو تین سال کی سخت سزا کا حکم سنایا جاتا ہے۔"

یہ حکم سنا کر رابنسن صاحب کانسٹیبل کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا "لے جاؤ ملزم کو۔"

ان کا یہ کہنا تھا کہ ایک گندمی رنگ درمیانہ قد کی سولہ سترہ سال کی لڑکی چند مردوں کو چیرتی ہوئی جا کر بھولا سے لپٹ گئی اور زور زور سے رونے اور چیخنے لگی۔ کچہری میں عورتوں کی چیخ پکار روز ہی سنی جاتی ہے لیکن اس کی آواز میں کچھ جادو تھا کہ راہ چلتوں کے پیر روک لیتا تھا کچہری کا کمرہ بھر گیا۔

بھولا تیس سال کا ایک چھوٹے قد کا دبلا پتلا آدمی تھا۔ کالے چہرے پر کالی آنکھیں ناگ کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ گجریا کے بین اور رونے کا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس پر کوئی اثر نہ تھا۔ "اسے بھولا میں تو کو نہ جانے دوں گی۔ . . . . اسے جج صاحب ایسا ظلم نہ کرو۔ ہم کو بھی سنگ ہی بھیج دو۔ اسے پیا میں کہاں کہاں جاؤں

موکو بھی لے چل۔ یا کے سنگ موکو بھی بند کر دیجیو۔"

"ہٹ ہٹ۔ چھوڑتی نہیں سسری۔"

"مولو۔ پکڑ دو اس...... کو"...... نے گجب اُٹھا رکھا ہے۔"

بھر سے اس کے بھائی نے اور تین سپاہیوں نے پکڑا اُدھر کانسٹبلوں نے بھولا کو دھکا دیا...... "چل بے...... کھڑا کیا دیکھتا ہے۔" اس کو گھسیٹ کر کمرے سے لے گئے ——— "بھولا...... او بھولا...... کہاں چھوڑ چلا" پیچھے بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ چار مردوں کی آہنی گرفت سے کہاں جا سکتی تھی۔ زمین پر مچل گئی۔ ایڑیاں رگڑنے لگی: بھولا...... ارے بھولا...... بھولا...... بھولا......

"کورٹ صاحب اس عورت کو بار نکالو۔ شور نہیں مانگتا" ———

"پیشکار! سرکار بنام بندو کو آواز لگاؤ۔"

× × × × ×

بھولا قوم کا گڈریہ تھا کالسر و کے جنگل میں گائے بیل چرایا کرتا تھا چھوٹا پتلا سا مست آدمی تھا۔ اپنے بھائی۔ بھاوج کے ساتھ ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں بھاندوالے میں رہتا تھا۔ بچپن سے اسی جنگل میں رہا پلا بڑھا۔ جنگل میں اس کا من لگتا تھا۔ سونگ ندی میں گاؤں کے اور جوانوں کے ساتھ مل کر نہاتا اور پھر اس کی آواز بھی کیا غضب کی تھی۔ اس کا پتوں کے ڈھیر پر لیٹ کر اور لہک لہک کر گانا۔

"نینوں سے نینا ملاؤ میری جان" گاؤں کی کئی لڑکیوں کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دیتا تھا۔

کالسر و کا جنگل فروخت ہوا اور کئی بڑھئی درختوں کو کاٹنے اور گرانے پر لگے ان میں سے ایک مٹرو بھی تھا۔ وہ مع اپنی جوان گجریا کے وہاں آیا بڑھئی اپنی عورتوں کو جنگل کام پر نہیں لیجاتے ہیں۔ لیکن مٹرو کا چچا بھاندوالے میں رہتا تھا۔ لہٰذا وہ گجریا کو بھی ساتھ ہی لے آیا۔ گجریا سولہ سترہ سال کی گندمی رنگ کی بھرے بھرے جسم کی ایک گرما گرم لڑکی تھی۔ گاؤں کی اور عورتوں کے ساتھ ندی پر پانی بھرنے جاتی تھی۔ راستہ بھر ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ چہلیں کرتی بھاگ دوڑ مچاتی ہوئی جاتی تھی۔ راستہ اُدھر سے نکلتا تھا جہاں گاؤں کا ایک آدھ گڈریہ۔ گایوں اور بیلوں کے واسطے پڑا رہتا تھا

اکثر ان مردوں اور عورتوں میں چھیڑ چھاڑ ہنسی مذاق ہوتا تھا۔ "تو بڑا جلی ہے رے بھولا" ——— اس کی بھاوج جو بھولا کے مذاقوں کو پسند کرتی تھی بن کر جواب دیتی۔ کوئی لڑکی کہتی۔ "اے بھولا جا وہ ہولی تو منا دے۔"

"کیا دیگی" بھولا آنکھ مار کر پوچھتا۔

لڑکی اٹھا کر پتھر مارتی۔ "دیکھو بھابی یہ بھولا گاری دیتا ہے۔"

گجریا کے گاؤں میں آنے سے بھولا کی زندگی میں بہت تبدیلیاں ہونے لگیں۔ اب وہ پہلے سے بھی زیادہ گانے لگا تھا۔ اب اس کے مذاق بھی زیادہ تیکھے ہو گئے تھے۔ وہ گجریا کے انتظار میں بیٹھا رہتا تھا۔ ایک آدھ دفعہ گاؤں کی گلی میں گجریا اکیلی اس کو ملی بھی۔ لیکن گجریا کو دیکھ کر اس کے پیر بندھ جاتے تھے۔ اور منہ تو جیسے کسی نے کیل دیا ہو۔ جب گجری سامنے نہ ہوتی تو بڑی بڑی باتیں سوچتا۔ لیکن اس کو دیکھ کر سب بھول جاتا۔ ایک دن جب وہ جنگل میں گا رہا تھا۔ گجریا اور عورتوں کے ساتھ اُدھر سے گذری۔ اس کو دیکھ کر بہت عورتیں رکیں۔ وہ اسی طرح لیٹا گاتا رہا۔ پھر گجریا کی طرف دیکھا۔ اس نے نیچی نگاہ کر کے مسکرا دیا بھولا گانا وانا سب بھول گیا۔ گجریا اور عورتیں چلی گئیں۔ لیکن اس دن سے گجریا اور وہ آنکھوں اور مسکراہٹ میں باتیں کرنے لگے۔

ایک دوپہر کو گجریا کا پانی جلدی سے ختم ہو گیا۔ اور اس کو اکیلے جنگل پانی لینے جانا ہوا۔ راستہ میں بھولا مل گیا۔ ہمت کر کے بولا۔ "گوری آج اکیلی اکیلی کہاں؟" گجریا بگڑ گئی۔ یہ ڈر گیا۔ لیکن ہمت کر کے چھیڑتا ہی گیا۔ گجری بھی ہنس دی۔ بھولا نے اٹھ کر اس کی کولی بھر لی۔ وہ گھبرا کر الگ کھڑی ہو گئی۔ لیکن وقت اور جگہ مقرر ہو گئی۔

بھولا کی بے چینی کا عجیب حال تھا تین رات سے اسی جگہ گجریا کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن وہ آئی نہ تھی۔ آخر کو چوڑیاں بجوتے آتا گرد بے پاؤں گاؤں کے باہر لکڑیوں کے ڈھیر کے پیچھے آکر کھڑی ہوئی۔ اور چپکے سے بھولا کو بتایا کہ اس کا میاں مٹرو پورے وقت اس کے ساتھ ہی سوتا رہا وہ کوئی بہانہ نہ لگا سکی۔ اب پیٹ میں درد اور جنگل کا بہانہ کر کے آئی ہے اور بہت جلدی جانا ہے۔ اب یہی قصہ چلنے لگا کہ بھولا رات رات بھر گجریا کے انتظار میں جاگا کرتا اور وہ اگر موقع مل جاتا تو آجاتی۔

بھولا بھی اور سب آشنا عورتوں کو بھول گیا۔ جہاں سگائی ہوئی تھی اُس کی بھی سدھ بدھ نہ رہی تھی۔ بھائی کے بہت بگڑنے پر کہدیتا "ابھی میں نا کرتا ہے"

پریم کی پینگیں بڑھتی گئیں۔ دونوں انجام سے بے خبر جب ہی تک زندہ رہتے جب تک ایک دوسرے کی آغوش میں ہوتے۔

گاؤں کے آس پاس لکڑی کے ڈھیر لگے تھے ایک رات کچھ لوگ جاگ رہے تھے حقہ پی رہے تھے کہ گجریا نکلی اور جنگل کی طرف چلی۔

"کون گئی؟" ایک نے شک کے لہجہ میں آہستہ سے پوچھا۔

دوسرے نے کہا "مٹرو کی معلوم پڑتی ہے۔"

"یا وقت وہاں اُس کا کیا کام ہے؟" کہ اتنے میں آہستہ آہستہ بھولا بھی اُسی راستہ سے جاتا دکھائی دیا۔

"ہوں! تو یہ بات ہے!!"

"تو — کو اور بھی کوئی نہ ملا یہ گڈریا کا ہی رہ گیا تھا؟" —

گاؤں میں ایسی بات آگ کی طرح پھیلتی ہے۔ دوسرے روز آہستہ آہستہ ہر طرف اسی کا چرچا تھا۔ لیکن مٹرو کے منہ پر کون رکھے۔ آخر کو کاشی بڑھئی نے حقہ پیتے پیتے مٹرو کی طرف دیکھ کر کہا "مٹرو تیری عورت ہے تو بڑی سندری"۔ مٹرو نے غضب ناک آنکھیں نکال کر کاشی کی طرف دیکھا۔

"مجھ سے کا؟"

"نا بھیا میں تو بات کہتا تھا۔ کسی سندری کا قابو میں رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ کیوں ٹھیک بات ہے نا بلدیوا؟"

بلدیوا نے بھی سر ہلا دیا۔

مٹرو نے بگڑ کر پوچھا۔ "کون کا بات ہے۔"

"کچھ نا بھیا۔ کل رات تیری عورت اُدھر ندی کے جنگل میں جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں بھولا بھی اُدھر ہی گیا" ———

"کون بھولا"

"وہی گڈریا کا۔"

"ہوں!"

"نا بھیا کچھ دیکھا دکھایا نا ہیں۔ بس جو بات تھی کہدی۔"

مٹرو کے دل میں تو جیسے کسی نے چھری بھونک دی ہو۔ گھر میں آکر گجریا کو خوب پیٹا۔ تو دل کچھ ٹھنڈا ہوا۔ لیکن اب ہر وقت وہ گجریا کو آنکھوں میں رکھنے لگا اور اُدھر اُس نے اپنی چاچی سے بھی کہدیا "چاچی اُس کا دھیان رکھنا۔ اِدھر اُدھر کہیں نہ جاوے۔"

گجریا پر اب بہت سختی ہونے لگی مٹرو بات بے بات مارنے لگا لیکن اس نے بھولا سے ملنا نہ چھوڑا۔ دو ہی منٹ کو مل لیتی گلے ہی لگ آتی۔ ہاتھ ہی چھو لیتی۔ رفتہ رفتہ چاچی بھی بات کو بھولنے لگی۔ اور مٹرو بھی ذرا غافل ہو گیا۔

ایک رات مٹرو کی آنکھ کھلی گجریا غائب تھی۔ چپکے چپکے جھونپڑی میں ڈھونڈا۔ باہر نکل کر ڈھونڈا۔ کہیں نہ ملی۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے دیکھا کہ گجریا دبے پاؤں گھر کی طرف جا رہی ہے۔ اور کچھ فاصلے پر بھولا بھی ہے . . . . بات صاف۔ گجریا کے پیچھے پیچھے گھر چلا اور اس سے پہلے کہ وہ گھر میں گھسے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ گجریا کا دم ہی تو نکل گیا۔ لیکن آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑی رہی۔ چھ مہینے کی متواتر محبت نے اُس کو تھوڑا سا نڈر بھی کر دیا تھا۔

"کہاں گئی تھی؟"

"جنگل"

"ساتھ کون تھا؟"

گجریا چپ تھی۔

"بولتی کیوں نہیں . . . . .؟" ایک طمانچہ زور کا منہ پر پڑا۔ پھر گھونسہ لات۔ اور گھونسہ لات اور گھونسہ لات! ویسے جب گجریا پٹتی تھی گاؤں کی اور عورتوں کی طرح وہ بھی واویلا مچاتی تھی۔ لیکن آج رات وہ مار کھاتی رہی اور چپ رہی۔ گھونسوں کی آواز سنکر چچی نکل آئی۔ مٹرو کو اندر لے گئی۔ گھر والوں میں صلاح ہوئی کہ اپنی عزت کی بات ہے بات دبا دینی چاہیئے۔ اور اس . . . . . . کو اس کے باپ کے گھر پہنچا دینا چاہیئے۔

دوسرے روز سوچی سجائی گجریا وہاں آٹھ میل پر برکوٹ پہنچا دی گئی اور ساتھ ہی مٹرو اُس کی ساری بات بھی کھول آیا۔ وہاں پر باپ سوتیلی ماں۔ بھائی اور بھاوج نے ہر وقت کی چوکیداری شروع کر دی

لیکن ایک گڈریہ کے لئے آٹھ میں کیا ہوتے ہیں۔ تھوڑے ہی دنوں پیچھے پھر دونوں آٹھویں دسویں چھپ چھپ کر ملنے لگے۔ ایک روز بھتیجے نے دیکھ لیا اور گجریا کے بھائی سے کہا۔ بھائی نے شروع سے بھی زیادہ بہن کی مرمت کی۔ اور اب گھر والے رات کو اُسے کوٹھڑی میں بند کر دیتے تھے۔ جون کا مہینہ چھوٹی سی کوٹھڑی۔ گجریا تھی کہ وہاں سے ادھ مری ہو کر نکلتی تھی۔ ایک شام کو وہ گھر سے غائب تھی۔ سارا گاؤں جنگل ڈھونڈ ڈالا پتہ نہ لگا مرلو کے پاس آدمی راتوں رات گیا۔ معلوم ہوا کہ دو دن سے بھولا بھی غائب ہے۔ دوسرے دن پولیس میں اطلاع ہوئی۔ وارنٹ کٹوایا کہ بھولا نابالغ لڑکی کو لیکر بھاگ گیا ہے۔ آٹھ روز کے بعد دونوں پکڑے ہوئے لائے گئے عدالت میں گجریا نے گواہی دی۔ اپنی محبت اور خود اپنی مرضی سے بھولا کے ساتھ جانے کا اقبال کیا۔

بھولا نے بھی بہت کہا کہ مجھ کو اس کی عمر کی کیا خبر تھی۔ کیا اس کے ماتھے پر لکھی ہوئی تھی۔ مجھ کو اس سے محبت ہے۔ یہ خود میرے ساتھ چلی آئی۔ لیکن قانون تو قانون ہی ہے۔ اس میں چون و چرا کی کیا مجال۔

اور پھر جب رابنسن جیسا قابل جج قانون کی ترجمانی کرے تو بھولا کو تین سال کی سزا سے کیا کم مل سکتی تھی۔

× × × × × × ×

کلب میں آج شام ہر طرف چہل پہل تھی۔ چالیس کے قریب انگریز مرد اور عورت تھے۔ اور تین چار ہندوستانی مع اپنی بیویوں کے رونق افروز تھے۔ آج رابنسن کی بہت قدر تھی ہر طرف اُن کی پوچھ تھی۔ ہر انگریز اُنکے "ہوم" جانے پر رشک کر رہا تھا۔ انگریز یہاں خواہ کتنے ہی آرام و آسائش میں رہیں۔ لیکن "ہوم" چھٹی پر جانا ایسا ہی محسوس کرتے ہیں جیسے کوئی چڑیا پنجرے سے چھٹ کر خوش ہوتی ہے۔ ہندوستان کی قدر تو وہ اُٹھا ہی کرتے ہیں۔ یعنی جب پنشن پا کر عمر بھر کے لئے "ہوم" جا کر ہوم بسلتے ہیں۔ آج تو رابنسن اور بھی غیر معمولی طور پر خوش تھا کہ اب وہ شادی کرنے جا رہا تھا۔ ایک میز پر وہ ٹُم راجرس ایک اور انگریز، اور مس فوکس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

"ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے یہ لوگ ہوتے تو "امیوشنیل" ہیں بالکل جانوروں کی طرح۔"

"اب دیکھو چھ آنے پر لڑ کر کیپٹن مارٹن کے بیرا نے چوکیدار کے چھرا بھونک دیا" مس فوکس نے تائید کرتے ہوئے کہا۔

"روگ (ROGUE) کہیں کا مجھ کو وہ آدمی بالکل پسند نہیں تھا۔ نہ معلوم مارٹن نے اس کو کیوں رکھا ہوا تھا۔"

"مجھے تو بہت خوشی ہے کہ میں جا رہا ہوں ورنہ اس کو پھانسی کی سزا بھی مجھی کو دینی پڑتی۔" رابنسن نے کہا۔ "پھانسی کی سزا مجھکو بالکل پسند نہیں" ٹُم راجرس نے کہا۔ جو ابھی تین مہینے پہلے ہندوستان آیا تھا۔ یہاں کی ہر چیز اُس کو ایک تجربہ معلوم ہوتی تھی۔

"پھانسی کی سزا پسند نہیں"! مس فوکس زور سے چیخیں۔ اگر پھانسی کا ڈر نہ ہو۔ تو یہاں کے وحشی "نیٹو" ہم میں سے کسی کو زندہ نہ چھوڑیں۔"

"ارے چلئے بھی مس فوکس آپ کتنی عجیب باتیں کرتی ہیں" ٹُم راجرس نے جس پر ابھی تک کیمبرج کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ ہنس کر مس فوکس کو چھیڑا۔

"لیکن اُس بیرا کو تو ضرور پھانسی ملنی چاہیئے رات بھر اُس چوکیدار کی عورت اتنے زور زور سے روئی ہے کہ مارٹن کے کمپونڈ اور ہمارے کمپونڈ میں کسی کو سونے ہی نہیں دیا۔"

"تو بیرا کے پھانسی لگنے سے کیا چوکیدار کی بیوی کا رونا رُک جائیگا؟" ٹُم نے پھر پوچھا۔

"سنو راجرس تم ابھی ابھی ہندوستان آئے ہو تم اپنے جوش میں بہت سی باتیں بھولتے ہو لیکن مس فوکس نے جو کچھ کہا ہے سچ ہے۔ اگر پھانسی کا ڈر نہ ہو تو اِس وحشی ملک میں ہر وقت قتل و خون ہوا کرے ہمارے قانونوں کی برکت سے اتنا ہوا ہے کہ امن و امان قائم ہے۔"

"ہاں چلتے چلو . . . . ." ٹُم راجرس نے کہا۔

"یہ ہمارا ہی بنایا ہوا قانون ہے جس کے سامنے ہر چھوٹا بڑا بغیر کسی قوم و ملت کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ اور جبھی ہر ہندوستانی کہتا ہے کہ اِس انگریزی راج میں شیر اور بکری ایک جگہ پانی پی سکتے ہیں۔"

"سچ مچ تو یہاں کا قانون اپنے "ہوم" کے قانون سے غرق ہے؟"

ٹم راجرس نے مسکرا کر سوال کیا۔

اِس پر تینوں انگریز جو کئی سالوں سے ہندوستان میں تھے ہنس پڑے ٹم بالکل سُرخ ہو گیا۔

مس فوکس نے کہا: ٹم تمہارا مطلب کیا ہے؟ تمہارے خیال میں ہم میں اور نیٹوز میں کچھ فرق ہے۔

"میرا مطلب یہی ہے کہ قانون ہندوستان میں چھوٹا بڑا یا اونچا نیچا نہیں دیکھتا میں اپنی طرف سے بلکہ سب انگریزوں کی طرف سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے دل میں کبھی ایسے خیال نہیں آئے ہم تو قانون سب کے لئے برابر سمجھتے ہیں" یہ رابنسن نے کہا۔

اتنے میں سوشیل کمار گپتا ایک ہندوستانی آئی، سی، ایس بھی اِس گروپ کے قریب آ نکلے اور طور رابنسن کہکر میز کی طرف بڑھے۔

"دیکھو گپتا آپ نے مجھے ساتھ لے جانے کا وعدہ کیا تھا اور خود جلدی چلے گئے" راجرس نے شکایت کی۔

"میں بہت سویرے گیا تھا اور پھر میری فیملی بھی ساتھ تھی۔ افسوس کہ آپکو ساتھ نہ لے جا سکا لیکن مجھ کو دو تین روز بعد پھر جانا ہے۔"

"آپ کہاں گئے تھے؟" رابنسن نے پوچھا۔

"کالنسر اکی طرف۔ ہاں وہاں ایک گاؤں ہے پھاندو والا وہاں پر کل ایک عجیب واقعہ ہوا (ہنس کر) اور اُس کے ذمے دار رابنسن تم بھی ہو"

"میں!" رابنسن نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کیا ہوا؟" مس فوکس نے سوال کیا۔

"ایک جوان لڑکی نے اپنے شوہر کے گھر کو آگ لگا دی اور پھر اپنے کپڑوں پر تیل چھڑک کر آگ میں گھس گئی۔"

"تو میں کس طرح ذمے دار ہوا؟" رابنسن نے مسکرا کر پوچھا۔

"تم نے دو عاشق و معشوق کو جدا کر دیا آدمی کو جیل بھجوا دیا۔ لڑکی خود جل مری۔ گھر بھی ساتھ پھونک گئی۔"

"کونسا کیس؟" رابنسن نے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔

"کہانی مجھ کو معلوم ہے کیس کی مجھ کو خبر نہیں" گپتا نے کہا۔

"مسٹر گپتا ضرور ساری بات سنایئے۔ مس فوکس نے اشتیاق سے پوچھا۔

گپتا نے کہا: "مس فوکس کہانی بہت دلچسپ ہے۔ ایک بڑھئی کی عورت کا ایک گڈریئے سے عشق تھا۔ جب بڑھئی کو خبر لگی تو اس نے مار پیٹا۔ کچھ نہ ہوا دونوں ملتے رہے۔ لوگ تو کہہ رہے تھے کہ وہ دونوں نہ چیتے سے ڈرتے تھے نہ شیر سے اور چھپ چھپ کر راتوں کو جنگلوں میں ملتے تھے۔ پھر بڑھئی نے اُس کو اُس کے باپ کے ہاں بھیج دیا وہاں اُس کے رشتے داروں نے مار پیٹا بند کیا۔ لیکن پھر بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ اور وہ برابر چھپ چھپ کر راتوں کو جنگلوں میں ملتے رہے۔ آخر ایک دن وہ اس لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی۔ ہر دو ار سے دونوں پکڑے آئے۔ نمبر ایک مقدمہ قائم ہوا۔ رابنس صاحب کے ہاں لڑکا ضمانت پر چھوڑ دیا گیا اُن دونوں نے پھر چھپ کر ملنا شروع کیا اور پھر بھاگ گئے۔ اب کے بمبئی جا رہے تھے کہ دہلی پکڑے گئے۔ اب دو مقدمے قائم ہو گئے ہمارے رابنسن نے لڑکے کو تین سال کی قید کر دی۔"

"اچھا! ہندوستان میں بھی لوگ محبت کرتے ہیں!" مس فوکس نے نہایت تعجب سے پوچھا۔ گپتا اور ٹم قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

"قانون ہے جناب میں کیا کروں" رابنسن نے تھوڑی دیر بعد جواب دیا۔

"او جیک!" مس فوکس نے تین سال کی نا اُمیدی کا بدلہ اپنی آواز میں بھر دیا۔

"میری بات ٹھیک ہے نا رابنسن، اگر گپتا کسی عورت کو لیکر بھاگ جائے تو تم یہی سزا دیتے؟"

"میرا نام کیوں لیتے ہو میری بیوی تو قریب ہی بیٹھی ہے اپنا ذکر کرو۔"

"اچھا میرا ہی سہی۔ اچھا سچ بتاؤ رابنسن اگر میں اس مرد کی جگہ ہوتا تو تم یہی سزا دیتے (ٹھہر کر) اور جو فرض کرو تم اُس کی جگہ ہوتے تو تم کیا میرے سے یہ امید کرتے کہ میں تم کو یہی سزا دوں؟"

ٹم راجرس نے جو رابنسن کی عشقیہ ہسٹری سے بالکل ناواقف تھا۔ یہ سوال کیا۔

"تمہیں مذاق کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ چلو اب اٹھو گے بھی یا رات یہیں گذارو گے؟" ●

راجندر سنگھ بیدی

آلو

لکھی سنگھ سائیکلوسٹائل کے قریب بیٹھا سوچ رہا تھا۔ اُس وقت نہ تو اسے ہندوستان کی اقتصادی بدحالی کا خیال تھا۔ اور نہ خاکروبوں کی ہڑتال کے متعلق تشویش تھی۔ آج شام کو گھر جانے کے لئے کیا لے جائے۔ بس اسی بات نے اسے کافی پریشان کر رکھا تھا۔ گھر میں صحن کا تین چوتھائی حصہ چھوڑ کر۔ باقی میں بسنتو نے پام اور پالک اس کے علاوہ پودینہ اور بینگن کے پودے لگا رکھے تھے۔ لیکن ابھی تو بینگن کے پودوں نے نیلے نیلے، اودے اودے پھول ہی نکالے تھے۔ ابھی تو ان میں بینگنوں کی نشوونما بھی اچھی طرح سے نہیں ہوئی تھی۔ ایسے میں بینگنوں کا خیال بھی کرنا ایک احمقانہ بات تھی۔

لکھی سنگھ شروع ہی سے پودوں کی کاشت کے خلاف تھا۔ حالانکہ بسنتو گھر میں ہریاول کو بہت پسند کرتی تھی۔ سبزی آنکھوں کو طراوت دیتی ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن لکھی سنگھ نہایت بے صبر انسان تھا۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ آج ہی بیج بو دیا جائے۔ اور آج ہی پھل لگ جائیں ہندوستان کی آزادی کے متعلق بھی اُس کا خیال کچھ ایسا ہی تھا۔ پودوں کو روزمرہ پانی دینا، ان کی نگہداشت اور پھر انہیں نہایت سست رفتار سے بڑھتے دیکھنا اس کی تاب و تواں سے باہر تھا۔ اسی لئے تو اس نے بسنتو کو صاف کہہ دیا تھا۔ کہ پودے اُگانے کے بعد میں ولگا چلا جاؤنگا۔ وہاں دو چار ماہ رہونگا۔ تاکہ میری واپسی پر بینگن پھل رہے ہوں۔ اور مجھے محسوس ہو جیسے میں نے کل ہی انہیں بویا ہے اور آج پھل بھی لے لئے ہیں۔

لکھی سنگھ نے اٹھ کر چاروں طرف دیکھا۔ سب کامریڈ جا چکے تھے۔ لیکن اُسکے کانوں میں اُن کی پُرشور بحث باقی تھی۔ پھر اُسے خیال آیا۔ خاکروبوں کی ہڑتال کس قدر مکمل ہوئی ہے۔ شہر کی تنگ و تاریک گلیوں، گنجان آباد محلوں۔ گندگا ہوں اور سڑکوں پر جا بجا کوڑے کے ڈھیر لگ رہے ہیں۔ شاہ عالمی کے باہر گھوڑوں کے حوض کے قریب میلے کا پہاڑ پڑا ہے۔ ٹھنڈی سڑک کی طرف جانے والی سڑک پر تین دن سے ایک بیل مرا پڑا ہے۔ جس کی لاش سے سڑاند اٹھ کر ہسپتال کے مریضوں تک پہنچ رہی ہے۔ اُسکے اپنے کوچہ عبدالمصر میں جہاں شہر کے مردے جلانے والے اچارج رہتے ہیں۔ اتنا تعفن پیدا ہو رہا ہے۔ کہ اچارج باہر نہیں نکلتے، اور ہندو کا مردہ بغیر اچارج کے کیسے جلایا جا سکتا ہے۔ یقیناً بہت سے مُردے گلی محلوں میں پڑے بدبو پھیلا رہے ہونگے۔ ٹھنڈی سڑک کے قریب مرے ہوئے بیل کی طرح۔

کھڑکی میں سے ایک تیز بدبو آنے سے لکھی سنگھ اٹھا۔ اور اُس نے تمام دروازے بند کر لئے۔ دائیں طرف گھومنے سے اُس کی نگاہیں سائیکلوسٹائل کے اوپر ایک کھونٹی پر جا پڑی۔ اس کھونٹی پر کامریڈ بخشی کی ہیٹ ٹنگی رہ گئی تھی۔ جسکے ایک طرف سرخ پروں کا ایک خوبصورت پلیم لگا ہوا تھا۔ آخر بخشی نے سرکاری ملازمت لے لی تھی۔ اسلئے سب کامریڈ مل کر براؤننگ کی نظم "وہ چند چاندی کی ٹکیوں کے عوض ہمیں چھوڑ گیا" گاتے رہے تھے۔ بخشی رجعت پسند ہو گیا تھا۔ سب نے کامریڈ سے محبت کی تھی اور راہبری کے لئے اُس کی طرف دیکھا تھا۔ اُسکے گیت گاتے تھے۔ اُسکے افسانوں کی تعریف کی تھی۔ اور اب؟ . . . . لیکن سو روپیہ ماہانہ پا لینے پر اُس کا چہرہ اسقدر اترا ہوا تھا۔ وہ بار بار گھبرا کر اپنی پتلون کی کریز ٹھیک کرتا تھا۔ اور بے تحاشا آنکھیں جھپکتا تھا. . . . شروع بحث میں نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی تھی۔ اور اُسے پیٹا بھی گیا تھا۔ اُس کی قمیص کا ایک چیتھڑا ابھی تک ایک کرسی کے ابھرے ہوئے کیل میں اٹکا ہوا تھا۔ اُس نے پیٹ کی مجبوریوں کا تذکرہ کر کے ہر ایک کے جذبہ رحم کو اکسانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہاں سب کی آنکھوں میں نفرت تھی۔ معلوم ہوتا ہے۔ اتنے بڑے نصب العین سے گر جانے کا اُسے خود بھی احساس تھا۔ لیکن وہ ایک

منتک مجبور تھا۔ اُس کی تین بہنیں تھیں۔ شادی کے قابل۔ ایک بوڑھا باپ ـــ ڈاکٹر، جو کہ کسی ریاست سے ریٹائر ہوا تھا۔ اور جس کی بینائی زیادہ احتیاط کی وجہ سے کم ہو گئی تھی۔ ماں کے علاوہ چار بھائی تھے۔ جن میں سے دو ہائی سکول میں اور سب سے بڑا شہر سے باہر ایک کالج میں تعلیم پاتا تھا۔ اور ان سب کے پیٹ ایندھن مانگتے تھے۔ بخشی نے ہر ایک کے اعتراض کا فرداً فرداً جواب دینے کی کوشش کی۔ لیکن کسی نے اُس کی ایک نہ سُنی اور بیٹھ جانے کے فوراً بعد ہی وہ کمرہ سے باہر بھاگ گیا۔ اور اس سراسیمگی میں اپنا ہیٹ بھی وہیں چھوڑ گیا۔

لکھی سنگھ نے کہا۔ کاش بخشی کا کوٹ سنگار رہ جاتا، تو آج کی روٹی سے تو نجات حاصل ہو جاتی۔ پھر اُسے بسنتو کا خیال آیا۔ اور وہ سوچنے لگا۔ بسنتو صحیح معنوں میں کامریڈ ہے۔ اتنی خستہ حالت ہونے کے باوجود اُس نے آج تک مجھے کبھی یہ یقین نہیں ہونے دیا۔ کہ میں تم سے قلاش آدمی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ مجبوری کے دنوں میں وہ میلے کچیلے چیتھڑے، ولگا سے آئی ہوئی گندم کا چھان، ایک گمنام سا پرچہ جس کا لکھی سنگھ ایڈیٹر رہا تھا۔ اُس کی ردی بیچ کر کئی کئی دن گزارہ کیا کرتی تھی وہ نام نہاد عزت کے خیال سے کبھی نہیں ڈری تھی۔ اور اپنے سوشلسٹ خاوند پر بار ثابت نہ ہونے کے لئے اُس نے پڑوس کے لوگوں کی قمیص سینی شروع کر دی تھیں۔ ایک دفعہ اس نے کوڑیوں کے مول محلہ کے تمام لوگوں سے پھٹی ہوئی جرابیں خرید لیں۔ اُن کے تار نکالے اور انہیں پاپڑ منڈی کے ایک جرابوں کے کارخانے میں بیچ دیا۔ بسنتو بڑی وسیلہ ساز عورت تھی اور وہ بیدی مطمئن تھا۔

لکھی سنگھ اٹھا اور ایک انگڑائی لی۔ وہ کچھ تھک سا گیا تھا۔ اسکے بعد وہ ہنسنے لگا۔ ہنسنے کے سوا چارہ بھی تو نہ تھا۔ اور وہ ہنسی نہ ردِ عمل کی ہنسی تھی۔ اور نہ کوئی درد تھا۔ جو حد سے گزر کر دوا ہو گیا تھا وہ ایک بے معنی، کھوکھلی سی ہنسی تھی جو کہ آناً فاناً جیب میں پیسے ختم ہو جانے سے پیدا ہوتی ہے اور خیال آتا ہے ـــ بھئی خوب رہی، چلو بڑے وشنو بھگت بنتے تھے۔ لیکن ایک کامریڈ کی زندگی میں ایسے واقعات رونما ہوتے ہی رہتے ہیں۔ وہ روس کا مینا ٹلو دیچ . . . .

ـــ اور آخر رونے سے بنتا ہی کیا ہے۔ یہ بھی تو ایک وجہ ہے۔ کہ ہنستا جائے۔ اور لکھی سنگھ آہستہ آہستہ بیٹھک پر سے اترا۔ اور بیٹھک سے نکل کر سرکلر روڈ کی طرف چل دیا۔ بازار میں کتے دہی بڑے کے خالی پتے چاٹ رہے تھے ایک چھوٹی سی لڑکی کا دودھ سے بھرا ہوا آبخورہ بازار میں گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ اور سرمئی سیاہ سڑک پر بکھرا ہوا دودھ اتنا بھیانک دکھائی دیتا تھا۔ جیسے قحط کے دنوں میں تو کر نز کے غلہ و رشو کا کوئی بڑا سا کرائی سینٹیمیٹر بازار رکھ دیا جائے . . لڑکی حواس باختہ ہو کر آبخورے کے ٹکڑے اکٹھے کرنے لگی گویا انہی ٹکڑوں کو سمیٹ کر گھر لے جائیگی،

آسمان پر کاٹن مل کے دھوئیں کی ایک لمبی سی لکیر چیمبرلین روڈ تک چلی آئی تھی۔ اگرچہ گرمی کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ تاہم فضا میں خشکی باقی تھی۔ اور دھوؤں کے ٹکڑے آسمان کی سپیدی مائل نیلاہٹ کے خلاف دھبوں کی صورت میں چار سُو بکھرے ہوئے تھے۔ اچانک ایک تیز سی بدبُو نے لکھی سنگھ کو ناک پر رومال رکھنے کے لئے مجبور کر دیا اور وہ سوچنے لگا کمیٹی کی طرف سے اس میلے کے نکاس کا خاطر خواہ بندوبست نہیں۔ لوگوں کے گھر غلاظت سے بھرے پڑے ہیں۔ لیکن پھر بھی لوگ برابر ایک پیٹ کی ضرورت سے زیادہ کھائے جاتے ہیں۔

اب تک لکھی سنگھ سبزی منڈی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ منڈی کے دروازے سے کچھ چھکڑے چیں چیں رِیں رِیں کرتے ہوئے باہر نکل رہے تھے۔ ان کے بیل کوہان کے قریب زخمی تھے۔ اسکے باوجود نہ تو جوت کو پرے کھسکایا گیا تھا اور نہ ہی لکڑی کے سخت لٹھے اور اس پر زیبائش کے لئے لگائے ہوئے پیتل کے سکوں کے گرد کوئی چیتھڑا لپیٹا گیا تھا گاڑیبان بیلوں سے گزر کر ان کے مالکوں اور رکھنے والوں کو گالیاں دے رہے تھے۔ گوالمنڈی چوک کو اکالیوں کے ایک لمبے چوڑے جلوس نے روک رکھا تھا۔ یہ لوگ سرگودھا میں مورچہ لگانے کی بابت سوچ رہے تھے۔ لکھی سنگھ نے اتفاق سے اپنا ہاتھ ایک چھکڑے کے پیچھے رکھا۔ تو اسکے ہاتھ میں ایک آلو آ گیا . . . . . یہ وہی چھکڑے تھے۔ جو کہ مرسوند صبح سانده شمس الدین کی طرف سے آلوؤں کی گٹھیں لے کر سبزی منڈی کو آتے۔ اور اپنی دانست میں تمام آلو انڈیل کر اپنے گھر لوٹ جاتے۔ پھر بھی دھرے کے قریب یا کسی کانٹھ اور ادھر بیچ میں کوئی نہ کوئی آلو

ٹھکارہ جاتا۔ لکھی سنگھ نے تمام جھگڑوں کے پیچھے سے ٹٹول ٹٹول کر بیر کے قریب لا رکھے رکھے ۔ اور اُس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ وہ آنسو نہ تو غم کے تھے۔ اور نہ مسرت کے بلکہ یونہی خلاؤں میں ایک جذبۂ تشکر و امتنان کا اظہار۔ یا وہ آنسو ایسے تھے۔ جو خالی جیب کے آناً فاناً بھر جانے سے پیدا ہوتے ہیں۔

لکھی سنگھ نے گھر پہنچ کر تمام آلو بسنتو کے سامنے بکھیر دئے۔ آج بسنتو شام سے ہی لکھی سنگھ کی راہ تک رہی تھی۔ آج اس وسیلہ ساز عورت کو بھی کامریڈ کے آنے سے پہلے پہلے کوئی چیز پکانے کی ترکیب نہیں سوجھی تھی۔ اچانک اندر سے لکھی سنگھ کا بڑا لڑکا کرنیل نمودار ہوا اور رسوئی میں بکھرے ہوئے آلوؤں کو ہوا میں اچھالنے لگا۔ لکھی سنگھ نے زور سے ایک چپت اُسکے منہ پر لگا دی۔ اور آلو سمیٹ کر ایک کونے میں ڈال دئے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کی کمائی یونہی برباد کی جائے اور کرنیل رویا نہیں۔ کیونکہ ایسی باتیں تو ہر روز ہوتی تھیں۔ گھر میں کھانے کو کچھ میسر نہ آتا تھا۔ اور اسکے بعد جب وہ کسی چیز کی طرف حریصانہ نگاہ سے دیکھتا۔ تو ماں یا باپ کی طرف سے ایک چپت رسید ہو جاتی۔ اگرچہ کل کی چپت سے اُس روز کی چپت زیادہ سخت تھی۔ تاہم اس سے کرنیل کو ایک اور شرارت کا موقع آسانی سے میسر ہو گیا۔ اُس نے شیشے کے سامنے سے بام اٹھائی اور نصف سے زیادہ اپنے ماتھے پر مل لی۔ کرنیل کو بام ملنے کا بہت شوق تھا۔ اُسے وہ پیشانی پر ٹھنڈی لگا کرتی تھی۔ وہ بام لکھی سنگھ نے بسنتو کے لئے خریدی تھی۔ کیونکہ وہ لیکوریا کی مریضہ تھی۔ اور اُسے ہمیشہ سر درد رہتا تھا۔ لکھی سنگھ نے بام کو ضائع ہوتے دیکھ کر دوسری گال پر بھی طمانچہ مارنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ سوچنے لگا۔ کہ بام تو پہلے ہی نصف سے زیادہ ختم ہو چکی ہے۔

اس وقت لکھی سنگھ کو بھوک لگ رہی تھی۔ اور وہ بسنتو سے لڑنا چاہتا تھا۔ اُس نے بات بچوں کی تربیت سے شروع کی۔ اور کہنے لگا۔ بچے تو انگریز عورتوں کو پالنے آتے ہیں۔ ہندوستانی عورتوں کو ماں بننے کا کوئی حق نہیں۔ اگرچہ بسنتو اس طور پر انگریزوں کی تعریف نہیں سن سکتی تھی اور عموماً بات یہاں ختم ہوتی تھی ـــــ اُن لوگوں کے پاس بچوں کو کھلانے کے لئے آیا ہوتی ہیں۔ روٹیاں پکانے کے لئے خانسامے . . . اور لکھی سنگھ ایسی باتیں سنکر چپ ہو جایا کرتا تھا۔ سوشلسٹوں کے حلقہ میں وہ گھنٹوں بحث کر سکتا تھا۔ لیکن اس جگہ وہ پانچ منٹ سے زیادہ نہیں بول سکتا تھا۔ حقیقت اتنی تلخ ہوتی تھی۔ کہ اُسے اپنے چہرے کا عکس دکھائی دینے لگتا۔ لیکن آج اس بات پر بھی بسنتو خاموش رہی۔ اچانک دروازے کی طرف سے سخت سڑاند آئی۔ اور لکھی سنگھ گرج کر بولا۔

"تم سے یہ بھی نہ ہو سکا۔ کہ دروازہ بند کر لیتیں . . . بس نواب زادی بننا چاہتی ہے تو"

بسنتو نے اٹھ کر چپکے سے دروازہ بند کر دیا۔

لکھی سنگھ اپنی داڑھی کے بکھرے ہوئے بالوں کو سوئی میں لگا کر صحن میں ٹہلنے لگا۔ بھوک کی وجہ سے اُسے ڈکار آ رہے تھے۔ اور پیٹ میں ناف سے اوپر ایک عجیب طرح کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ جیسے سیلاب میں دریا کے کنارے ایک پرشور آواز کے ساتھ پانی میں گرتے ہیں۔ اُسے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اُسکے پیٹ کی دیواروں سے کوئی چیز اندر معدے میں گر رہی ہے۔ یکایک لکھی سنگھ کو کچھ سوجھ گیا۔ پودوں کو اپنے سامنے پا کر بولا۔

"بھلا ان بینگن کے پودوں کا فائدہ ہی کیا؟"

"فائدہ کیوں نہیں" بسنتو نے آلوؤں کو دیگچی میں ڈالتے اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ لیکن لکھی سنگھ اپنے مخصوص معاندانہ انداز سے گرجا "میرا تو جی چاہتا ہے کہ انہیں، ابھی، اسی وقت اکھاڑ کر پھینک دوں۔ دو مہینے کے اوپر ہونے کو آئے ہیں اور ان میں پھل کا نام و نشان تک نہیں"

لکھی سنگھ اور بسنتو میں اس بات پر بہت جھگڑا ہوا کرتا تھا کڑھتی ہوئی بسنتو بولی۔

"تبھی تو تمہیں بچوں سے نفرت ہے"

"بچوں سے مجھے کاہے کو نفرت ہوگی"

"اٹھارہ سال کی عمر تک ان کی خدمت کا تم میں صبر کہاں ہے ابھی سے کہ رہے ہو کہ میں لکھمیر کو گانا سکھانا چاہتا ہوں۔ تاکہ وہ بچپن میں ہی کمانے لگے۔ اور اسی عمر سے ہم اُس کی کمائی کھانے لگیں"

لکھی سنگھ خاموش رہا۔ اور مونگی توری کی بیل کے گرے ہوئے

سرے کو کیل پر ٹانکنے لگا ۔ ۔ ۔ بسنتو ماں تھی۔ اس میں بچے اور پودے پالنے اور انہیں آہستہ آہستہ بڑھتے دیکھنے کی کا حوصلہ تھا۔ وہ ہر روز صبح اٹھتی اور کہتی۔ آج بینگنوں کو دو پھول لگے ہیں۔ اور دو ٹی ڈنڈیاں پھول رہی ہیں۔ اور مونگی توری پر بھی شہد کی مکھیاں بیٹھتی ہیں۔ اب توریاں پھلنے کا موسم آیا ہے نا۔ اور تم نے آخر کرنیل سنگھ سے کس جگ کا بدلہ لینا ہے۔ آخر ہوتے ہوتے سمجھدار ہو جائیگا۔ یونہی اُسے پیٹتے رہتے ہو۔ لکھی سنگھ کو خیال آیا۔ کہ مونگی توری کی بیل کو جہاں سے کاٹا گیا تھا۔ وہاں سے زیادہ سرسبز ہے۔ وہاں زیادہ کونپلیں پھوٹی ہیں۔ وہ فوراً بول اٹھا۔ یہ پودے کاٹنے چھانٹنے سے زیادہ نشوونما پاتے ہیں۔ تبھی تو میں کرنیل کو مارتا ہوں۔

جس دن لکھی سنگھ اور بسنتو کا جھگڑا ہوتا۔ اُس دن بسنتو وہی ڈھیلا ڈھالا گلابی بلاؤز پہنتی جس سے وہ ویدی کو سخت نفرت تھی۔ اور وہ دوپہر تک سر کے بالوں کو سیدھا نہ کرتی۔ اپنے کپڑوں اور اپنی شکل سے وہ یوں سُست اور زرد دکھائی دیتی۔ جیسے وہ حائضہ ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ کراہتی۔ اور لکھی سنگھ آہستہ آہستہ کراہنے سے بہت گھبراتا تھا۔ زور سے رونے کا اس پر کبھی اثر نہیں ہوا تھا۔ اُس کا خیال تھا۔ کہ یہ ہلکی ہلکی چیزیں مثلاً ہلکی کھانسی، ہلکا ہلکا بخار، ہلکا ہلکا ہنسنا ہمیشہ خطرناک ہوتا ہے اس وقت بسنتو اسے مزید تنگ کرنے کے لئے کھاٹ پر اوندھی پڑ جاتی اور پائنتی میں پاؤں اڑا کر یونہی زور لگانے لگتی۔ اور بچہ سفری پنگوڑے میں نصف دھوپ اور نصف چھاؤں میں ایک ہولناک آواز سے کراہتا رہتا۔ اور پھر یکدم چیخ اٹھتا۔ جیسے اُسے جیونٹیوں کے کسی دستہ نے یک لخت کاٹ کھایا ہو۔

ہنڈیا میں سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا۔ آلو اُبل چکے تھے بسنتو نے اُنہیں سُرمائی میں انڈیلا اور لکھی سنگھ اُنہیں چھیل کر کھانے لگا۔ اِن آلوؤں کے سوا گھر میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اور لکھی سنگھ یہ بھول جانا چاہتا تھا کہ ان سیر آلوؤں میں بسنتو، کرنیل، لکھیرا اور بچے کا بھی حصہ ہے۔ وہ کہتا۔ ڈاکٹروں کی رائے ہے۔ کہ آلو پیٹ کو فلیٹ کرتے ہیں۔ اسکے بعد وہ نمک مرچ لگا کر اُنہیں چٹخارے لیتا ہوا کھا لیتا گویا کہ رہا ہو مجھے اپنے پیٹ کی غلاظت بہت پسند ہے۔

زندگی خوشگوار تھی۔ اس میں آسائش نہ تھی۔ سوہن حلوہ نہ تھا لیکن آلو تو تھے۔ اور لکھی سنگھ ہر روز شام کو چیمبرلین روڈ پر سے ہوتا ہوا سبزی منڈی کے قریب جا کھڑا ہوتا۔ اور ساتھ شمس الدین کو لوٹنے والے چھکڑوں پر سے تمام آلو سمیٹ لیا کرتا۔ اٹھارہ تاریخ کو اُسے ہندوستان ٹائمز سے "گداگروں کے مسائل" کے مضمون کے پیسوں کی توقع تھی۔ اور آج بارہ تاریخ تھی۔ پیٹ کی آگ کیلئے آلو کافی تھے۔

اچانک کمیٹی کی طرف سے بیل گاڑیوں کے لئے نیو بجٹ ٹائروں کا بل پاس ہوگیا۔ یہ سب کچھ غریب گاڑیبانوں کی استطاعت سے باہر تھا۔ وہ سو سو روپے کے ٹائر کیسے مہیا کر سکتے تھے۔ کامریڈ نسکے ایک جلوس نے گاڑیبانوں کی ہڑتال کروانے کا فیصلہ کر لیا۔ اور لکھی سنگھ نے بھی ہڑتال کو کامیاب دیکھنے میں سرگرمی سے کام کرنا شروع کر دیا

ہڑتال کے پہلے ہی روز منڈی آلوؤں سے خالی ہوگئی تھی۔ یکسر خالی۔ ٹیوشن کی تلاش میں سارا دن گھر سے باہر گھومتے رہنے کے بعد لکھی سنگھ بسنتو کی وسیلہ سازی پر یقین کرتا ہوا ایک مجرم کی طرح گھر کے اندر داخل ہوا لیکن بسنتو روزمرہ کی طرح آلوؤں کا انتظار کر رہی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی لکھی سنگھ غور سے بینگن کے پودوں کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن ابھی تک تو پودوں کے کلور دخل نے بھی اچھی طرح سے نشوونما پائی نہیں تھی۔

لکھی سنگھ بسنتو سے لڑنا چاہتا تھا۔ تاکہ آلوؤں کے متعلق پوچھے ہی نہیں۔ اور لڑنے کے بعد دونو ایک دوسرے سے لڑ کر خاموشی سے اپنی اپنی جگہ پر پڑ رہیں۔ لکھی سنگھ چاہتا تھا۔ کہ اس لڑائی کے بعد ہمیشہ کی طرح بسنتو اپنے میکے چلے جانے کی دھمکی دے۔ اور وہ فوراً رضامند ہو کر اُسے سٹیشن پر بلا ٹکٹ گاڑی میں سوار کروا دے لیکن آج بسنتو نے وہ گلابی بلاوز نہیں پہنا ہوا تھا۔ آج اُس نے وہ وائل کی سفید دھوتی باندھ رکھی تھی۔ جس سے لکھی سنگھ کو عشق تھا۔

اُس وقت لکھی سنگھ نے بسنتو کو گاڑیبانوں کی ہڑتال کے متعلق بتایا۔ اور آلوؤں کے نہ لانے کی وجہ بیان کی۔ بسنتو کچھ دیر اپنا سر ہاتھ میں دیئے بیٹھی رہی۔ پھر وہ خشمگین انداز سے لکھی سنگھ کی طرف دیکھنے

ہوئے بولی۔ "تم نے ہڑتال کی مخالفت کیوں نہ کی؟"

لکھی سنگھ نے کوئی جواب نہ دیا تو بسنتو ہڑتال کے محرکوں کو گالیاں دینے لگی۔ ان محرکوں کو جن میں اُس کا اپنا لکھی سنگھ بھی شامل تھا۔ اور جن میں سے بخشی محض اسلئے نکل چکا تھا۔ کہ وہ آلوؤں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ لکھی سنگھ سوچنے لگا۔ بسنتو نے ایک اچھے کامریڈ کی طرح ہمیشہ میرا ساتھ دیا تھا۔ لیکن اب وہ بھی مجھے جواب دے رہی ہے۔ اُس وقت کرنیل گلی میں سے آیا۔ اور باپ کو خالی ہاتھ دیکھ کر رونے لگا۔ بسنتو صبح سے اُسے باپ کی آمد کا انتظار کرنے کے لئے کہہ رہی تھی۔ اپنے بیٹے کو یوں روتا دیکھ کر بسنتو اور بھی زہرناک ہو گئی

لکھی سنگھ کو بسنتو سے یہ امید نہ تھی۔ وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں میں دیکر بیٹھ گیا۔ اور سوچنے لگا۔

"کیا بسنتو رجعت پسند ہو گئی ہے؟"

پروفیسر احتشام حسین

بیزاری

متعدد ذاتی واقعات نے کئی دن سے مجھے تنہائی پسند اور خاموش بنا دیا تھا۔ لیکن لوگ آ کر مجھ سے میموریل ہال کے جلسہ میں شرکت کرنے کا وعدہ لے گئے۔ اس دن میرا جی بالکل نہ چاہتا تھا۔ کہ اس جلسہ میں شریک ہوں۔ اس لئے میں چھ بجے شام تک ادھر اُدھر پھر کر اپنے کو تھکاتا رہا۔ جلسہ ساڑھے چھ بجے شروع ہونے والا تھا۔ مجھے اس کے مقاصد سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اگر کوئی اس سلسلہ میں مجھ سے بحث کرتا تو شاید تھوڑی دیر کے بعد مجھے غصہ بھی آ جاتا۔ لیکن میں نے جلسہ کے کارکنوں سے وعدہ کر لیا تھا۔ کہ ضرور آؤں گا۔ اسلئے ساڑھے چھ بجے کے قریب نہ جانے کن تحریکات کی بنا پر ہال کے قریب پہنچ گیا وعدہ تھا نا! وعدہ پورا کرنا ایک اخلاقی فرض ہے۔ اور زندگی میں اخلاق کی کتنی اہمیت ہے!

اس وقت تو مجھے کچھ ہنسی آ رہی ہے اپنے اس خیال پر۔ لیکن اس روز میں بہت کمزور تھا۔ روحانی حیثیت سے کمزور۔ اس لئے یہ خیال مجھ پر مسلط تھا کہ کیسا ہی وعدہ کیوں نہ ہوا سے پورا کرنا چاہیئے میں ہال کے اندر بلا ارادہ داخل ہو گیا۔ جلسہ کے وقت میں زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ باقی رہے ہوں گے۔ لیکن وہاں زندگی کے آثار بہت کم تھے۔ یا شاید مجھے کم دکھائی دے رہے تھے میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا سامنے والی کرسی پر ایک لڑکی بہت خاموش اور شکست بیٹھی ہوئی تھی۔ میری طرح کھوئی ہوئی تو نہ تھی۔ لیکن تنہا ہونے کی وجہ سے وہ ریگستان میں اُگے ہوئے کسی اکیلے درخت کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔ وہ مجھ سے ذرا بھی مشابہ نہ تھی۔ لیکن میں کوشش کر رہا تھا کہ مجھ سے کوئی مشابہت اس میں مل جائے تو میں تاہیں بیٹھوں۔ پھر کوئی آ کر اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ اور وہ بدلی ہوئی نظر آنے لگی۔ اب مجھ میں اس کے دیکھنے کی تاب نہ تھی۔

جلسہ کا وقت ہو چکا تھا۔ لیکن مقرر صاحب کا پتہ نہ تھا۔ وہ لوگ جو اس جلسہ کے اغراض سے خاص ہمدردی رکھتے تھے۔ وہ بھی نہ آئے۔ اگرچہ ان لوگوں نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن نہ آئے ——— پھر اخلاق کسے کہتے ہیں؟ اگر میں نہ آتا تو ضرور وعدہ خلافی کا اخلاقی مجرم ٹھہرتا۔ کیونکہ لوگوں کو معلوم تھا کہ مجھے جلسہ کے مقاصد سے اختلاف ہے لیکن دوسرے لوگ چاہے آئیں یا نہ آئیں۔ وعدہ خلافی کریں یا اخلاق کا کوئی قانون توڑیں ان کے لئے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مختلف لوگوں کے لئے اخلاق کا استعمال بھی مختلف طرح سے ہوتا ہے۔

جلسہ چالیس منٹ تک شروع نہ ہوا۔ لوگ بیزار ہو ہو کر جانے لگے۔ لیکن میں بیٹھا رہا۔ پاس بیٹھے ہوئے لوگوں نے کارکنوں کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کہیں۔ مقرر کو کچھ اچھے الفاظ سے یاد نہیں کیا۔ مگر مجھے وقت کا احساس نہ تھا ——— اس دن میں نے ہال کی چھت ذرا غور سے دیکھی۔ کچھ نہیں تو بیس جلسوں میں ضرور اسی ہال میں شریک ہوا ہوں گا۔ لیکن میں نے اس کی چھت کبھی غور سے دیکھی ہی نہ تھی۔ بالکل سفید چھت، جا بجا ابھری ہوئی لکیریں اسے دیکھتے دیکھتے مجھے سفید رنگ کا احساس ہونے لگا۔ اور جس چیز کی یاد سب سے پہلے آئی وہ کفن تھا کفن، آخر اس وقت اس کے یاد کرنے کا کون سا موقع تھا سفید رنگت اور ابھری ہوئی لکیریں۔ کفن کے مقابلہ میں ہال کی چھت بہت طویل تھی۔ اس سے کیا ایک لمبا کفن جس میں بہت سے مُردے لپیٹ دیئے جائیں! کفن کا خیال میرے دماغ پر پوری طرح چھا گیا۔ ہم سب ایک مقبرے میں بیٹھے تھے کفن اوڑھے ہوئے۔ جلسہ کی نوعیت سے ملتا جلتا خیال ضرور تھا۔ مگر اس خیال کا موقعہ نہ تھا۔ مجھے جلسہ کے پروگرام سے بھی

نفرت تھی۔ کارکنوں کے نقطۂ خیال سے بھی اختلاف تھا۔ لیکن میں تو اتفاقاً اس گورستان میں آیا تھا۔ اس خیال پر کون ہنسنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ کبھی کبھی، اتفاقاً ہمیں اپنے ہاتھوں اپنا خون بہانا پڑتا ہے۔ شاید اسلئے غیر شعوری طور پر کفن کا خیال میرے ذہن پر مسلط ہو گیا تھا سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی کی ساڑھی بھی سفید تھی۔ یہ گلابی جاڑوں کے دن اور یہ سفید ساڑھی۔ خیر ہوگا —— مگر نہیں سفید رنگ عصمت اور عفت پاکیزگی اور پاکدامنی کا نشان بھی ہے۔ —— کفن، پاکیزگی اور پاکدامنی —— موت اور اخلاق کی پابندی، اِن میں بڑا گہرا تعلق معلوم ہوتا ہے۔ —— میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس دن مجھ میں شعور اور جاندار احساس کی کتنی کمی تھی۔ کہ میں چیزوں کے رشتہ کو بھی سمجھ نہ سکتا تھا۔

جب میرے پاس والی کرسی سے بھی لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تو میں بھی اُٹھا۔ سچ پوچھئے تو میرا ارادہ اُٹھنے کا نہ تھا۔ لیکن میرا ارادہ بیٹھنے ہی کا کب تھا۔ اِس لئے جیسا بیٹھے رہنا ویسا اُٹھ جانا۔ کیوں نہ باہر ہی چلا جاؤں اِس پاس والی لڑکی میں تو مجھ سے کوئی چیز بھی مشابہت نہیں رکھتی۔ میں باہر آ گیا۔ وہاں بھی کچھ دُنیا بدلی ہوئی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ ابھی میں باہر آیا ہی تھا۔ کہ جلسہ کے مہمان پہنچ گئے۔ گورستان میں میری جگہ خالی ہوئی تھی۔ اُسے بھرنے کیلئے کوئی ہونا چاہیئے تھا۔ میرا ایک دوست سڑک سے گذرتے ہوئے میری طرف بڑھا اور اندر جانے پر اصرار کرنے لگا مجھ میں مقابلہ کی طاقت نہ تھی۔ لیکن اُس نے خود ہی جگہ پانے کے خیال سے میرا پیچھا چھوڑ دیا۔ ورنہ میں اس کے ساتھ پھر ہال کے اندر پہنچ گیا ہوتا۔

اُس دن میں بہت چلا تھا۔ پاؤں تھکے ہوئے معلوم ہوتے تھے اِتنی دیر بیٹھ لینے کے بعد بھی تکان کا احساس کچھ بڑھ ہی گیا تھا۔ سر بھاری تھا اور دماغ خالی۔ ہر چیز کی رفتار سست تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ میرے لئے ضمیر کا وجود بھی نہیں ہے۔

اِس سے چند روز پہلے میں ایسا نہ تھا۔ ہر چیز کے بارے میں اپنی رائے قائم کر سکتا تھا۔ میں نے ایک مشاعرہ میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ ایک مباحثہ کی صدارت منظور نہیں کی تھی۔ ایک رسالہ کے ایڈیٹر کو اپنے مضمون کے دو لفظ بدل کر دینے پر کیسی تند و سخت خط لکھا تھا۔ اور مجھ سے ملنے کے لئے ویسی ہی بیقراری تھی جو ایک زندہ احساس رکھنے والے کے یہاں ہو سکتی ہے لیکن جس روز کا ذکر کر رہا ہوں اس دن یہ بھی کچھ نہ تھا۔ ہال کے دروازے سے میں اندر کی چہل پہل دو تین منٹ تک دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ مقرر نے کھڑے ہو کر تقریر شروع کی۔ میرا دل کہتا تھا کہ اس نے دیر میں آنے کی کوئی غلط وجہ بتائی ہوگی اور معافی مانگی ہوگی۔ اس کے اعضا کی حرکت اور اس کے چہرے کی شکنوں میں ایک طرح کی خجالت تھی کبھی کبھی میری زندگی میں بھی یہ موقعہ آتا ہے۔ لیکن اس وقت مجھے بولنے والے سے ہمدردی نہیں نفرت پیدا ہو رہی تھی۔ اس کا صاف ستھرا سوٹ جس کی قیمت کا اندازہ لگانا بھی میرے لئے آسان نہ تھا۔ مجھے خواہ مخواہ چیمبرلین یا ایسے ہی کسی اور مقرر کی یاد دلا رہا تھا۔ جو کسی عام مفاد کے نقطۂ نظر سے سوچ ہی نہیں سکتا۔ میں ہال کے سامنے سے ہٹ کر پارک میں چلا گیا۔ پارک کی روشوں سے دُور میں الگ الگ یوں چل رہا تھا جیسے مجھ سے کوئی جرم ہو گیا ہے۔ اور میں اُسے چھپانے کے لئے لوگوں کی نگاہ سے بچنا چاہتا ہوں۔ تھوڑے فاصلے پر ایک جوانمرد اور نوجوان عورت سبزے پر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے میں قریب سے گزرا تو دو تین دفعہ "شکایت" کا لفظ میرے کان میں پڑا۔ دوسرا وقت ہوتا اور میں ٹھیک ہوتا تو اِس لفظ پر ایک عمارت کھڑی کر لیتا۔ ایک افسانہ کی بنیاد رکھ کر ایک دلکش پلاٹ بنا لیتا۔ لیکن اس وقت میری کمزوری نے مجھ پر دھاوا کیا۔ اور مجھے یاد آیا کہ اطہر پچاس مرتبہ میرے یہاں آ چکا ہے۔ اور کتنی دفعہ شکایت کر چکا ہے کہ میں اس کے یہاں نہیں جاتا۔ میں نے سوچا۔ کہ مجھے وہیں جانا چاہیئے۔

اطہر اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ دو تین آدمی اور چپ بیٹھے ہوئے تھے میں وہاں پہنچا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں کہیں ایسی جگہ ہوں جہاں ہوا بھاری ہے اور فضا بوجھل۔ اطہر نے کچھ گرمجوشی نہ دکھائی۔ میں خود ہی بہت دنوں بعد آنے پر معذرت کرتے ہوئے ایک کرسی گھسیٹ لایا اور بیٹھ گیا۔ اطہر کے سامنے ایک جمع بھی مین

پر سگرٹ کا ڈبہ۔ راکھ کا ڈھیر اور ایک کھلا ہُوا خط تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں معلوم ہُوا کہ اطہر کی ایک قریبی رشتہ دار لڑکی نے انتقال کیا ہے۔ اور ابھی اس کی خبر آئی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہُوا کہ ہر طرف تاریکی ہے۔ ہر طرف موت، تکلیف اور ویرانی ہے۔ کمرے کی دیواریں قریب چلی آ رہی ہیں۔ چھت سمٹی جا رہی ہے۔ اور اطہر خود ایک زندہ میت ہے۔ جو لوگ بیٹھے تھے رسمی گفتگو کے بعد چلے گئے۔ اور مجھے اپنے ایک قدیم دوست کو تنہا پا کر اطہر کی آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ پھوٹ نکلا۔ اطہر نے مدتوں اس لڑکی سے محبت کی تھی۔ اور یقین رکھتا تھا کہ اس کے ساتھ شادی بھی ہو جائیگی۔ جو شخص اپنے کو نہ سنبھال سکتا ہو جس کے یہاں ضمیر کا وجود ہی نہ ہو۔ وُہ دوسرے سے کیا ہمدردی کر سکتا ہے۔ مَیں نے کھوکھلی اور رسمی باتیں کیں۔ میرے خیالات میں ربط نہ تھا۔ مجھے اب اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں کوئی تسکین کا پہلو بھی نہ تھا۔ اطہر کے لئے تو بالکل خلاف توقع تھا لیکن میرے لئے بالکل ضروری کہ میں وہاں سے ہٹ جاؤں۔

اطہر کے یہاں سے چل کر مَیں شہر کی سب سے گنجان سڑک پر آ گیا جب موٹروں اور ٹانگوں سے برابر بچنا پڑا تو مجھ میں کچھ زندگی سی آئی اور اطہر کی مصیبت کا احساس گھٹنے لگا۔ موٹروں کی روشنیاں ہر طرف سے تانے بانے کی طرح ایک جال سا بنتی جاتی تھیں اور میرا جی چاہتا تھا کہ میں اطہر کے یہاں واپس جاؤں۔ اور اس کے رنج میں پوری طرح شریک ہو کر محبت اور دوستی کا ثبوت دُوں لیکن ٹھیک اسی وقت سامنے سے لوگ ایک جنازہ لئے ہوئے گزرے۔ اور میں جیسے کہیں دُور پھینک دیا گیا۔ بجلی کے کھمبوں میں روشنی مدھم معلوم ہونے لگی موٹروں کی آواز سے بیزاری ہونے لگی۔ اور مجھے اپنے ایک مرحوم دشمن کا خیال آیا۔ جو مجھ سے جلتا تھا جو مجھے ذلیل سمجھتا تھا اور اپنی موٹر میں بیٹھ کر مجھے حقارت سے دیکھتا تھا کیونکہ مَیں اس کی موٹر دیکھنے کے بعد اپنے میلے بوٹ پر ضرور نظر ڈالتا تھا جو دیر تک چلنے کی وجہ سے بُری طرح گرد آلود ہو جاتے تھے۔

تنہائی کا احساس اتنا شدید مجھے کبھی نہیں ہُوا تھا۔ میری بیزاری مجھے دھکیل کر انسانوں سے دور کر رہی تھی۔ لیکن یہ ممکن کیسے تھا۔ اپنی بیکاری کے زمانے میں مَیں ہزاروں آدمیوں سے مِل چکا ہُوں۔ مشاعروں کی وجہ سے کچھ لوگ جانتے ہیں۔ جب سے نوکری کر لی ہے تھوڑے سے ہی سہی۔ لیکن کچھ لوگ اس طرح بھی جاننے لگے ہیں۔ بچ کر کہاں جا سکتا تھا۔ دُنیا کو کیسے چھوٹا بنایا جا سکتا ہے مجھے پھر اسی پارک میں پناہ ملی۔ اور میری نگاہ میموریل ہال کے دروازے پر وانستہ پہنچی۔ سرخ اور سبز روشنی میں لکھا ہُوا ویل کم (WELCOME) دیکھ کر مجھے غصہ آیا۔ مَیں محسوس کرنے لگا کہ سب مجھے چڑانے اور بنانے کے لئے ہے۔ مَیں اب ہرگز وہاں نہ جاؤں گا۔ اس گورستان میں۔ وہاں کیوں جاؤں مجھے کس سے دلچسپی ہے۔ کیا اس تقریر سے جو نفاق اور دشمنی کا بیج بونے کے لئے کی جا رہی ہے۔ کیا اُن کاگیوں سے جو اپنی کامیابی پر خوش ہیں۔ اور دُور تک نہیں دیکھتے کہ ان کا مقصد کتنا ذلیل ہے۔ کیا اُس آگے والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی لڑکی سے جس میں کچھ نجمہ سے مشابہت نہیں مَیں کیوں جاؤں۔ نفرت کا طوفان سینے میں اُٹھتا رہا۔ اور میں آنکھیں بند کر کے پارک کی سب سے کنارے والی بنچ پر بیٹھ گیا۔ بنچ کی لکڑی اور لوہے میں کافی ٹھنڈک تھی۔ بہت کم لوگ پارک کے اس حصہ میں دکھائی دیتے تھے۔ اور میری خود تسلی کے لئے یہ تنہائی کافی مناسب تھی۔

ممکن تھا کہ میں اپنے خیالات کو یکجا کر کے کسی نتیجہ پر پہنچتا۔ مَیں اپنی تنہائی اور بیزاری کا اندازہ لگا کر انسانوں کی بھیڑ میں شامل ہو جاتا اور زندگی کی کشمکش سے لطف لیتا لیکن ابھی دو منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ ایک شخص میرے قریب آ کر بنچ پر بیٹھ گیا بیٹھتے ہی مجھے پہچان کر بولا "بڑی خوشی ہوئی اس وقت تم سے ملاقات ہو گئی"

میں کچھ نہ بولا۔ تو جھجک کر اُس نے پھر کہا۔

" آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟"

مَیں نے متحیر اور خوفزدہ آنکھوں سے اُسے دیکھا۔ جیسے وُہ میری بیکسی اور بیزاری کا رازدار بننے آیا ہے۔ اُس نے کہا "میرا نام احمد ہے۔ احمد! کلکتہ میں ملاقات ہوئی تھی مہینوں ساتھ رہا تھا"

مَیں کچھ بول نہ سکا۔

" اب یاد آ گیا ہو گا" اور پھر اُس نے میرا نام لیا۔

"مجھے معاف کیجئے آپ کو غلط فہمی ہوئی" آخر مجھکو کہنا پڑا۔

"مگر آپ کا نام ؟"

"ہاں نام تو آپ نے ٹھیک بتایا۔ لیکن نام سے کیا ہوتا ہے" جیسے اُسے غصّہ آگیا۔ رفتار میں ایک طنز اور جھنجلاہٹ لئے ہوئے احمد چلا گیا۔ اس کی چال میں نے پہچانی، کلکتہ کے ہوٹل کے ساتھ جیت پور کے سنسان مکان میں ہم لوگوں کے جلسے۔ احمد سے ہر مسئلہ میں کتنی مدد ملتی تھی۔ سب باتیں ایک ایک کر کے میرے دماغ کے سامنے آئیں جب وہ دُور چلا گیا تو میں نے اُسے آواز دی "احمد! احمد! واپس آؤ احمد!" مگر وہ چلا گیا۔ اور میموریل ہال کے دروازے تک میں نے اُسے جاتے دیکھا۔ پھر میری نظر دروازے کی روشنی پر پڑی۔ اور مجھے نہیں معلوم احمد کہاں چلا گیا۔ مجھے شک سا ہُوا کہ ضرور اسی جلسہ میں چلا گیا ہوگا۔ میں دس منٹ خاموش بیٹھا اسی پر غور کرتا رہا۔ پارک کے دوسرے حصہ میں جو مجھ سے کافی فاصلہ پر تھا لوگ جمع ہو رہے تھے۔ ان کی تعداد ہزار تک پہنچی ہوگی۔ تقریر کی ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی۔ کہ مجھے شور کی آواز سنائی دی۔ کافی شور ہوا۔ اور طرح طرح کی آوازیں۔ دو منٹ میں لوگ بھاگتے ہوئے دکھائی دئے۔ جلسہ خلاف قانون تھا۔ اور پولیس نے ہلکے لاٹھی چارج سے مجمع کو منتشر کیا تھا۔ صرف تین آدمیوں کو ہسپتال پہنچانے کی ضرورت پیش آئی۔ مجھے یاد آیا کہ اُن دِنوں پہلے میں نے بھی جلسہ میں شریک ہونے کا پختہ ارادہ کیا تھا۔ میں چونک کر جلسہ کی طرف بڑھا۔ جب ہر شخص اُدھر سے واپس آرہا تھا۔ میں اُدھر جا رہا تھا چبوترے کے قریب پولیس کے چند سپاہی کھڑے مسکرا رہے تھے۔ تھوڑی دُور پر اب بھی بعض سپاہی بھاگنے والوں کا پیچھا کر رہے تھے۔ اور کچھ فاصلے پر آگئے جہاں کوئی دیکھ نہیں رہا تھا خون میں لتھڑا کوئی پڑا تھا۔ میں وہاں پہنچا اور احمد کو پہچان کر میں نے اس کا سر گود میں لے لیا۔ گرم گرم خون میرے زانو پر ٹپکتا رہا۔ گرم، سُرخ اور تازہ خون راہِ عمل میں میرے ساتھی کا خون! خون! زندگی کا نشان پُرانے دِن واپس آگئے۔ اور زندگی پھر اہم معلوم ہونے لگی۔

شیخ اے عبداللہ

مترجمہ ن۔م۔ راشد

پیر صاحب کی خانقاہ

کالے کوسوں سے آفت رسیدہ لوگ پاپیادہ چل کر حضرت پیر عبدل کی خانقاہ پر دعائیں مانگنے آتے۔ اپاہج آتے اور اپنے ہاتھ پیر سیدھے ہو جانے کی التجا کرتے، فکروں سے گھرے ہوئے لوگ آتے تاکہ انہیں روحانی تسکین نصیب ہو۔ بے اولاد، تاکہ ان کے دلوں کی بھوک دور ہو۔ قریب مرگ بیماروں کے رشتے دار، تاکہ اُن کے پیاروں کو پھر تندرستی حاصل ہو

اپنی امیدوں سے بہ یزدوں پر طرح طرح کے شاندار ارمانوں کا بار اُٹھائے مشرق کے بے درد آفتاب کی کڑکتی دھوپ میں کٹھن منزلیں طے کرتے ہوئے جب یہ زائرین اپنی منزل مقصود پر پہنچتے تو اپنا تمام دکھ درد بھول جاتے۔ اُن کے دلوں کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔ اور وہ تازہ امیدیں لے کر گھروں کو واپس چل کھڑے ہوتے۔ اس وقت وہ اپنے دلوں میں تقویت کا احساس پاتے۔ انہیں اپنے سامنے ایک شفقت آلود مستقبل دکھائی دیتا جس کے آغوش میں وہ تمام کامرانیاں ہوتیں جن سے اُن کے بگڑے ہوئے ماضی نے اُنہیں شدت سے محروم کر رکھا تھا۔

درگاہ کا مجاور الٰہی بخش متواتر ساٹھ برس سے خانقاہ کی خدمت سرانجام دے رہا تھا۔ وہ خانقاہ کا ایک ضروری حصہ بن چکا تھا۔ جب تک کوئی زائر واپسی سے پہلے اُس خدا رسیدہ بزرگ سے کوئی گنڈا تعویذ نہ حاصل کر لیتا۔ اُس کی زیارت ادھوری تھی۔ الٰہی بخش کو مرحوم بزرگ سے کم احترام کی نظر سے نہ دیکھا جاتا تھا اپنے لانبے قد، لمبی داڑھی، جھکی ہوئی کمر، کمزور شانوں پر لٹکی ہوئی سفید زلفوں کے باعث گویا فلک پیر کا مجسمہ معلوم ہوتا اس بڈھے متولی کے دن میں ہر روز بے شمار مرید آکر شامل ہوتے۔ ان مریدوں میں صرف وہی جو ابھی مبتدی تھے۔ متوفی بزرگ کے حالات کے بارے میں استفسار کرتے۔ ورنہ وہ مرید جو عرصہ دراز سے، باقاعدہ درگاہ میں آتے جاتے تھے۔ خوب جانتے تھے۔ کہ مرحوم کے بارے میں سرعام ایسے سوالات کرنا۔ گویا مرحوم کے تقدس کی توہین ہے۔

ایک شام سب زائرین رخصت ہو چکے تھے۔ تنہا ایک مرید باصفا باقی رہ گیا تھا۔ اس بیابانی خانقاہ پر سکوت طاری تھا۔ جھونپڑی کے فرش پر متولی ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کی زرد پژمردہ اُنگلیوں میں سے تسبیح کے دانے ایک ایک کر کے گزر رہے تھے۔ متولی نے اپنی سیاہ آنکھیں جن میں اب تک چمک باقی تھی اپنے مرید پہ گاڑ دیں۔

"عزیزمن۔ تم دیکھتے ہو۔ میں اب ضعیف ہو چکا ہوں۔ میں نے اپنی تمام عمر نماز اور خداوند تعالےٰ کی حمد و ثنا میں بسر کی ہے قریب ستر سال سے میں اس مقدس بارگاہ کی خدمت سرانجام دے رہا ہوں۔ اب اللہ تعالےٰ کو منظور ہوا تو وہ مجھے جلد اپنی بارگاہ میں بُلا لے گا۔ پھر وہ مصیبت زدہ لوگ جو اپنی دنیوی پریشانی کو دور کرنے کے لئے اس آستانے سے مدد کے طالب ہوتے ہیں اُن کی دستگیری کون کریگا؟ میں اس مسئلے پر مدت سے غور کر رہا ہوں۔ اور اگر آج مجھے معلوم ہو جائے۔ کہ میرے بعد میرا خلیفہ کون ہوگا۔ تو میری روح کو تسکین ہو جائے۔ میں نے اس اہم مسئلے پر بنا بتی غور۔ فکر کیا ہے۔ مجھے یہی جواب ملا ہے۔ کہ میرے بیٹے تمہیں میرے بعد میرے خلیفہ ہو گے"۔

میرے مخدوم میں اپنے کو اس مقدس فرض کے لائق سمجھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ اس بارگاہ عالیہ کا متولی بننے کے لئے میری قابلیت بہت محدود ہے۔ اللہ تعالےٰ آں محترم کے زہد و تقوےٰ کی عمر دراز کرے"۔

"تمہارے قلب کی صفائی تمہاری عمر کے ساتھ بڑھتی جائیگی اور اس اثنا میں تمہاری قابلیت کا امتحان بھی ہو جائے گا۔ اس پر سکون مقام پر دنیا کے جھگڑے بہت کم ہیں۔ اللہ تعالےٰ ہر روز اپنے الطاف عمیم کے خزانے مجھ گنا ہگار پر زائرین کی وساطت سے نازل کرتا رہتا ہے۔ جو بفضلہ میری ضروریات کے اعتبار سے بہت کافی ہیں"۔ "قبلۂ محترم، میں کیونکر اپنے آپ کو اس عزت کے قابل ثابت کر سکتا ہوں؟"

"بیٹا عزیز خاں۔ کل صبح تم اپنی لاٹھی اور گدھا لے کر صحرا میں نکل جاؤ۔ دور دراز کا سفر کر کے علم و حکمت کے خزانے جمع کرو اور اس وقت واپس لوٹو۔ جب تمہارے دل سے حزن و خوف کا احساس جاتا رہے"۔

"بسر و چشم۔" نوجوان نے حامی بھرتے ہوئے کہا۔ "خداوند تعالےٰ میرا حامی و ناصر ہو۔ اور آپ کی دعائیں میری رفیق ہوں"۔

مرید نے تمام رات نمازیں گذاری۔ جب پو پھٹی تو بوڑھے سجادہ نشین نے مسافر کو دعائیں دیں اور گدھا اور لاٹھی اُسکے حوالے کر کے اُسے رخصت کیا۔ اور آنکھوں پر ہاتھوں کا سایہ کئے اپنے مرید کو جاتے ہوئے تکتا رہا۔

نوجوان کئی دن تک متواتر چلتا رہا۔ راستے میں جو تھوڑے بہت پھل ملتے کھا لیتا۔ دوپہر کی تند و تیز دھوپ سے بچنے کے لئے شاذ ہی کسی سایے میں پناہ لیتا مبادا کسی آزمائش میں کوئی کسر باقی رہ جائے۔ رات پڑنے پر جہاں کہیں تاریکی اُسے آلیتی وہیں پڑ کر سو رہتا۔

کئی ہفتے اسی طرح گذر گئے۔ حتےٰ کہ سالک راہ وقت اور سمت تک احساس بھول گیا۔ کئی روز اُسے بھوکے پیاسے گزر جاتے۔ بسا اوقات بخار کے سبب قدم جواب دے دیتے۔ اُس کے گدھے کا یہ حال تھا۔ کہ اس بے آب و گیاہ جنگل میں اُسے جہاں کہیں گھاس کے دو تنکے ملتے انہیں کو کھا لیتا۔ ورنہ اکثر ایسا وقت آن پڑتا کہ بھوک، جسکا تجربہ اس سے پہلے اُسے کبھی نہیں ہوا تھا اُسے کھانے کو دوڑتی۔

ان تمام مصائب میں، اس دھوپ کی اذیت بخش تپش میں، بخار سے پھٹے اور سُوجے ہوئے ہونٹوں میں، زخمی تلووں اور صحرا کی بے پایاں تنہائی میں عزیز خاں کو سوائے اس کے کچھ نظر نہ آتا تھا کہ خانقاہ کی خدمت اور حفاظت کے لئے جو فرائض وہ تارک الدنیا زاہد سر انجام دے رہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ اُس کی قابلیت بڑھ رہی ہے۔

ایک صبح آدمی اور جانور دونوں بھوک اور پیاس کے مارے سخت نڈھال ہو رہے تھے۔ گدھا اس قدر بیمار تھا۔ کہ اُس سے ایک قدم نہیں چلا جاتا تھا۔ اگر وہ کسی وقت ہمت کر کے اٹھتا بھی تھا تو دھڑام سے زمین پہ گر پڑتا تھا۔ مسافر کے پاس پانی ختم ہو چکا تھا۔ نوجوان دن بھر کسی بیابانی چشمے کی تلاش میں مارا مارا پھرا کیا۔ لیکن اُسے ایک قطرہ پانی دستیاب نہ ہوا۔

شام کے قریب جب وہ اپنے خستہ و نزار گدھے کے پاس لوٹا تو کیا دیکھتا ہے۔ کہ گدھا مرا پڑا ہے۔ اُس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اب اُس کا کوئی یار و مددگار نہ تھا۔ اُسکے رفیق سفر کی موت اُس کے لئے ایک جانگداز صدمہ تھی۔ وہ اس کا ماتم کرتا تھا۔ اور اُس کے دل میں اُس کی بے پناہ خدمت گذاری کا خیال آتا تھا۔ جس سے اُس نے مرتے دم تک منہ نہ موڑا تھا۔ جن غیر معمولی حالات میں اس غریب گدھے کی موت واقع ہوئی تھی۔ اُنہوں نے اُسے زندگی میں قابل تعظیم اور موت کے بعد سُرخرو کر دیا تھا۔ وہ کوئی ایسا ویسا جنگلی جانور نہ تھا۔ کہ اسے مردار خوار گدھوں کے بے رحم پنجوں میں چھوڑ دیا جاتا۔

اُس نے سوچا۔ کہ اپنی اس ہر لمحہ بڑھتی ہوئی ناتوانی میں

بھی میں اس گدھے کی مِیں آخری خدمت کے قابل ہوں۔ وہ کہکے رہونگا۔ چنانچہ اُس نے اُسے زمین میں دفن کرنے کا عزم کر لیا۔

ایک نحیف آدمی اپنے کو کسی عمل پر آمادہ کرنا چاہتے۔ تو اُسے اپنی تمام قوتِ ارادی جمع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنے آخری رفیق کے لئے جس سے اُسے اب کبھی ملاقات کی امید نہ تھی ریت میں قبر کھودنا اُس جیسے افسردہ خاطر شخص کے لئے ایک زہرہ گداز کام تھا۔

جب گدھے کی لاش پر ریت کا ڈھیر لگ چکا۔ تو جتنی ہمت اُس میں باقی تھی۔ اُس سے کام لے کر خداوندِ کریم سے مدد کا طالب ہوا۔ اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔

دعا ابھی اُس کے منہ سے نکلی بھی نہ تھی کہ اجابت کے دروازے کھل گئے۔ کیا اُسکے سامنے سراب تھا یا اُس کا دماغ ہی مختل ہو گیا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے چند سوگز کے فاصلے پر سواروں کا ایک دستہ کھڑا تھا۔ بیمار کے کانوں میں آدمیوں کے نعروں اور قہقہوں کا شور پڑنے لگا۔ اب یہ دستہ ایک سوگز کے فاصلے پر آن کر رکا۔ ایک دو لمحے کے بعد ایک سوار اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑاتا ہوا اُس کی جانب بڑھا۔ اور اُس سے آن کر پوچھنے لگا۔ کہ تم کون ہو۔ اور کیا تمہیں مدد کی ضرورت ہے؟

اس ناتوان مسافر پر خوف طاری ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا۔ فرض کرو۔ اگر میں اس شخص سے کہدوں۔ کہ یہ گدھے کی قبر ہے تو کون میری بات کا یقین کرے گا۔ اور اگر ان لوگوں نے مجھے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا مشرق میں گڑا مردہ اکھاڑنا جائز نہیں۔ تو میں ان پر اپنا عندیہ کیسے ظاہر کرونگا۔ اچھا میں اب کم بولونگا تاکہ تضحیک اور حرف گیری سے بچا رہوں۔

سوار بولا "ہمارا شیخ اپنے رفیقوں کے ساتھ اپنے وطن کو واپس جا رہا ہے۔ از بسکہ تم مسافر ہو۔ تمہیں جس قسم کی مدد کی ضرورت ہوگی۔ وہ تمہیں بخوبی بہم پہنچائے گا"

عزیز خاں نے کہا۔ "ہاں میں ایک مسافر ہوں۔ اور حق کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہوں۔ مجھے بھوک اور پیاس نے سخت لاچار کر رکھا ہے"۔ اُس نے سوار سے التجا کی۔ کہ وہ جاکر اُس کی طرف سے اپنے شیخ کا شکریہ ادا کرے۔ کھانے کے لئے روٹی اور پینے کے لئے تھوڑے سے پانی کی درخواست کرے۔

اُس آدمی نے شیخ کے سامنے مسافر کا حال اس دردبھرے لہجے میں بیان کیا کہ شیخ نے حکم دے دیا کہ فوراً مسافر کے پاس پانی پہنچایا جائے۔ اور اُس سے کہدیا جائے۔ کہ جب تک وہ صحرا میں قیام کریگا۔ اُس کے پاس دن میں دو مرتبہ طعام پہنچتا رہے گا۔ شیخ نے کہا یہ قبر یقیناً کسی خدا رسیدہ بزرگ کی ہے۔ جنہوں نے راستے میں انتقال فرمایا ہے۔ یہ نوجوان غالباً اُن کا مرید ہے۔ قدرتی بات ہے۔ کہ مرید اپنے مرشد کی وفات کا ذکر نہیں کرنا چاہتا

مسافر کے پاس ہر روز طعام اور پھل آنے لگے۔ اور چند ہی دنوں میں اُس کی جان میں جان آگئی۔ شیخ کو تارک الدنیا لوگوں سے دلی عقیدت تھی۔ وہ ایک روز خود چل کر زیارت کے لئے آیا اور کہا کہ میری دلی تمنا ہے۔ کہ اس مزار پر ایسا شاندار روضہ تعمیر کراؤں۔ جیسا کہ میری قدرت میں ہے۔ نوجوان سے اُس نے کہا۔ کہ میں آپ کا تہ دل سے ممنون ہونگا۔ اگر آپ اس خانقاہ کا محافظ بننا قبول فرمائینگے

روضے کی عمارت فوراً بن کر کھڑی ہو گئی۔ اور ہر اُس پتھر کے ساتھ جو اُس عمارت میں چُنا جاتا تھا۔ قبر کے نیچے چھپے ہوئے راز پر کئی پردے پڑتے جاتے تھے۔ اور اُس کے افشا کا امکان دور تر ہوتا جاتا تھا۔

بالآخر یہ عظیم الشان مقبرہ تعمیر ہو گیا۔ ہر روز شیخ کے ہاں سے طعام آجاتا۔ چند دنوں میں زائرین کا ہجوم ہونے لگا۔ اور لوگ جیسے اُس دوسرے مقبرے پر اپنی آرزوئیں اور التجائیں لے کر جایا کرتے تھے۔ اب اس مقبرے پر بھی آنے لگے۔ ان زائرین میں سے اکثر مقبرے کے متولی کو خیرات بھی دے جایا کرتے۔

متولی اور مقبرے دونوں کی بزرگی کی خبریں دور دور پہنچنے لگیں۔ خواہ شہر ہو خواہ بیابان خوشخبری اُڑ کر پہنچ ہی جاتی ہے۔ دُور دُور سے آنے والے زائرین کی تعداد ہر روز بڑھنے لگی

اور اُن کے ساتھ ساتھ متولی کی دولت میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ وُہ فرض جو اُس کی مرضی اور کوشش کے بغیر اُس پر عائد کر دیا گیا تھا۔ اب اس پر چھا گیا اور اُسے شکست فاش دے دی۔ اُسے شکست کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ ہر چند اسکے اپنے احساسات اس بارے میں کتنے ہی مخلوط کیوں نہ تھے۔ رفتہ رفتہ یہ گتھی خود بخود سلجھ گئی۔ اُس کی پریشانی کم ہو گئی۔ اور آخر کار بالکل جاتی رہی۔

لیکن اس نئے مقبرے کی پرستش ختم ہونے کی بجائے ایک نیا رنگ لائی۔ جو اُس کے متولی کے خواب خیال میں بھی نہ تھا۔

جو لوگ پیدل چل کر نہیں آسکتے تھے۔ اب اُنہیں صحرا کی دہکتی ہوئی، اداس برہنہ دھوپ میں پالکیوں میں بٹھا کر لایا جانے لگا۔ وہ دل میں یہ تمنا لے کر آتے تھے۔ کہ اس مقدس متولی کی وکالت اور اس خدا رسیدہ ولی اللہ کی دُعا برکت سے اُن کی صحت اور مسرت میں جن اجزا کی کمی ہے۔ جلد سے جلد اُن کی تلافی ہو جائے گی۔ وہ زائرین جو اس سے پہلے حضرت پیر عبدل کی خانقاہ کا کٹھن سفر طے کیا کرتے تھے۔ اب احمد علی پیر کی خانقاہ کا اس سے کئی گنا زیادہ خطرناک راستہ اختیار کرنے لگے

آخر اُس بوڑھے متولی نے اپنے ذریعۂ معاش کو ختم ہوتے پایا اور فاقوں کی نوبت آپہنچی۔ اُس نے احمد علی پیر کی خانقاہ کا تذکرہ متعدد بار سنا تھا۔ اور وہ حیرت میں تھا۔ کہ آخر یہ معزز بزرگ کون ہیں وہ بے حد کمزور اور معمر تھا۔ لیکن آخر کار اُس نے اس کا عزم کر ہی لیا۔ کیا عجب کہ اسی سفر سے اُسکے بڑھاپے کی خشک کھیتی میں از سرِ نو بہاریں لہلہا اٹھیں۔ "میں جا کر ضرور یہ پتہ لگاؤں گا کہ یہ بزرگ کون ہیں جنہوں نے نادانستہ طور پر مجھے میری روزی سے محروم کر دیا ہے۔ ورنہ اسی تلاش میں اپنی جان دے دونگا،،

اُس کا گدھا تو پہلے ہی اُسکے ہاتھ سے جا چکا تھا۔ اس لئے اُس نے اس سفر کے لئے اپنے پاؤں ہی پر اعتماد کیا۔

شدت کی گرمی اور آندھیاں سہتا ہوا، جن کے بغیر صحرا کے کسی مسافر کو چارہ ہی نہیں۔ وہ کئی ہفتے اس بیابان میں چلتا رہا حتیٰ کہ احمد علی پیر کی خانقاہ پر جا پہنچا۔

وہ اس لق و دق مقام پر زائرین کا یہ ہجوم دیکھ کر عالمِ حیرت میں کھو گیا۔ نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ یہ بڑھا نمازیوں کی آخری صف میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ جب نماز ہو چکی تو لوگ سجادہ نشین کی اجازت سے ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ اور آخر کار صرف چند آدمی باقی رہ گئے۔ جب نوجوان نے اپنے پرانے مرشد کو دیکھا تو اُس پر اس قدر گھبراہٹ اور عجز کا عالم طاری ہو گیا۔ کہ وہ اپنے آقا کے قدموں میں گر پڑا۔

پہلے پہل تو الف بخش اس مزار کے متولی یعنی اپنے پرانے مرید عزیز خاں کو جو اب عمدہ خوراک ملنے سے مضبوط اور تنومند جوان بن چکا تھا۔ پہچان نہ سکا۔ پھر اُس نے نوجوان کو زمین سے اٹھایا۔ اور گلے لگا کر پوچھا۔ کہ تم ان ولی اللہ کی خانقاہ کے متولی کیونکر بن گئے۔ جن کے حالات معلوم کرنے کے لئے میں دور دراز کی مسافت طے کر کے آیا ہوں۔

عزیز خاں سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔ اور اپنے نیک آقا کی نگاہوں سے اپنی نگاہیں ہٹا لیں۔ انتقام کی روح اُس کا تعاقب کر رہی تھی۔ اب سچ کہنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔

"میرے مخدوم۔ میں آپ کی ذات گرامی کو جسکے لئے میرے دل میں عقیدت اور محبت کے سوا کچھ نہیں، اپنا رستے سیاہ کرنے کے قابل نہیں رہا۔ لیکن آپ کے سامنے مجھے سچ کہنے کے سوا چارہ نہیں۔ اس مقبرے میں آپ ہی کا گدھا دفن ہے۔ یہ غریب راستے میں مر گیا۔ اور میں نے اس ڈر سے کہ مجھے کہیں قتل کے الزام میں گرفتار نہ کر لیا جائے۔ یہ راز کسی پر افشا نہ ہونے دیا،،

الف بخش بول اٹھا۔ "میرا گدھا؟ میرا گدھا؟،،

"جی ہاں، میرے آقا۔ مجھے خدارا معاف کر دیجئے۔ میری پشیمانی کی کوئی حد نہیں۔ اور میں انتہائی خجالت کے ساتھ اپنا سرِ ندامت آپ کے قدموں پر رکھتا ہوں،،

"میرے عزیز، اُٹھو، میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ نہیں جنر ہے۔ کہ میں ایک ولی اللہ کی خانقاہ کی محافظت گزشتہ ساٹھ [illegible] سے کر رہا ہوں،،

"قبلہ میں خوب جانتا ہوں"

"تمہیں یہ بھی معلوم ہے۔ کہ اس نئے مزار کی تعظیم اُس مزار کے مقابلے میں جس کا میں متولی ہوں۔ اس قدر بڑھ گئی ہے۔ کہ میں روزی سے محروم ہو گیا ہوں۔ اور مجھے اُس مزار کو خیرباد کہنا پڑا ہے۔ اب تمہیں یہاں پاکر کہ تم میرے پُرانے مرید ہو۔ میری آرزو ہے۔ کہ میں اپنی عمر کا باقی حصہ یہیں گزار دوں"

جوں جوں دن گزرتے گئے۔ ضمیر کی ملامت بڑھتی گئی جب عزیز خاں کو یہ خیال آتا۔ کہ اُس نے اپنے آپ کو کس دام میں پھنسا لیا ہے۔ اور اب گویا اُسکے لئے اس دام سے نکلنا ممکن ہی نہیں ہے تو اُسکے سینے پر سانپ لوٹ جاتے۔ ایک روز جب وہ اپنے بوڑھے پیر الف بخش کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ وہ بولا۔ کیا میں اُن ولی اللہ کے حالات آپ سے دریافت کر سکتا ہوں۔ جن کی خانقاہ کی خدمت آپ گزشتہ ستر سال سے کر رہے ہیں؟۔

"بیٹا یہ حالات آج تک کسی فانی انسان پر ظاہر نہیں کئے گئے۔ لیکن میں تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ تاکہ تمہارے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو۔ وہ مقبرہ تمہارے گدھے کے دادا کا ہے"

اختر اورینوی

پس منظر

"نا بہن زمانہ بُرا ہے۔ ایسا بھی کیا۔ وھا کڑسی جوان جہان کنواری لڑکیوں کو بندریا کی طرح در بہ در لئے پھرنا۔ بڑی بھابی تو زمانہ بھر سے نرالی ہو گئی ہیں۔ آخر میں نے بھی تو تین تین لڑکیوں کو پوس پال کر بیاہا۔ اور اب یہ ماشاءاللہ چوتھی شاکرہ ہے۔ بھلا کوئی انگلی تو اُٹھائے"

——اور اس کے جواب میں نہیں، صدائے بازگشت کے طور پر——

"سچ کہتی ہو بہن۔ کنواری لڑکیوں کو داب کر رکھنا چاہیئے۔ واقعی بڑی بھاوج شرافت پر بٹہ لگاتی ہیں۔ تنویر و پروین کو تو دیکھو۔ یہ فرنگنوں کے سے انداز۔ اتھان پر کی لڑکیاں اور ایسی سر چڑھی۔ بڑی بوڑھیوں کی باتوں میں ٹپ ٹپ دخل کیسا دیتی ہیں"

یہ تھی وہ گفتگو جو شاکرہ نے اپنی کوٹھڑی میں بیٹھے بیٹھے سنی۔ اس کی ماں اور رشتے کی خالہ آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ شاکرہ کو غصہ آ گیا۔ اُسے اِن خالہ صاحبہ سے نفرت تھی۔ ایک تو اُسکی والدہ سخت پابندیوں کی قایل اور اس پر یہ کریلے اور نیم چڑھے والی بات۔

"خالہ بنی ہیں! اُونہہ خالہ! ہے کیسی موٹی گول مٹول۔ ہر وقت کچر کچر پان چباتی رہتی ہے۔ بوڑھی بکری!"

شاکرہ نے ناخن کریدتے ہوئے زیر لب کہا۔ اس کی تیوری پر بل آ گئے۔ شاکرہ پندرہ سال کی تھی مگر اس کی پرورش ایسے خاندان میں ہو رہی تھی جہاں کنواری لڑکیاں اس طرح رکھی جاتی ہیں۔ جیسے جیل کے خطرناک قیدی یا پاگل خانہ کے تشدد پسند مریض۔ اس کی صحت یوں تو اچھی خاصی تھی مگر وہ کچھ گھٹی گھٹی اور چڑچڑی سی معلوم ہوتی تھی خالہ بی کی باتیں سنکر وہ جل بھن گئی پھر کچھ واضح اور غیر واضح خیالات اس کے دماغ میں چکرانے لگے۔ وہ تنویر و پروین کو بے حد پسند کرتی تھی۔ ان کی خوبصورت ساریاں اُن کی رنگین گفتگو! یک بیک تنویر و پروین کے گلنار لب شاکرہ کے تصور میں مہک اُٹھے "کاش میں بھی اِس طرح بج سکتی!" پھر اُن دو بہنوں، دو حسین بہنوں کی پیاری پیاری باتیں۔ ادب، افسانے، نظمیں، "آہ اُن نظموں میں کیا جادو ہوتا ہے! وہ بھلی سی نظم۔ اچھا وہ —— کاش تم چلے آتے مستیٔ صبا بن کر! اور میرے ہاں۔ کل کا گمو ٹرا، سمندری شہزادی۔ جیسے میں ابھی تک ننھی ہی دھری ہوں۔ ہوں! اور جو یکھو۔ کیا کتاب ہوئی! راہِ نجات۔ سوچ کا ثواب۔ جنت کا حصول۔ بہشتی زیور۔ بُرائی کا انجام۔ حبنعتہ اللہ!

وہ تو خدا بھلا کرے ناصر کا۔ بھائی جان کی میز پر سے اچھے اچھے رسالے پڑا کر لا دیتا ہے۔ بیچارہ ناصر۔ اور جو ناصر نہ ہوتا! اُونہہ! ..."

شاکرہ انہیں خیالات میں گم تھی کہ پھر گفتگو کی ایک سمع خراش موج باہر سے آئی۔

"یہ تنویر و پروین تو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ مجھے ان کے لچھن اچھے دکھائی نہیں دیتے۔ بھلا کنواری لڑکیاں یوں ٹھٹھا کیے لگاتی ہیں" یہ خالہ بی کی تنقید تھی۔ شاکرہ کا جی چاہا کہ وہ انہیں چڑا کر خوب زور سے قہقہے لگائے مگر یہ ناممکن تھا۔ اس کا ارادہ بغاوت بجھ کر رہ گیا۔ اُسے تو مُسکرانے تک کی اجازت نہیں تھی۔ ہر وقت سنجیدہ کیا ماتمی چہرہ بنائے بیٹھے رہنے کا حکم تھا اسے۔ نحوست، بد ہیئت چوروں کی طرح دبے پاؤں چلو۔ مجرموں، خطا کاروں کی طرح سمٹے سمٹائے رہو۔ غرض سینکڑوں احکام تھے جن کے مسلسل بوجھ تلے اس کی ساری اُمنگ پس کر رہ گئی تھی۔ شاکرہ کے چہرہ پر نفرت، پسپائی اور ایک بیزار سی چڑچڑاہٹ کے نقوش بنے اور پھر نوع در نوع جذبات کی موجوں کے ہلکوروں سے مٹ گئے۔

یہ خالہ بی شاکرہ کی والدہ کی ہاں میں ہاں ملاتیں اور ان کی ہر بات کو سراہتی تھیں۔ اس کے صلے میں دعوتیں، سوغاتیں اور ہر طرح کی خاطر داریاں۔ ان کے میاں نے ایک رنڈی رکھ لی تھی اور یہ انتقاماً اکثر گھر سے غائب رہا کرتی تھیں۔ ایسے ہی قدر دان، عزیزوں کے یہاں۔ مگر ان کے برتاؤ میں ایک خاص ٹھسّا اور رکھ رکھاؤ تھا۔ یہ ہاں میں ہاں ملاتیں بھی تو اس انداز سے جیسے بزرگانہ پسندیدگی کا اظہار فرما رہی ہوں۔ شاکرہ کی والدہ پر انہوں نے اپنی اہمیت اور ضرورت ثابت کر دی تھی۔ اور یوں بھی گھر گرہستی اور سماجی اصولوں میں دونوں کا اتفاق تھا۔ شاکرہ کی والدہ "خالہ بی" کی پسند اور ناپسند کا بڑا پاس کرتی تھیں۔ جیسے فنکار دوسرے ہم نظر و ہم ذوق فنکار کی تعریف کو بہت عزیز رکھتا ہے اُسی طرح انہیں "خالہ بی" کا سراہنا بہت مرغوب تھا۔ دوسری باتوں کے علاوہ کنواری لڑکیوں کی تربیت کا معیار قائم کرنے میں بھی "خالہ بی" کا بڑا دخل تھا۔ "خالہ بی" تو سرزنش تک کی قائل تھیں اور اس بلند معیار پر شاکرہ کی والدہ کا پورا اُترنا ضروری۔ لہٰذا جب بھی یہ خالہ بی، گھر میں رونق افروز ہوتیں۔ شاکرہ اپنے کندھوں پر تربیت کا وزن زیادہ محسوس کرتی۔ شاکرہ جب نو[۹] سال کی ہوئی اُسی وقت سے وہ باضابطہ طور پر محض لڑکی سے کنواری لڑکی، شمار کی جانے لگی اور کلفت بنا دی گئی۔ اوامر و نواہی کی بوچھاڑ شروع ہوئی۔ احکام سے ممانعتوں کی فہرست زیادہ طویل ہوتی گئی۔ کنواری لڑکیاں یوں نہیں کرتیں۔ ووں نہیں کرتیں۔ عمر کے ساتھ ساتھ احکام زیادہ مستحکم اور ممانعتیں زیادہ شدید ہو گئیں۔ یہاں تک کہ پندرہ سال کی عمر میں وہ ایک کوٹھڑی میں مقید ہو کر رہ گئی۔

شاکرہ سینا پرونا، کھانا پکانا اور خانہ داری کے دوسرے کام سب سیکھ چکی تھی۔ گھر میں باورچن، خادمائیں، مامائیں موجود تھیں ہی۔ لہٰذا اُسے کچھ خاص کام بھی کرنا نہ ہوتا۔ بس یونہی سیتے پروتے رہنا۔ کبھی کبھار باورچیخانہ میں کوئی اچھی چیز پکانے چلے جانا اور پھر اپنی کوٹھری میں پڑے بہشتی زیور پڑھنا۔

"اِتنی بڑی ہو گئی اور اوڑھنی گلے میں لپیٹے پھرتی ہے۔ اوھر آ۔ اِسے یوں اوڑھتے ہیں۔ کمبخت اتنا بھی سلیقہ نہیں تجھے"

یہ تھے تادیبی الفاظ جو شاکرہ نے آٹھ سال کی عمر میں سُنے۔ اس نے سوچا تھا کہ یہ اوڑھنی اوڑھنے میں مجھ پر نئی پابندی کیوں لگائی جا رہی ہے۔ حکم کو تو وہ بھول گئی لیکن حکم کی تلخی کا ایک مبہم احساس اس کے دل سے ہٹ نہ سکا۔ اس نے کئی بار گھڑکیاں سنیں۔ مگر وہ اوڑھنی کے الجھاوے میں گرفتار ہونے کے لئے تیار نہ تھی۔ ماں اور بڑی آپا کے سامنے تو خیر مگر بچیوں اور چھوٹے بچوں کے ساتھ کھیلتے وقت وہ کچھ انتقاماً بھی اوڑھنی کو اُتار پھینکتی۔ بارہ سال کی عمر میں اُسے خود اوڑھنی سلیقے سے اوڑھنے کی ضرورت نمایاں نظر آنے لگی۔ لیکن حکم کی غیر ہمدردانہ شدت کی خلش اُسے اکثر عدولی حکم پر مجبور کرتی۔ وہ اوڑھنی گلے میں نام کے لئے لپیٹ کر کبھی کبھی گھر کی انگنائی یا کوٹھے کی چھت پر یونہی یا کسی چھوٹے بچے کو پکڑنے کے لئے دوڑ جاتی۔ اُسے کپڑے کی سرسراہٹ اور ہوا کے مَس سے لذّت حاصل ہوتی اور سب سے بڑھ کر نافرمانی کی مسرت۔

"اری کمبخت! بے حیا! اُچھلتی لگاتی پھرتی ہے۔ بے شرم! جوان ہو گئی اور لاج شرم کچھ نہیں۔ جب دیکھو اُڑی ہوئی ہے۔ یہاں آ! شاکرہ! کدکڑے مست لگاتی پھر!" اسی قسم کی آوازوں سے شاکرہ کی پھوٹتی کونپل کو "خوش آمدید" کہی جاتی تھی۔ وہ سوچتی کہ آخر مجھے کیا ہو گیا ہے جو یک بیک اماں جان اور ابا جان مجھ سے ناحق کے خفا رہنے لگے ہیں۔ جب سنو "جوان ہو گئی ہے"۔ "جوان ہو گئی ہے" یہی سُنتے سُنتے تو کان پک گئے۔ جیسے ان باتوں میں میرا قصور رہے۔ شاکرہ اچٹتی ہوئی نظروں سے اپنی پیش نگاہ تبدیلیوں کو دیکھتی اور ایک مسرت آگیں حیرت کے احساس میں بزرگوں کی سختیوں کو بھول سی جاتی۔

"کنواری لڑکیوں کو دبا کے رکھنا چاہیئے۔ جوانی دیوانی......"

ایک روز شاکرہ نے "خالہ بی" کی یہ بولی سُنی۔ اُس روز اُسے ایک نہایت ہی عجیب اور وحشتناک تجربہ ہوا تھا۔ وہ ابتک اُس تجربہ کی گھبراہٹوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ڈری ڈری سہمی ہوئی، پریشان متفکر بدحال۔۔۔ "خالہ بی کی بکواس سے وہ سر سے پاؤں تک سُلگ سی اُٹھی وہ سوچنے لگی۔ لوگوں کو مجھ سے اگر نفرت ہو گئی ہے تو میں بھی سب سے نفرت کروں گی۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا ہے اور یہ لوگ بے جس بنی ہوئی اُلٹا میرے خلاف مشورے کر رہی ہیں۔ میں جوان جو ہوئی تو جیسے بڑا

گناہ کیا جس کی سزا مجھے دی جاتی ہے۔ اے اللہ میں مر ہی کیوں نہیں جاتی۔ اچھا ہے اب اسی طرح جان نکل جائے گی۔"

شاکرہ کبھی سوچتی کہ آخر یہ جوان ہونا کیا بات ہے۔ وہ مبہم مگر حقیقی نئی کیفیتوں کی تہ میں ڈوب کر اپنے آپ سے واقف ہو جانا چاہتی تھی اس کے ذہن و تخیل نیم بیداری کے عالم میں کروٹیں بدل رہے تھے۔ رفتہ رفتہ اس کے احساسات غیر واضح انداز میں انگڑائیاں لینے لگے۔ وہ اپنے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ایک موہوم مگر شیریں سرگوشی کا سراغ پانے لگی تھی۔ اس کی زندگی کا افق وسیع اور رنگین ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ مگر اس وسعت میں ایک کپکپا دینے والا حیرت افزا خوف بھی تھا۔ اور اس رنگینی کے ساتھ بے دردی اور اوامر و نواہی کے سیاہ بادل بھی منڈلاتے نظر آتے تھے۔ وہ ابتک چھوٹے بچے بچیوں کے ساتھ کھیلتی رہی تھی مگر اب وہ نوجوان لڑکیوں کی صحبت کو پسند کرنے لگی۔ شاید وہ ان کے مطالعہ سے اپنا راز معلوم کرنا چاہتی تھی۔ اسکی دو بہنیں ہنوز کنواری تھیں۔ ایک اکیس ۲۱ سال کی اور دوسری انیس کی۔ وہ دونوں ہمیشہ ساتھ رہتیں اور آپس میں گاہے گاہے رازدارانہ طور پر باتیں کرتی پائی جاتیں۔ شاکرہ کو بھی ایک اور جستجو سی رہنے لگی کہ وہ کیا باتیں کرتی ہیں۔ اور ایسی باتیں جو اماں جان اور بڑی آپا کے سامنے آتے ہی رک جاتی ہیں۔ مگر وہ اُن کی صحبت میں بار نہیں پاتی تھی۔ "شاکرہ تو بڑھی کی طرح ہم لوگوں کے ساتھ آکر کیا بیٹھتی ہے؟" غریب شاکرہ عجیب دوراہے پر تھی۔ وہ چھوٹے بچوں کے ساتھ کدکڑے بھی نہیں لگا سکتی تھی اور نوجوان لڑکیاں اُسے پوچھتی نہیں تھیں۔ محلّے کی کنواریاں بھی اس کی بہنوں ہی کے ساتھ جاکر بیٹھتیں اُٹھتیں۔ یہاں تک کہ اسکی ہم عمر لڑکیاں بھی اُسی مجلس کو پسند کرتیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ بھی اُسی محفل کی دلدادہ تھی۔ ہاں شاکرہ کی ایک دو ہم سن لڑکیاں جب اُس بزم سے نکالی جاتیں تو پھر شاکرہ کے ساتھ باتیں کرنے آجاتیں۔ مگر یہ سب بھی تو ویسی ہی بھولی بھالی تھیں۔ تیرہ چودہ سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ بہرکیف شاکرہ کا جذبۂ جستجو تشنہ ہی رہا۔ اس کے دل میں ننھے ننھے سوتے پھوٹ رہے تھے مگر وہ ماحول کی ناہمدردی کے سبب سُکڑ سکڑ کر فنا ہو جاتے تھے۔ اس کے جی میں صدہا سوالات پیدا ہوتے اور اس کا جواب بس اس طرح ملتا ——— "کنواری لڑکیوں کو یہ نہیں بولنا چاہیئے۔ وہ نہیں کہنا چاہیئے۔ ٹپ ٹپ بالوں میں دخل دینا برا ہے۔ بال یوں نہ سنوارو۔ نظریں یوں نہ اُٹھاؤ۔ اس طرح چلنا معیوب ہے۔ اس طرح ہنسنا بے شرمی ہے۔ ایسے کپڑے دہنو یہ مت کماؤ۔ وہاں مت بیٹھو۔ اُدھر نہیں جاؤ!" شاکرہ سوچتی آخر وہ کیا کرے بس اسی طرح سوچتے رہنے سے اس کی زندگی ہی محض سوچ ہو کر رہ گئی۔ وہ اپنے من کی کٹیا کے اندر تنہا عالمِ خیال میں زندگی بسر کر رہی تھی۔

جب شاکرہ چودہ سال کی ہوئی تو ایک ہی ساتھ اُسکی دونوں کنواری بہنوں کی شادیاں رچائی گئیں۔ ان دنوں خالہ بی اتو مستقلاً شادی کے گھر ہی آکر رہ گئی تھیں۔ ان کے حاضر و ناظر ہوئے بغیر کوئی کاج بھلا کیسے انجام پاسکتا تھا۔ مہمان بی بیاں بھی آئی ہوئی تھیں۔ لہٰذا شاکرہ پر سخت پردے کے احکام نافذ کر دئے گئے تھے۔ دلہنوں کے مانجا بیٹھنے والے کمرے میں بھی اُسے جانے کی اجازت نہ تھی۔ اوّل تو رشتہ دار بی بیاں وہاں دلہنوں کو دیکھنے آتی رہتی تھیں اور پھر دلہنوں کی سکھیاں رنگین محفل جمائے میٹھی چھیڑ چھاڑ کرتی رہتی تھیں۔ برات کے دن قریب آتے گئے اور رنگ رلیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہر طرف گہما گہمی اور کام کاج کے ساتھ بے کام کے کام بھی ہوتے رہتے تھے۔ راتوں کو محلے کی نوجوان لڑکیاں آجاتیں تو شاکرہ کا دل خوب بہل جاتا۔ مگر دن کو وہ تنہائی اور قید سے اکتائی اکتائی رہتی۔ گھر میں ہر سو چہل پہل مگر اس کے لئے گھر بیابان۔ ان دنوں شاکرہ پر کچھ راز منکشف ہوئے۔ کنوار پنے اور جوانی کے راز۔ شادی کے گھر میں عمر رسیدہ عورتیں بھی ماضی کی رنگینیاں بیان کرکے کچھ دیر کے لئے سرشار ہو لیتی ہیں اور نئی شادی شدہ لڑکیاں کنواریوں کو چھیڑ چھیڑ کر راہ و رسمِ منزل سے آگاہ کر جاتی ہیں۔ شاکرہ پر بھی رنگین انکشافات ہوئے مگر غیر واضح طور پر۔ اس کے تخیل کو ادھ مہمیز لگ گئی۔ وہ دن بھر کوٹھری میں بڑی نئی باتوں کو سوچتی رہتی۔ وہ علم اور لاعلمی کی بھول بھلیاں میں الجھی رہتی۔ اس کا جذبۂ تجسس اُسے بیقرار رکھتا اور سوچتے سوچتے وہ تھک کر چڑچڑا سی جاتی۔ اس کا اپنا جسم اس کے لئے باعثِ حیرت تھا۔ اور روح کی گہرائیاں اُس سے زیادہ حیرت فزا۔ خون کی روانی اور مبہم

تمناؤں کی موجیں کبھی اسے خواب آگیں رنگین جزیروں میں لے جاتیں۔ اور کبھی سرد شعار حقیقتوں کی طرف مائل کر دیتیں۔ وہ تخیل کے طیارے پر پرواز کرتی، تمناؤں اور حسرتوں کی کشتی پر ڈگمگاتی اور گاہ تصور کے بتخانے تعمیر کر کے اپنے نوجوان بیدار ہوتے ہوئے حواس کو انجان تجربوں سے درد خیز لذت کے حصول کا موقعہ دیتی۔ اس کے دل و دماغ اور ذہن و روح ایک علیحدہ دنیا بناتے اور بگاڑتے رہتے تھے۔ رات آتی تو شادی کی فضا سمند ناز پر اک اور تازیانے کا کام کر جاتی۔ شاکرہ رات رات بھر جاگتی رہتی۔ کروٹوں پر کروٹیں بدلتی اور اٹھ اٹھ کر صراحی سے پانی پیتی تھی۔

آخرکار وہ دن کی نشتر بدست تنہائیوں سے گھبرا اٹھی تھی۔ اس نے ایک روز ناصر کی منت سماجت کی تاکہ وہ آہستہ بھائی جان کی کچھ کتابیں پڑھنے کو لا دے۔ ناصر رشتے کا ایک غریب لڑکا تھا جو ملازم نما طالب العلم کی طرح شاکرہ کے گھر رہتا تھا۔ بیوقوف، خوف زدہ، سمٹا سمٹایا سا بارہ سال کا کم رو لڑکا۔ چھوٹے چھوٹے برابر ترشے ہوئے سر کے بال، اونچی مہری کا ٹنگ پاجامہ، تحریہ دار میلی سی قمیص، پرانی سلیپرین، جھکی ہوئی گردن اور بنے ہوئے مسکین سے تیور۔ یہ اس کی خصوصیات تھیں۔ شاکرہ ہمیشہ ناصر سے نفرت کرتی رہی تھی مگر اب ضرورت کے وقت وہ اس کی خوشامد کرنے پر مجبور تھی کیونکہ بھائی جان کی میز پر یا الماری میں سے کتابیں اور پرچے نکال لانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ ناصر اس کی امداد پر راضی ہو گیا تھا۔

شادی کے ہنگامے ختم ہوئے اور شاکرہ اس دور سے ایک نئے جاگے ہوئے احساس کے ساتھ نکلی۔ ادھوری واقفیت، رنگین ابہام اور ابہام کی آرزو انگیزی۔ مگر وہ تکمیل کے لئے کڑھتی ہی رہی اور نوجوان زندگی کے قدم آہستہ مگر یقینی طور پر اپنے جدید ممکنات اور نئے مطالبات کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔

بہنوں کی شادی ہو جانے کے بعد اب وہ بھی اپنی نو رسیدہ برتری کی دھونس شاکرہ پر جمانے لگیں۔ وہ شادی شدہ ہو گئی تھیں اور یہ [illegible] اعزاز و افتخار تھا جو انہیں اکساتا رہتا تھا۔ وہ خالہ بی، اماں جان اور [illegible] جان سے بھی زیادہ اس کے کنوارپنے کی داروغہ بن گئی تھیں۔ شاکرہ [illegible]یل آباد تھا مگر اس کی دنیا ویران تھی۔ اسے تنہائی، بیگانگی، اور [illegible]سی کا تلخ احساس ہوتا رہتا تھا۔ وہ اپنا غصہ گھر کی نوکرانیوں پر اتارتی۔ ذری ذری بات پر بگڑ جاتی، ناک بھوں چڑھاتی اور اکثر برس بھی پڑتی۔ بیلن چوکی سے دور کیوں ہے۔ گھڑوں میں نہانے کا پانی دیر میں کیوں بھرا گیا۔ صابن دانی کدھر سرکا دی گئی۔ یعنی کیا ہوا بس اتنی سی بات اس کے مزاج کو برہم کر دینے کے لئے کافی ہوتی اور اس کے نتیجے میں اسے اکثر سخت سست سننا پڑتا۔ نئی شادی شدہ بہنیں بول اٹھتیں توبہ کیسی بدمزاج، بدزبان۔ دماغ ہر وقت عرش پر رہتا ہے۔ دیکھتی ہیں اماں جان شاکرہ کی بددماغیاں؟ کنواری لڑکی اور ایسی بیباک، شوخ چشم! شاکرہ دل میں کہتی۔ اونہہ کل کو خود بھی تو کنواریاں تھیں۔ اور بدمزاجی میں گھر بھر میں مشہور۔ اور اب تو دماغ ملتے ہی نہیں چلی ہیں مجھ پر دھونس جمانے۔ گھر کی نوکرانیاں بھی شاکرہ سے منہ پھلائے رہتی تھیں۔ شادی شدہ بہنیں اگر ڈانٹتی تھیں تو پیسے اور کپڑے بھی دیتی تھیں اور شاکرہ محض ایک کنواری لڑکی تھی۔ بس ایک بیچارہ ناصر تھا۔ جو شاکرہ کی نرم و گرم سن لیتا تھا اور ہر حال میں شاکرہ سے مانوس اور اس کا طرفدار رہتا تھا۔ مگر اس کی ہستی ہی کیا۔ ایک ہیچ سا غریب لڑکا۔

بہرحال شاکرہ رفتہ رفتہ ناصر کو اپنا بہی خواہ سمجھنے لگی۔ شاکرہ نے ایک بلی اور چند خرگوش پال رکھے تھے۔ ان کی دیکھ بھال بھی ناصر کے سپرد تھی۔ بلی خرگوش اور ناصر شاکرہ کی جذباتی زندگی میں دن بہ دن زیادہ اہمیت حاصل کرنے لگے۔ خرگوش سب سے زیادہ کیونکہ وہ کھلنڈرے تھے اور چونچال۔ اس کے بعد بلی کہ وہ اس کے ساتھ مل کر خرخر سوتی تھی اور پھر ناصر۔ کبھی کبھی شاکرہ چاہتی کہ ناصر بھی شوخ چنچل ہوتا اور اچھی اچھی باتیں کرتا مگر وہ تو ایک بیوقوف سا مضمحل، کم گو لڑکا تھا۔ کاش اس کی آنکھوں میں کچھ زندگی کے آثار ہوتے! جیسے خرگوش کی سرخ یا بلی کی ہوشیار چمکتی ہوئی کرنجی آنکھوں میں تھے۔ خرگوش، بلی اور ناصر کے علاوہ بڑی آپا کا دو سالہ بچہ بھی شاکرہ کی توجہ کا ایک نقطہ تھا۔ وہ اسے گود میں لے کر خوب پیار کرتی۔ اس کے بوسے لیتی اور اسے خوب زور سے اپنی آغوش میں کھینچتی۔ اسے اس عمل سے بڑی تسکین ہوتی۔ بچے کو آغوش میں چمٹاتے چمٹاتے وہ تیزی سے دوڑ جاتی اور پھر بچے کو ہوا میں اچھالتی۔ کبھی یک بیک اس کا جی چاہتا کہ ناصر اس کی گود سے آ کر بچے کو لے لے۔ وہ ذرا شرما جاتی اور پھر بچے کو زور سے سینے سے چمٹا کر بھینچتی اور چٹاخ چٹاخ اس کے

بوسے لینے لگتی۔ اس نے دو تین بار ناصر کو بلا کر بچے کو اُسے دیا بھی مگر ناصر تو ڈرا ڈرا، سہما سہما آ کر حکم کی تعمیل کر جاتا اور بس۔

* * *

تو ہاں سائبان میں شاکرہ کی اماں جان اور خالہ بی بیٹھی ہوئی مسلسل باتیں کر رہی تھیں۔ شاکرہ بیٹھی بیٹھی اُٹھ کھڑی ہوئی اپنی کوٹھری سے نکل کر یونہی سارے گھر میں گشت کر آئی۔ بڑی آپا سسرال چلی گئی تھیں۔ نئی شادی شدہ بہنوں میں سے ایک اپنے میاں کو خط لکھ رہی تھیں۔ اُن کے کمرے میں جو شاکرہ جا نکلی تو اُنہوں نے ناز و فخر و شرم کی آمیزش کے ساتھ چیں بہ جبیں ہو کر اُسے ایک ہلکی سی جھڑکی دی اور جھٹ سے خط کو چھپا لیا۔ دوسری بہن غسل کے تہیہ میں اِدھر اُدھر چپڑ چپڑ کرتی پھر رہی تھیں۔ شاکرہ اُن سے بچتی ہوئی پھر اپنی کوٹھری میں واپس آ گئی۔ اور آ کر دھب سے پلنگ پر بیزاری کے ساتھ پڑ رہی۔ تھوڑی دیر پڑی رہنے کے بعد وہ اُٹھی اور آئینہ میں اپنا منہ دیر تک دیکھتی رہی۔ اُس نے ہر زاویے سے اپنے چہرے کا جائزہ لیا۔ اُسے اپنے پر کچھ اعتماد ہوا۔ وہ اچھی خاصی صورت رکھتی ہے۔ اس کی سہیلیاں بھی تو یہی کہتی ہیں۔ اُس نے پھر اپنے جوڑے کو کھول کر آئینہ میں دیکھا۔ اس کے چہرے پر مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ اپنے کھلے ہوئے جوڑے کو سنوارنے لگی۔ اُسے اپنی سیدھی مانگ اور لپی ہوئی پٹی دیکھ کر غصہ آ گیا۔ تنویر و پروین کیسی خوبصورت کج مانگ نکالتی ہیں۔ اور وہ ہلکی پھلکی خم بہ خم ایک طرف کو جھکی ہوئی حسین سی پٹی۔ اُس نے آئینہ میں اپنا چہرہ پھر غور سے دیکھا۔ ایسی بد وضع مانگ اور ایسی فرسودہ انداز کی پٹی نے اُس کی شکل کو کیسا غارت کیا ہے۔ وہ تو سچ مچ بدصورت ہی دکھتی ہے۔ اندر سے ایک آواز اُٹھی۔ نہیں نہیں تو حسین ہے لیکن اس پرانے فیشن نے تجھے بدنما کر دیا ہے۔ شاکرہ کا جی چاہا کہ وہ ساری پابندیوں کی زنجیریں توڑ کر رکھ دے۔ پھر ایک اور خواہش اُبھری۔ کوئی آ کر اُسے دیکھتا اور اُسے پُر زور طریقے پر یقین دلاتا: "شاکرہ تم بے حد حسین ہو" مگر زنجیریں شکستنی نہ تھیں اور کوئی اس کے حُسن کی ستائش کرنے والا بھی نہ تھا۔ وہ نا اُمیدی اور بے اعتمادی کی چوٹ کھا کر رونے لگی اُس نے آئینہ جھٹک کر ہٹا دیا اور پلنگ پر لیٹ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ وہ کچھ دیر اسی طرح سسکیاں بھرتی رہی۔

"ناصر! ناصر! ادھر آ ناصر۔ ذرا بازار سے پان لا دے!"

یہ اس کی ماں کی پکار تھی۔ شاکرہ اُٹھ بیٹھی اور بستر کے نیچے سے ایک پڑا ہوا پرچہ نکال کر یونہی ورق گردانی کرنے لگی۔ ناصر اِدھر سے گزرا۔ شاکرہ نے اشارے سے اُسے اپنی کوٹھری میں بلایا۔ اب ناصر تیرہ سال کا ہو گیا تھا۔ اُس سے ملنے میں تھوڑی سی پابندی لگا دی گئی تھی۔ یعنی دونوں تنہائی میں ایک جگہ نہ پائے جائیں۔ بس اتنا ورنہ ناصر تو ایک بدھو قسم کا کوتاہ قد سرد سا لڑکا تھا۔ ناصر اِدھر اُدھر دیکھتا، ڈرتا ہوا شاکرہ کی کوٹھری میں دبے پاؤں آیا۔ شاکرہ نے کہا: "ناصر! واپسی میں بھائی جان کی الماری میں سے کوئی اچھی سی کتاب لیتے آنا طبیعت بہت گھبرا رہی ہے۔" ناصر "اچھا" کہتا ہوا چلا گیا۔ شاکرہ اپنے بال سنوارنے لگی۔

شاکرہ نے پروین و تنویر کی طرح بال سجائے مگر پن کے بغیر وہ جمتے نہ تھے۔ بڑی کوشش سے کچھ بات بنی۔ وہ دیر تک طرح طرح سے آئینہ میں اپنی نئی سجاوٹ کو دیکھتی رہی۔ اس کی کوٹھری کی طرف کسی کے آنے کی چاپ سنائی دی۔ اُس نے ڈر کر جھٹ ٹیڑھی مانگ کو مٹا دیا۔ مگر وہ یونہی سی آواز تھی۔ کوئی آ نہیں رہا تھا۔ اُس نے بالوں کو پھر جدید فیشن سے بنایا اور خود کو آئینہ میں دیکھ کر بہت مسرور ہوئی۔ وہ اُٹھی اور اُٹھ کر اس نے قلمدان سے قلم نکالا، اُلٹی جانب سے اُسے دوات میں ڈبو کر پیشانی کے وسط میں سیاہ بندی لگائی۔ اور آئینہ کے سامنے جھوم سی گئی۔ اچانک اُس کے دماغ میں ایک خیال آیا۔ وہ زیرِ لب مسکرا اُٹھی۔ اُس نے دوسرے قلم کو سُرخ دوات میں ڈبویا اور اُسے اپنے تبسم ریز لب پر مل لیا۔ اس کے لب انار کلی کی طرح مہک اُٹھے۔ اس کے دل میں مسرت کی موجیں مچلنے لگیں اور اس کی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے سرمستی کے پھول برسنے لگے وہ اپنی شبیہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔ اس کا دل چاہا کہ کاش یہ آئینہ ایک بولتا ہوا جادو کا آئینہ ہوتا اس کے حُسن کی تعریفیں کرتا اور شاکرہ ایک وجد کے عالم میں اُسے پیار کر لیتی، اپنے سینے سے لگا لیتی اور اُس سے بہت ڈھیر سی اچھی اچھی باتیں کرتی رہتی۔

"شاکرہ باجی! شاکرہ باجی ——! فرحت بھائی اپنے پرچے تلاش کر رہے ہیں۔ جلد لائیے نا —— جلد! پرچے!"

ناصر کی گھبراتی اور گھٹتی ہوئی آواز نے شاکرہ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا

"...شرما گئی مگر اُسے غیر متوقع خوشی بھی حاصل ہوئی۔ ناصر نے اُس کا جلوہ تازہ دیکھا۔ وہ مبہوت ہو جائیگا۔" اور فرحت شاکرہ باجی اتنی حسین ہیں۔!" اور شاید شعلہ حسن اُس کے ٹھنڈے منجمد سے دل اور مرجھائی ہوئی آنکھوں میں زندگی رواں دواں زندگی کے چراغ جلا دے۔

"کتاب لائے ناصر؟" شاکرہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں!— فرحت بھائی۔ پرچے! باجی پرچے!" ناصر نے جھلاتے ہوئے جواب دیا۔

"میں نہیں دیتی پرچے۔ تم کتاب نہیں لائے:" شاکرہ نے پرچے نکالتے ہوئے شرارت سے ناصر کو دیکھا اور بے ساختہ ہنس دی۔

"باجی! خدا کے لئے!"

"لے لو نا اگر ہمت ہے!۔ تم کتاب کیوں نہیں لائے؟"

ناصر پرچے لینے کے لئے آگے بڑھا۔ شاکرہ نے پرچوں کو پیچھے ہٹا لیا۔ ناصر پرچوں پر جھپٹا۔ شاکرہ نے انہیں اپنی آغوش میں دبا لیا۔

"میں نہیں دوں گی۔ میں نہیں دوں گی! لو تو جانوں!" شاکرہ نے ہنستے ہوئے ناصر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ گھبرایا ہوا ناصر جلد پرچے حاصل کرنا چاہتا تھا ورنہ فرحت بھائی اس کی ہڈیاں توڑ دیں گے۔ شاکرہ کھلکھلا کر ہنسی اور ناصر کے ہاتھ کو اُس نے پرچوں سمیت اپنے قریب تر چمٹا لیا۔ پرچے کشاکش میں نیچے گر پڑے۔ مگر ناصر کا ہاتھ ہنوز گرفت میں تھا۔ اُس نے ایسا محسوس کیا جیسے وہ خرگوش کے چھوٹے بچوں کو مس کر رہا ہے۔

"شاکرہ! شاکرہ! یہاں آؤ!"

شاکرہ اپنی اماں جان کی آواز سُن سیدھے سائبان کی طرف بھاگی۔ پھر اسے اپنی ہیئت کا خیال آ گیا۔ کوٹھڑی میں واپس آ کر اُس نے اپنے کو درست کیا۔ تب اماں جان کے پاس گئی۔

"کیوں کیا کر رہی تھی شاکرہ؟ کنواری لڑکیاں بھی بھلا اس طرح ہنستی ہیں؟"

"میں راہِ نجات" پڑھ رہی تھی اماں جان۔ خرگوش کے بچے میز پہ چڑھنے کی کوشش میں گر گر پڑتے تھے۔ مجھے ہنسی آ گئی۔"

"بھلا یہ بھی کوئی ہنسنے کی بات ہے۔ کنواری لڑکیوں کو شرم و حیا چاہیئے اچھا ذرا کی ذرا اپنی خالہ بی کے لئے فرنی تو پکا لو کیوڑا اور پستے کی ہوائیاں دے دینا۔ دو انڈے بھی تل لینا نعمت خانہ میں حلوا ہے۔ وہ بھی لیتی آنا۔ جاؤ سلیقے سے ناشتہ کا سامان کرو —— جلد —— ہاں جاؤ!"

"جی اچھا اماں جان!" کہتی ہوئی شاکرہ باورچی خانہ کو نہایت ہی مؤدبانہ طور پر چل دی۔ "خالہ بی" کی آواز آئی ——

"بہن! ماشاء اللہ تمہاری لڑکیاں البتہ باحیا باتمیز ہیں۔"

کرشن چندر

ایک سفر

لاہور کی کل ہند نمائش دیکھ کر وہ اب کلکتہ جا رہا تھا۔ تیسرے درجے میں جہاں اُسے جگہ ملی، بہت بھیڑ تھی۔ جس سے دم گھٹ رہا تھا۔ سہ پہر کے سورج کی تیز کرنیں اُس کے دل و دماغ کو چھلنی کر رہی تھیں۔ تار کے کھمبے۔ شیشم۔ بیری اور نیم کے روکھے درخت۔ خاموشی سے گزرے جا رہے تھے۔ کہیں کہیں گندے جوہڑوں میں بھینسیں لیٹی ہوئی تھیں۔ اور کہیں کنول کے کملائے ہوئے پھول سرنگوں تھے۔ انجن کی سیاہ خاک میلوں تک ایک گدلے بادل کی طرح گاڑی کے اوپر مسلط ہو رہی تھی۔ لاہور کی نمائش میں اُس نے سُرخ رنگ کی خاک پھانکی تھی۔ جو پرانے قلعے کی اینٹوں کو کوٹ کر نمائش کے میدان میں بچھائی گئی تھی۔ نمائش کے باہر زرد رنگ کی خاک اڑ رہی تھی۔ جس میں گھوڑوں کی لید اور بیلوں کے پیشاب کی بو تر بو شامل تھی۔ کراچی سے لاہور آتے ہوئے اُس نے رنگا رنگ ریگ پھانکی تھی۔ کالی۔ پیلی۔ نارنجی۔ اودی۔ یہ خاک اُسکے وطن کی تھی۔ اسلئے اُسے بہت عزیز تھی۔ وہ اسے اکثر پھانکا کرتا تھا۔ جو امیر لوگ تھے۔ وہ اس خاک سے بچکر چلتے تھے۔ موٹروں میں۔ فٹن میں فرسٹ کلاس کے ڈبے میں۔ ہوائی جہاز میں۔ لیکن وہ ان امیر لوگوں کی طرح بے غیرت نہ تھا۔ اُسے اپنے وطن کی مٹی سے محبت تھی۔ وہ اسکے لئے اپنی جان تک دینے کو آمادہ تھا۔ وہ آمادہ ہوتا نہ ہوتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ یہ خاک ضرور اُس کی جان لینے پر تلی ہوئی تھی۔ یہی خاک پھانکتے پھانکتے اب اُسے اکثر کھانسی ہوتی تھی۔ نزلہ۔ کھانسی اور بخار ایک دائرے میں تین نشان تھے۔ جو باری باری آتے تھے۔ اور اُن کے بیچ میں؟ بس وہی خاک؟

اُس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ سامنے کی نشست پر ایک موٹا سا بنیا اپنی دھوتی میں اپنی بدصورت ٹانگوں کی نمائش کرتا ہوا اونگھ رہا تھا۔ اُسکے گھٹے ہوئے سر پر اُس کی چوٹی کے بال اس طرح کھڑے تھے۔ جیسے فیوجی یاما پہاڑ کی چوٹی۔ اُس نے سوچا اُسے اس وقت فیوجی یاما کی چوٹی کا خیال کیوں آیا۔ جاپان کا سب سے اونچا آتش فشاں پہاڑ۔ اُس نے سوچا ممکن ہے بنئے کے سر میں بھی آتش گیر لاوا بھرا ہوا ہے۔ . . . یہ بات ہے۔ اب اُسکا ذہن صاف ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ بنئے کا سر فیوجی یاما پہاڑ کی چوٹی کی طرح آتش فشاں بنجائے۔ پھٹ جائے۔ اور پھٹ کر پھیلا لاوے کی طرح بہنے لگے۔ اُسے بنیوں سے اس قدر نفرت کیوں ہے؟ یکایک بنئے نے اونگھنا چھوڑ دیا۔ اور وہ ایک لمبی سی جمائی لے کر ڈکارنے لگا۔ دو تین ڈکاروں کے بعد اُس نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ پھر اپنے سر پر اور فیوجی یاما پہاڑ کی چوٹی ہموار ہو گئی۔ اُسے یہ دیکھ کر بہت رنج ہوا۔ اُس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ یکایک بنئے نے نشست کے نیچے ہاتھ بڑھا کر پانی سے بھری ہوئی ایک خوشنما صراحی کو نکالا۔ صراحی کے منہ میں لکڑی کی ایک کھپچی کپڑے میں لپٹی ہوئی۔ ایک مضبوط ڈاٹ کی طرح لگی تھی۔ بنئے نے پانی ایک گلاس میں انڈیل لیا۔ اور غٹا غٹ پینے لگا۔ اُس کا حلق خشک تھا۔ لیکن اُس نے بنئے سے پانی مانگنا دشوار سمجھا۔ اُس نے سوچا۔ شاید بنیا مفت پانی نہ پلائے۔ سود در سود لگائے۔ اور آخر پانی کے ایک گلاس کے عوض اُسے اپنا سوٹ کیس، بستر اور کوٹ بھی نیلام کرنا پڑیں۔ اُسے ایسے کئی واقعات معلوم تھے۔ کہ جب بنئے نے کسی کسان کو ایک روپیہ ادھار دے کر بیس سال کے بعد سود در سود لگاتے ہوئے اُس کی زمین۔ گھر۔ مال۔ مویشی سب کچھ ہتیا لیا تھا۔ بنئے نے گلاس خالی کر دیا۔ بنئے کی نشست سے کچھ فاصلے پر ایک دُبلی پتلی عورت سر جھکائے اداس بیٹھی تھی۔ اُس کے کپڑے گندے

اور بوسیدہ تھے اور اُس کا چہرہ بھی اُسکے کپڑوں کی طرح تھا۔ اُس کی گود میں ایک بچہ تھا۔ یہ بچہ بنئے کو پانی پیتے دیکھ کر مچل گیا۔ وہ بہت دیر سے پانی۔ پانی، کہہ رہا تھا۔ بنئے نے اپنی میلی آنکھوں کے کونوں سے اُس عورت اور بچے کی طرف دیکھا۔ اور پھر نہایت احتیاط سے لکڑی کی ٹیپی صراحی کے منہ پر جما دی۔ اور اطمینان سے آلتی پالتی مار کر سیٹ پر بیٹھ کر اونگھنے لگا۔

گاڑی کے پہیئے ایک خاص تال پر حرکت کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ میدانوں سے پرے اُفق کے قریب۔ درختوں کے دھندلے سائے ایک دائرے میں حرکت کر رہے تھے۔ یکایک وہ کھانسنے لگا لمبی سی۔ نزلہ۔ بخار۔ اُس نے سوچا زمین گول ہے۔ ورنہ یہ دھندلے سائے ایک دائرے میں حرکت نہ کرتے۔ یہ بنیا آلتی پالتی مار کر یوں نہ اونگھ سکتا۔ اس بچے کے جسم استخواں سے اسکے ماں باپ کی فاقہ زدہ زندگیاں یوں بے بسی سے نہ جھانکتیں۔ ہائے وہ نیوجی یا ماما پہاڑ کی چوٹی! وہ بچہ ابھی تک چلا رہا تھا۔ پانی۔ پانی۔ اُسے بہت غصہ آیا۔ اُس نے چاہا کہ وہ بچے کے رخساروں پر ایک زناٹے کا چانٹا رسید کرے۔ اور کہے۔ صراحی چپ۔ پانی۔ پانی۔ کی کیا رٹ لگا رکھی ہے یوں کہو کہ زمین گول ہے۔ زمین گول ہے پانی فضول ہے۔ بیٹیا مجہول ہے۔ صراحی پر لکڑی کی ٹیپی جمی ہے۔ گاڑی چل رہی ہے زمین گول ہے۔ گاڑی چل رہی ہے۔ نہیں گاڑی دھیمی ہو رہی تھی گاڑی کھڑی ہو رہی تھی۔ گاڑی کھڑی ہو گئی۔ یہ سندیلے کا سٹیشن تھا۔ اُس نے گاڑی سے اتر کر پانی پیا۔ اور انجن کی سیاہ خاک کو جو اُس کے تالو سے لگی تھی تر کرکے اپنے معدے میں اُتار لیا۔ پتھر کے کوئلے کی خاک اُس نے سوچا، بہت مفید ہوتی ہے۔ اس سے لوہے کے بڑے بڑے انجن چلتے ہیں۔ انسانی انجن کے لئے بھی یہ یقیناً مفید ہوگی۔ ضرور ہوگی۔ اُس نے ایک اور گھونٹ نیچے اتار کر سوچا پھر اُسے اُس چھوٹے سے بچے کا خیال آیا۔ اور وہ گلاس میں پانی بھر کر بچے کے لئے لے گیا۔ بچہ پانی پینے لگا۔ لیکن اُس کی ماں کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ نہ پیدا ہو سکی۔ یہ عورت اُس نے سوچا، مسکرانا نہیں جانتی۔ نہ سہی، ہم سندیلے کے لڈو کھائینگے۔ نہ مسکرائے ہم تو سندیلے کے لڈو کھائینگے۔ سندیلے کے لڈو اُس نے سُن رکھا تھا۔ بہت میٹھے ہوتے ہیں۔ میٹھے اور لذیذ، اُس نے لڈوؤں سے بھری ہوئی ایک چھوٹی سی ٹوکری آٹھ آنے میں خرید لی۔ اس ٹوکری پر قوس و قزح کا غذ منڈھے ہوئے تھے۔ اُس نے بچے کے ہاتھ میں ایک لڈو دیا — یقیناً یہ عورت مسکرانا نہیں جانتی۔ یا شاید برسوں سے اس نے مسکرانا چھوڑ دیا ہے۔ یا وہ اس کی مسکراہٹ کو نہیں دیکھ سکتا۔ جو اسکے میلے چہرے کی نچلی گندی تہوں کے نیچے ہی دب کر رہ جاتی ہے۔ اور اُبھرنے نہیں پاتی۔ اُس نے سوچا اس عورت کو صابن کی ٹکیہ کی ضرورت ہے۔ اگلے اسٹیشن پر وہ اسے صابن کی ایک ٹکیہ خرید دیگا۔

اگلے اسٹیشن پر وہ صابن خریدنا بالکل ہی بھول گیا۔ کیونکہ اب ایک نوجوان طوائف اس کی نشست کے قریب آ بیٹھی۔ اور اُسکے صاف ستھرے کپڑے اور اُسکے جلد کے نکھرے ہوئے رنگ کو دیکھ کر اُسے صابن خریدنا بے معنی اور بے کار سا معلوم ہوا۔ اس طوائف کے ساتھ ایک دوہرے بدن والا ہٹا کٹا مشٹنڈا تھا۔ رنگ مشکی چہرے پر بڑے بڑے گل مچھے۔ اور گردن اور ٹھوڑی کے درمیان ایک گہرے زخم کا نشان۔ اُسکے جسم میں ایک پھریری سی آئی۔ اور اُس نے گردن موڑ کر طوائف کی طرف دیکھا۔ سچ مچ جوان تھی۔ چہرہ گندمی، جلد بے داغ، لب رسیلے اور جذباتی۔ آنکھیں گہری سیاہ۔ طوائف اُس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اور اُس نے اُسے کنکھیوں سے دیکھنا چھوڑ دیا۔ مشکی رنگ کے آدمی نے کھانس کر ایک دوبار اپنے گل مچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ اور پھر اپنی نشست پر لیٹ گیا۔ اور ٹانگیں اوپر کرکے کھڑکی سے لگا دیں۔ اُس کا پیٹ کسی حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح اوپر کو اُٹھا ہوا تھا۔ اور چند منٹوں ہی میں اس میں خراٹوں کی لرزشیں پیدا ہونے لگیں۔ گل مچھوں کے بال اس طرح حرکت کر رہے تھے جیسے مقناطیس کی لہروں سے لوہے چون کے تار کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سورج افقی لکیر پر جھک رہا تھا۔ اور بنیا اونگھتا اونگھتا جاگ گیا تھا اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے طوائف کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جس نے

اب اپنا سر اک عجیب شان دلربائی سے کھڑکی کے ساتھ لگا دیا تھا اور ایک چوکھٹے میں جڑی ہوئی تصویر کی طرح دکھائی دے رہی تھی جیسے آرٹ گیلری میں نمائش کے لئے ٹانک دیا گیا ہو۔ اُس نے سوچا کہ وہ اس کی ساڑھی کے پلو سے ایک فیتہ ٹانک دے۔ اور فیتے کے سرے پر ایک ٹکٹ باندھ کر لکھ دے۔ "مصوّر کی محبوبہ"۔ قیمت پانچ سو روپیہ ــــ طوائف کے رسیلے لب کھل گئے۔ اور سپید دانتوں کی ایک موہوم سی لڑی نظر آنے لگی۔ بنیا بیٹھے بیٹھے نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور وہ آہستہ سے اپنی ران کھجانے لگا۔ اُسکے دل میں آیا۔ کہ وہ پانی سے بھری ہوئی صراحی بنئے کے سر پر توڑ دے اُس نے سوچا۔ یہ بنیا ہے۔ یہ ہر روز مندر میں جاتا ہے۔ عورت کو وہ بوجھ سمجھتا ہے۔ اس کے لئے گھر میں ایک الگ چار دیواری گھر سے باہر ایک الگ سکول، گاڑی میں الگ ڈبے بناتا ہے۔ لیکن جب کسی خوبصورت عورت کو دیکھتا ہے۔ تو بے اختیار ٹانگ کھجانے لگتا ہے خوبصورتی اور خارش ان دونوں میں شاید کوئی لاشعوری تعلق ہے۔ خوبصورتی اور خارش۔ اُس نے سوچا۔ کہ اب وہ اپنی زندگی ایک تصویر بنانے میں صرف کر دیگا جس کا عنوان ہوگا، خوبصورتی اور خارش، پھر اُسے خیال آیا کہ اس تصویر کی نمائش ہندوستان میں قانوناً ممنوع قرار دی جائیگی۔ بہتر یہی ہے۔ کہ وہ اپنے وطن کی خاک پھانکے۔ اور اس گاڑی میں گھٹ کر مر جائے۔ یہ خیال کرتے ہی وہ اپنی بے وقوفی پر مسکرانے لگا۔

اُسے مسکراتے دیکھ کر طوائف بھی مسکرائی۔ غالباً اب وہ اپنی خوبصورتی پر مسکرا رہی تھی۔ اور نہ بنئے کی خارش پر۔ یہ دونوں چیزیں گویا اب اُس کی زندگی کا جزو لاینفک بن چکی تھیں۔ یہ مسکراہٹ گویا کیسی عادی شکاری کی نگاہ تھی۔ اور اُس نے سوچا کہ کیوں نہ وہ بھی چند لمحوں کے لئے صید ہوس بن جائے۔ سورج افقی لکیر پہ جھک کر غروب ہو گیا تھا۔ لیکن گھومتے ہوئے کھیت پانی کے جوہڑ درختوں کے جھنڈ اور اُن کے گھنے موہوم سے سائے ابھی تک اُسکے سنہری جال میں گرفتار تھے۔ اُس نے طوائف کے سنہری بالوں کی طرف دیکھا اور اُس نے سوچا چند لمحوں کے لئے مجھے بھی اس سنہری جال کی پناہ لے لینی چاہیئے پھر شام آجائیگی۔ سیاہی اور . . . طوائف کی گرم گرم سانس۔ اور وہ اُسکے قریب سرک گیا۔

پروانے نے پوچھا۔ تم کہاں جا رہی ہو۔

مکڑی نے جواب دیا۔ "یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ میں وہیں جمی بیٹھی ہوں۔ صرف تم میرے قریب آ رہے ہو"

اُس نے کہا "تم بہت خوبصورت ہو"

طوائف نے کہا۔ "کھڑکی میں سے باہر سر نکال کر بات کرو۔ یہاں ہر شخص ہماری باتیں سُننا چاہتا ہے"

اُن دونوں نے کھڑکیوں میں سے سر باہر نکال لئے۔ اُس نے طوائف کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور اُس کی نیلم کی انگوٹھی کو ٹٹولنے لگا۔

"یہ انگوٹھی مجھے فرخ آباد کے نواب نے انعام میں دی تھی"

"اب تم کہاں جا رہی ہو۔ واپس اپنے گھر؟"

"نہیں جمشید پور کے نواب نے بلا بھیجا ہے۔ وہاں جا رہی ہوں۔ سُنا ہے وہ بڑا امیر اور فیاض نواب ہے"

"یہ گاڑی جمشید پور کب پہنچے گی؟"

"رات کے دو بجے۔ نواب صاحب کے آدمی ہمیں لینے کے لئے سٹیشن پر آئے ہونگے" طوائف اُس کا ہاتھ پکڑ کر ادھر اُدھر ہلاتی رہی۔ جیسے وہ کوئی کھلونا ہو۔ اُس نے گل مچھوں والے آدمی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "وہ کون ہے"

"میرا خصم ہے۔ بڑا حرامی ہے۔ . . جانے دو اِکی بات"

وہ کھڑکی میں سے اور آگے کو اُس کی طرف جھک گیا۔ اور اُسکے رسیلے لبوں کی طرف تکنے لگا۔ طوائف نے اُس کا ہاتھ ہلاتے ہوئے۔ شوخی اور شرارت سے کہا "ایک دو تین"

پروانہ بے اختیار اُس نقطے کی طرف چلا۔ جہاں مکڑی اپنے پر پھیلائے۔ سفید سفید تاگوں کا عروسی لباس پہنے اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ اور پھر دوسرے لمحے میں پروانے نے اُسکے بے شمار بازو اپنے جسم کے گرد لپٹے ہوئے دیکھے۔

ایک بار۔ دو بار . . . .

■

طوائف نے ملامت بار نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔ یہ تم نے کیا کہا۔ یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔

اُس نے کہا۔ چلو ایک روپیہ ادھار رہا۔ چلو مغلوک دو چھ اور اگلے اسٹیشن پر وہ ایک آنے کی ایک پاؤ گنڈیریاں خرید کر لایا۔ گنڈیریاں شیریں تھیں۔ اور رسدار۔ برف میں لگی ہوئیں اور گلاب کی پتیوں سے معطر۔ وہ دونوں کھڑکی میں سے باہر جھکے ہوئے ایک دوسرے کے منہ میں گنڈیریاں ڈالتے رہے اور اُس نے اپنا ادھار چکا دیا۔ بلکہ دو روپوں کا اور ادھار کر لیا یکایک اُسے اپنی آنکھوں میں کوئی چیز جلتی ہوئی سی محسوس ہوئی۔ اور اُس نے گھبرا کر چہرہ اندر کر لیا۔ وہ دیر تک اُس تکلیف دہ چیز کو اپنی آنکھوں کے پپوٹوں تلے ڈھونڈتا رہا۔ اور اُسے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ بعض اوقات ایک خواب انگیز میٹھے رومان کو پتھر کے کوئلے کا سلگتا ہوا ذرہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیتا ہے۔

رات گہری ہوتی گئی۔ ڈبے میں صرف ایک بلب روشن تھا اُس کی روشنی ان دونوں تک چھن کر آتی تھی۔ ایک آرام کا سانس لے کر طوائف نشست پر لیٹ گئی۔ اور وہ اُسکے سرہانے بیٹھ کر اونگھنے لگا۔ طوائف کا ایک ہاتھ اُسکے ہاتھ میں تھا۔ کبھی کبھی وہ آنکھیں کھول کر اُس کی طرف دیکھ لیتی۔ اور وہ اس کا ہاتھ دبا دیتا۔ پھر وہ سو گئی۔ اور اُس کی اپنی گردن بھی چھاتی پر جھک گئی۔ اور وہ گہری غنودگی میں کھو گیا۔ نیند میں کھو جانے سے پیشتر اُسے صرف دو بڑی بڑی آنکھوں کے کھلنے کا احساس تھا۔ اور یا دور طوائف کے پاؤں میں پازیب کے نقرئی پھول جو مدہم ستاروں کی طرح چمکتے ہوئے جھلملاتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ پھر ایک گہرے اندھیارے نے اُسکے احساسات پر غلبہ پا لیا

جب وہ جاگا تو صبح ہو چکی تھی۔ گاڑی الہ آباد کے سٹیشن سے گذر کر گنگا جمنا کے سنگم پر پل کے اوپر گذر رہی تھی۔ پو پھٹنے سے ایک نرالی سحر طراز ہلکی سی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی سنگم کا پانی نیلا نیلا، خوشی سے ہنستا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ طوائف اور گل مچھوں والا آدمی جا چکے تھے۔ رات کے دو بجے جمشید آباد کے سٹیشن پر غالباً اتر گئے ہونگے۔ اُسے کچھ معلوم نہ تھا۔ کہ کب؟ ہاں وہ نادار عورت اور اُس کا بچہ سامنے کھڑکی میں بیٹھے ہوئے نظر آرہے تھے۔ یہ عورت اس سنگم کی خوبصورتی کو دیکھ کر بھی نہیں مسکرا سکتی۔ اچھا اگلے سٹیشن پر وہ ضرور اسکے لئے صابن کی ٹکیہ خرید لیگا۔ سنگم کے نظارے سے دنیا کے سارے دلدر دور ہو جاتے ہیں۔ سارے پاپ دُھل جاتے ہیں۔ "داتا یہ سنگم ہے۔ ایک پیسہ دو۔ یہ سنگم ہے"، گاڑی پل پر سے گذر رہی تھی۔ اور چھوٹے چھوٹے برہمن لڑکے پل کے لوہے کے شہتیروں سے چمٹے ہوئے پیسہ مانگ رہے تھے۔ داتا۔ ایک پیسہ۔ گنگا مائی تمہارا کلیان کریگی صرف ایک پیسہ۔ یہ پوتر سنگم ہے۔ اپنے کلیان کے لئے برہمن کو ایک پیسہ دیتے جاؤ۔ مسافر اپنے کلیان کی خاطر پیسے پھینک رہے تھے۔ پیسے گنگا مائی تک پہنچنے نہ پاتے۔ کہ برہمن لڑکے انہیں رستے ہی میں دبوچ لیتے تھے۔ وہ ایک شہتیر سے دوسرے شہتیر تک چالاک بندروں تک کی طرح چھلانگیں لگاتے جاتے تھے اور مسافروں کی روح کی کلیان کے لئے پیسہ مانگتے جاتے تھے۔ مسافروں کی روح کی نجات کے لئے۔ مسافروں کی مکتی یا نروان کی خاطر انہیں اپنی جان کا بھی ڈر نہ تھا۔ کیونکہ یہ عین ممکن تھا۔ کہ مسافروں کے کلیان کی دعائیں کرتے کرتے کہیں وہ نیچے سنگم میں گر کر اپنے تئیں نروان نہ حاصل کر لیں۔ اُسے برہمن لڑکوں کی اس جرأت۔ ہمت۔ شجاعت اور دھرم سیوا پر بہت رشک آیا کاش وہ بھی ایک برہمن ہوتا۔ اور اس طرح ماتھے پر تلک لگائے سنگم کے پل کے شہتیروں پر اپنی جان جوکھوں میں ڈال مسافروں سے ایک ایک پیسے کا طلبگار ہوتا۔ اور اُن کی آتما کے لئے مکتی حاصل کرتا۔ بخلاف اُن کے اُسے یہ جان کر بہت ندامت ہوئی کہ وہ رات بھر شیریں گنڈیریاں۔ رسیلے لب اور سندیلے کے لڈو چوستا اور کھاتا آیا ہے۔

بنیا دھیمے دھیمے سروں میں رام نام کا جاپ کر رہا تھا۔ فوجی پاپا کی چوٹی پھر ابھر آئی تھی۔ ایک کونے میں چند لوگ نماز پڑھنے کی تیاری کر رہے تھے۔ ایک سکھ اپنے سامنے سیٹ پر

ایک چھوٹا سا آئینہ رکھے اپنے لمبے لمبے گیسوؤں میں کنگھی کر رہا تھا۔ اور جیب جی کا پاٹھ گنگنا رہا تھا۔ اور صرف ایک کونے میں وہی غریب عورت اپنے بچے کو چھاتی سے لگائے کھڑکی میں اس طرح بے جان بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ جیسے اُس کی کبھی مکتی نہیں ہو سکتی۔

کھڑکی میں سے اُس نے عجیب عجیب نظارے دیکھے۔ ایسے نظارے وہ ہر روز دیکھتا تھا۔ لیکن نہ معلوم ان کا عجُب ان کا انوکھا پن اس نے پہلے کیوں محسوس نہیں کیا تھا — ایک گدلے گھاٹ پر سے عورتوں کی قطار گھڑے اٹھائے ہوئے گاؤں کی طرف جا رہی تھی۔ اور گائیں اور بھینسوں کی ایک قطار اُسی گھاٹ پر پانی پینے کے لئے آ رہی تھی۔ . . . ایک دھوبی بیل پر کپڑے لادے ہوئے گھاٹ کا رخ کر رہا تھا۔ . . . . ایک آدمی اپنی دھوتی سنبھالتا ہوا لوٹا ہاتھ میں لئے ایک بڑکی اوٹ سے نکلا۔ اور گھاٹ کی طرف چلا گیا۔ . . . قصبے کے گھروں کے سامنے سرکنڈوں کی باڑھ پر پرانے چیتھڑے پھیلے ہوئے تھے۔ اور انہیں دیکھ کر اُسے گاڑی میں بیٹھی ہوئی غریب عورت کا منہ یاد آ گیا۔ یہ ہمارا دیس ہے۔ مشرق کا کھلیان دور دور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ فصلیں پکی کھڑی تھیں۔ اور سرکنڈوں پر چیتھڑے پھیلے ہوئے تھے۔ ہرے ہرے طوطوں کی ڈاریں پر پھیلائے خوشی سے چیختی ہوئی تار کے کھمبوں کے اوپر اڑی چلی جا رہی تھیں . . . اُس نے سوچا اگر انسان طوطے ہوتے تو — تو شاید اس غریب عورت کے منہ پر مسکراہٹ آ جاتی۔ کسی آدمی نے تاک کر اُسکے تخیّل کی بال میں غلّہ لگایا ٹکٹ دکھا دیجیے۔ بابو صاحب۔ اُس نے گھبرا کر ٹکٹ چیکر کی طرف دیکھا۔ جو ایک نوٹ بک اور ایک ٹکٹ چھیدنے والا اوزار لئے کر اُس کے سر پر آ کھڑا ہوا تھا۔ اُس نے ٹکٹ دکھایا۔ ٹکٹ چیکر آگے بڑھ گیا۔ اُس کی نگاہیں یونہی ٹکٹ چیکر کا تعاقب کرتی گئیں۔ حتیٰ کہ ٹکٹ چیکر غریب عورت کے پاس جا پہنچا۔ اور اب اُسے معلوم ہوا۔ کہ یہ عورت کیوں مسکرا نہیں سکتی تھی۔ اگر وہ عورت ایک سبز رنگ کا پرندہ ہوتی۔ تو پھُر سے کھڑکی میں سے اڑ جاتی۔ لیکن وہ تو انسان تھی۔ اس لئے چپ چاپ کھڑکی میں بیٹھی رہی۔ اور اگلے سٹیشن پہ ٹکٹ چیکر نے اُسے سٹیشن پہ اتار کر پولیس کے حوالے کر دیا۔

طوطوں کو پولیس کی ضرورت کیوں نہیں پڑتی۔ یہ کیوں خوشی سے چیختے ہوئے چلاتے ہوئے تار کے کھمبوں پہ اڑے جا رہے ہیں۔ کیا یہ نہیں جانتے کہ ایک نادار عورت لوہے کے سلاخوں کے اندر بند کر دی گئی ہے۔ اُس کا ننھا بچہ پانی مانگ رہا ہے اور بنئے نے صراحی پر زور سے لکڑی کی کھچی کا ڈاٹ لگا دیا ہے۔ اُس عورت کا گاؤں اس سٹیشن سے کئی کوس دور ہے۔ وہ گاؤں جہاں باہر کھیتوں میں خوبصورت فصلیں پکی کھڑی ہیں۔ اور سرکنڈوں پہ میلے چیتھڑے پھیلے ہوئے ہیں۔

معاً اُسے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے اُسے بہت سخت بھوک لگی ہے۔ اور اُس نے اگلے سٹیشن پر اتر کر ڈائننگ کار کے نوکر کو بلا کر اُسے کھانا لانے کو کہا۔ تین چار سٹیشن اور گزر گئے۔ گاڑی میں نئے مسافر آ گئے تھے۔ کچھ پرانے چہرے اس ڈبے کو خیرآباد کہہ چکے تھے۔ اگلے سٹیشن پہ بنیا بھی رخصت ہو گیا۔ اور اُسے ایسا معلوم ہوا کہ اب وہی اس ڈبے میں اشراف کے طبقے کا ترجمان اور نمائندہ رہ گیا ہے۔

آخر بیرہ کھانا لے آیا۔ ایک پلیٹ میں قورمہ جسکے شوربے میں یاقوت کی سی سُرخی تھی۔ ایک پلیٹ میں انڈوں کا شور بہ زردی۔ سفیدی اور سُرخی کا حسین امتزاج اور لیموں کے رس میں رچے ہوئے ہوئے پیاز اور ٹماٹر کے ٹکڑے۔ وٹامن۔ بہاری کسان اُسے اور اُسکے کھانے کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ اور اُسے کھانا کھاتے ہوئے ایسا احساس ہوا جیسے وہ لہو کے گھونٹ حلق سے نیچے اتار رہا ہو، لیکن کس کا لہو؟ بہاری کسان اپنی پوٹلیاں کھول کر کھانا کھا رہے تھے۔ موٹی موٹی روٹیاں جن سے بدبو آ رہی تھی۔ غالباً پسے ہوئے چاولوں سے تیار کی گئی تھیں۔ ملگجا سا خاکستری سا رنگ اور بس نہ سالن نہ پیاز۔ نہ وٹامن۔ اُس نے دل ہی دل میں ایک بھاری

کسان سے پوچھا کہ تم وٹامن نہیں کھاتے ہو۔ بہاری کسان نے اُسی دل سے کہا۔ میرے بدن پر یہی دھوتی ہے۔ کئی دفعہ ہمارے گھر کی عورتوں کے پاس بھی صرف ایک دھوتی ہوتی ہے۔ جسے وہ باہر جاتے وقت باری باری پہنتی ہیں۔ ورنہ اُن کی ساری عمر انہی چیتھڑوں کو پہنتے گزر جاتی ہے۔ جو تم نے سرکنڈوں پر پھیلے ہوئے دیکھے تھے۔ اور وٹامن ——؟

پھر اُس نے آواز ملبند ایک بہاری کسان سے کہا۔ تم گاندھی کو جانتے ہو؟

بہاری کسان نے روٹی کا ایک بڑا سا ٹکڑا حلق سے نیچے اتارتے ہوئے کہا۔ نہیں!"

"جناح کو"

"نہیں"

"اپنے گاؤں کے نمبردار کو"

"ہاں"

"ایک روپیہ میں کتنے آنے ہوتے ہیں"

"سولہ" اُس نے حیرت سے کہا۔ غالباً وہ کسان اُسے پاگل تصور کر رہا تھا۔

ملا ناگی چکھنے کے بعد اُس پر غنودگی سی طاری ہو گئی۔ اور وہ نشست پر ٹانگیں پھیلا کر سوگیا۔ . . . دائی نگیر پر فیوجی یاما پہاڑ کی چوٹی نمودار ہو رہی تھی۔ اور اس میں سے لاوا پھوٹ پھوٹ کر بہہ رہا تھا۔ جنیا جی کا ڈاٹ کھول کر اُس لکڑی کی بچی سے اُس آتش فشاں پہاڑ کے دہانے کا منہ بند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ . . صابن کی لاکھوں ٹکیاں تار کے کھمبوں پر خوشی سے چیختی چلاتی اڑی جا رہی تھیں۔ . . . اور ہرے ہرے طوطے سرکنڈوں پر پھیلے ہوئے چیتھڑوں کو کتر کتر کر پھینک رہے تھے . . . غریب عورت مسکرا رہی تھی۔ اور اُس کا بچہ لوہے کی سلاخ ہات میں لئے پولیس مین کا تعاقب کر رہا تھا۔ . . گاڑی گنگا جمنا کے سنگم پر کھڑی تھی اور چھابڑی فروش زور زور سے صدائیں لگا رہے تھے۔ . . . عورت کے ہونٹ . . . رسیلے جذباتی لب۔ قیمت ایک روپیہ۔ سندیلے کے لڈو قیمت آٹھ آنے گلابی گنڈیریاں ایک آنے کی ایک پاؤ . . . . تروان کی قیمت ایک پیسہ۔ اُس نے اپنی جیب میں ہات ڈال کر ایک روپیہ نکالا اور ایک ٹک دعا رتی چھابڑی فروش سے کہا مجھے ایک پیسے کی مکتی دینا ہرے ہرے طوطے زور زور سے ہنسنے لگے اور وہ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا انجن کی رفتار دھیمی ہو گئی تھی۔ اور گاڑی ہوڑہ سٹیشن میں داخل ہو رہی تھی۔

محمد امین شرقپوری

دھوئیں کے بادل

آبادی سے دُور بھٹے کی بلند چمنی کا دھندلا دھندلا دھواں لالہ گوں شفق کی سُرخی کے ساتھ مِل کر کھیتوں پر زردی کی چادر ڈال رہا تھا۔ مزدوروں کی بستی میں شور مچ گیا۔ لڑکے چِلّا کر بولے "بھٹے میں آگ دی گئی۔ مگر مٹھائی نہیں بٹی۔ کیا بات ہوئی بابو؟ بوڑھا دُرجن جو نہ صرف عمر میں سب سے بڑا تھا، کئی بیٹوں کا باپ اور پوتوں کا دادا بھی تھا ——! ناریل ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا" اب کے لالہ کو گھاٹا ہُوا ہے۔ اِسلئے کچھ نہیں بانٹا" لڑکوں نے اس کی بات سُنی۔ تالی بجا کر بولے —— !" گھاٹا کہاں سے ہُوا۔ مجبُوری تو دی نہیں؟"

"چُپ رہو شریرو"! بوڑھا بگڑ کر بولا۔ لڑکے بھاگ گئے دُرجن ہلکا سا کش لیکر سوچنے لگا۔ لالہ نے سچ مچ مہورت نہیں کی۔ منشی صحیح کہہ رہا تھا۔ لالہ جی نے دو کوٹھیوں کا ٹھیکہ لیا ہے اینٹیں جلد چاہئیں"۔ کھانستے ہوئے بولا" منشی"! اور پھر ناریل کو مُنہ سے لگا لیا" کسی کو ایک دمڑی نہیں دی۔ تھپیرے بھوکوں مر رہے ہیں۔ مگر اس منشی کا کیا بگڑتا ہے جو کہتا ہے مجبُوری نہیں ملے گی۔ جیسے کچھ اس کی جیب سے جاتا ہے۔ پر سال بھی تو کام ہُوا تھا گڑ اور مُرمُرے بٹے تھے۔ مزدوری بھی سب کو مل گئی تھی دُرجن کی آنکھوں کے آگے ایک منظر گھوم گیا۔ ہر چھوٹا بڑا خوشی خوشی کام میں مصروف تھا۔ تھپیرے مٹی تھاپ رہے تھے، اینٹیں سانچوں میں ڈھال رہے تھے۔ عورتیں تسلوں میں ڈال کر دھوپ میں پھیلا رہی تھیں۔ گا بھی تو رہی تھیں سُریلی آواز کے ساتھ۔ اور ان کی آواز پر مزدوروں کے ہاتھ کتنی پھُرتی سے چل رہے تھے چار روز کا کام دو ہی روز میں ختم کر دیا۔ اور کوئلوں کی دس گاڑیاں کیا آپ ہی آپ بھٹے میں چُنی گئیں، یہ میرے لڑکوں ہی کا کام تھا۔ جو چار دِن میں سب ٹھیک کر دیا ——!"

"بابو" دُرجن نے چونک کر دیکھا۔ کستوری کھڑی تھی۔

"کیا بات ہے؟" دُرجن نے ناریل کو دیوار کے سائے کے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"منشی بُلا رہا ہے" وُہ بولی۔ دُرجن پگڑی لپیٹتا ہُوا باہر نکلا۔ رامو بنئیے کی دُکان پر کھڑا تھا۔ دُرجن کو دیکھ کر بولا۔

"کاکا پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ کی۔ یہ بنیا مانتا نہیں۔ سودا اُدھار دینے سے اِنکار کر رہا ہے"۔

دُرجن قریب جا کر بولا "بھائی دیتے کیوں نہیں۔ جب لالہ کا حُکم ہے تو اِنکار کیوں کرتے ہو؟"

"اِنکار کیسے نہ کروں" بنیا بولا۔ کندن کل سے غائب ہے پانچ روپے کا سودا لیا تھا۔ اب کون دیگا تُم یا لالہ جی؟"

"چلا گیا! کہاں؟" دُرجن نے رامُوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"چلا کہاں گیا۔ یہیں شہر میں ہو گا کہیں۔ آ جائے گا دو چار دِن میں"

"دو چار دن میں۔ اجی جو جاتا ہے پلٹ کر نہیں آتا"۔ بنئیے نے طنزاً کہا۔

"نہیں آئے گا تو پیسے میں دوں گا" دُرجن چھاتی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

"اِسے دے دو سودا ——!"

دُرجن چلا گیا۔ منشی کھاٹ پر پاؤں پھیلائے پڑا تھا پرجو پاؤں داب رہا تھا۔

"تم آ گئے دُرجن"۔ وُہ بولا۔

" جی "

" اینٹیں کے دن میں تیار ہوں گی ؟"

" یہ بھی کوئی بس کی بات ہے ---- !" بوڑھا کچھ مسکراتے ہوئے بولا۔

" پھر بھی ---- ؟"

" آپ تو اس طرح پوچھ رہے ہیں، جیسے کچھ جانتے ہی نہیں ہم سب سے زیادہ عقلمند ہو اور گیانی بھی ---- !" منشی اپنی تعریف سن کر مسکراتے ہوئے بولا۔ " لالہ جی تقاضا کر رہے ہیں۔ کوٹھیوں کی تعمیر شروع ہونے والی ہے۔ بیس پچیس ہزار کا کام ہے !"

" اپنی طرف سے تو جلدی کر رہے ہیں۔ آگے بھگوان کی مرضی ---- !"

منشی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ برجو نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

" سرکار پیسے ویسے دلواؤ نا ---- !"

" مل جائیں گے پیسے بھی۔ کہیں مارے تھوڑے ہیں"

" بہت تکلیف ہو رہی ہے، سب نہیں تو آدھے ہی دلوا دو۔" درجن بولا۔

" بھائی سرکار سے رقم ہاتھ نہیں آئی ابھی۔ سڑک کی مرمت کی رقم بھی ابھی کھڑی ہے۔ آئیگا نہیں تو کہاں سے دیں گے۔ صبر کرو۔ پائی پائی مل جائے گی۔" منشی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ برجو نے درجن کو دیکھا اور بولا۔ " کاکا تمہاری لڑکی کے پاس اوڑھنے کو لتا نہیں ہے۔ تم جانو جوان چھوکری، یوں کھلے منہ کس طرح چل پھر سکتی ہے ؟"

" گوپال سے لے لو ایک آدھ روپیہ ؟" وہ بولا

" نہیں دیتا کاکا ---- !"

" چل میں کہتا ہوں"

گوپال آلتی پالتی مارے چبوترے پر بیٹھا ہوا تھا ---- !

" ارے رامو کو دیدیا سودا تم نے ؟" درجن مسکرا کر بولا۔

" ہاں آج تو دیدیا تمہارے کہنے سے کل نہیں دوں گا ---- !

اور یہ برجو کیسے آیا ہے تمہارے ساتھ ---- ؟ گوپال بولا۔

" لڑکی کے لئے اوڑھنی لینے جا رہا ہے۔ ایک روپیہ اسے دے دو۔"

" اس میں تمہاری سفارش کی کیا ضرورت تھی۔ آپ ہی مانگ لیتا میں انکار تھوڑا ہی کرتا ہوں۔" جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔

" بھائی تم سے سبھی ڈرتے ہیں"

برجو کے ہاتھ میں گول گول روپیہ تھا۔ آج اس نے بہت دنوں کے بعد روپے کی صورت دیکھی تھی۔ گوپال نے مسکراتے ہوئے کہا۔ " اچھی سی اوڑھنی لاکر دینا"

دونوں چلے گئے ! گوپال نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ "چنبیلی کے لئے ایک چھوڑ کئی اوڑھنیاں لا دوں۔ بڑی ظالم ہے ظالم ---- ! بستی بھر میں ایک ہی تو ہے۔" گاتی ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کوئل کوک رہی ہے۔ کتنی میٹھی اور پیاری آواز ہے اس کی۔ دو روز سے سودا لینے نہیں آئی نہ جانے کیا بات ہوئی"

(۲)

" چون لینے نہیں جاؤ گی ؟"

" کون چنبیلی ؟" کستوری نے مسکرا کر کہا۔

" آؤ نا" وہ بولی

" اکیلی کیا ڈر لگتا ہے تجھے ؟"

" یہ بات نہیں ؟"

" پھر "

" میرے ساتھ چلو ۔ !" دونوں مسکراتی ہوئی دکان پر آئیں۔ گوپال نے مسکرا کر کہا۔

" کیا چاہیئے ؟"

" چون دے دو ایک سیر" چنبیلی بولی۔

" اور تمہیں ؟" کستوری نے سر ہلا دیا ---- !

" چنبیلی تم آتی کیوں نہیں ادھر ؟"

" کام ہوتا ہے تو آتی ہوں"

"نہیں تم روز آیا کرو"

"لاؤ چون دے دو — !"

"ٹھہرو ابھی دیتا ہوں۔ جلدی کیا ہے، ابھی تو سورج کھڑا ہے،"

"دیتے کیوں نہیں،" کستوری بولی

"تمہیں جلدی ہے تو جاؤ۔ اسے کیا راستہ نہیں آتا۔ آپ چلی جائے گی۔"

"دونو ساتھ جائیں گی!" چنبیلی نے مسکرا کر کہا۔ گوپال آپ ہی آپ ہنسنے لگا۔

"یہ اوڑھنی تو بہت اچھی ہے!" وہ بولا

"آج ہی بابو لائے ہیں۔"

"مگر اتنی اچھی نہیں جتنی کہ —!" وہ رُک گیا

"کیا کہا؟" چنبیلی چونک کر بولی۔

"تجھ سے کہتی تو اچھی لا کر دیتا —!" چون جھولی میں ڈالتے ہوئے، ہاتھ پکڑ لیا چنبیلی ہاتھ کھینچتے ہوئے بولی" چھوڑو ایسی باتیں کروگے تو ہم دکان پر نہیں آئیں گے" کستوری کا دل دھڑکنے لگا۔ دونو لمبے لمبے قدم اٹھاتی ہوئی لوٹ آئیں۔

دُرجن چلم بھرتے ہوئے بولا "کہاں گئی تھی؟"

"چنبیلی کے ساتھ!"

"دکان تک۔ چون لینا تھا اُسے"

"دے دیا اُدھار اس نے؟"

"ہاں"

"بنا کچھ کہے سُنے؟"

"کہتا تھا —" وہ رُک گئی، بوڑھا آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا "کیا کہتا تھا؟"

"تمہیں اوڑھنی اور اچھی لا دیتا، روز دُکان پہ آیا کرو۔ تم بہت اچھی ہو چنبیلی؟" کستوری نے ایک ہی سانس میں سب کہہ ڈالا۔

"ہوں" دُرجن کش لیتے ہوئے بولا "تو مت جائیو! اس کی دُکان پر۔ برجو سے بھی کہہ دوں گا۔ وہ بھی نہیں بھیجے گا چنبیلی کو —!"

دُرجن بیلچہ کاندھے پر رکھ کر چلم پیتا ہوا باہر نکل گیا۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ "بدمعاش لڑکیوں سے مذاق کرتا ہے" اور یہ منشی کیا کم ہے۔ روز نئی ٹوپی اور جوتا پہن کر آتا ہے مسکرا مسکرا کر بات کرتا ہے۔ رامو بھی کہہ رہا تھا چنبیلی کے پیچھے پیچھے گھومتا ہے۔ نیت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی اس کی۔ پرائی بہو بیٹیوں سے دل لگی کی باتیں، شرم نہیں آتی ان لوگوں کو —! پھر اُس نے بیلچہ زمین پر ڈال دیا۔ گردن اٹھا کر دیکھا۔ چمنی سے دھوآں نکل رہا تھا۔ "تاؤ کم تو نہیں ہو گیا؟" ناریل کو ایک ہاتھ سے تھامے ہوئے سوچنے لگا۔ کستوری کی بات رہ رہ کر کلیجہ مسل رہی تھی۔ بنیا اور چنبیلی، اور کبھی منشی آڑے آ جاتے، بڈھے کا دل دھڑک رہا تھا۔ "یہ سب بھوک ہی کے کارن تو ہے"۔ ہودی کا ڈھکنا اٹھاتے ہوئے بولا۔ گرم گرم ہوا کا جھونکا آیا۔ دُرجن نے بیلچے سے آگ کو جھجھوڑا۔ "یہ تو خوب سلگ رہی ہے" وہ بولا۔ "بیس پچیس دنوں میں بھٹہ تیار ملے گا۔ لالہ کو بھی جلدی ہے —! مگر مجوری کیوں نہیں دیتا۔ منشی کے پاس پیسے کہاں سے آجاتے ہیں، ہمارے سو پچاس سے کیا کام نکل جائینگے، بنیا اُدھار نہیں دیتا منشی آبرو کا لاگو ہو رہا ہے۔ ورنہ یہ بنیا۔ ایک ہی ہاتھ سے صفایا کردیں۔ پارسال بسنتی کو رسوا کیا، اب چنبیلی"۔ ہودی سے گرم گرم شعلہ نکلا۔ اور دُرجن چونک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"ہوں — لالہ بھی کیا شریف ہے۔ برجو سُنا رہا تھا۔ اونچے کوٹھے والی رنڈی کے ہاں آتے جاتے ہیں۔ ایک کوٹھی اس کے نام کر دی ہے۔ گھومنے کے لئے موٹر لے دی ہے۔ دولت کے چونچلے ہیں۔ مگر ہماری مزدوری کیوں نہیں دیتا —!"

ہودی میں جھانک کر دیکھا۔ گرم گرم شعلے نکل رہے تھے مگر بڈھے کو ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے یہ بھڑکتے ہوئے شعلے سرد پڑ گئے تھے۔ اس کا خون کھول رہا تھا۔ کلیجہ دھک دھک کر رہا تھا جانے کیوں؟ "ایک مہینہ کے بعد دیگا۔ اس کا یہ مطلب ہوا۔ کہ

یہیں ایک بھینیہ اور ہاتھ پھیلا نے پڑیں گے بنیئے کے آگے — !
آبرو کا دشمن ہو رہا ہے — !" بڈھے کا پاؤں پھسل گیا۔ ہودی میں کسی کے گرنے کی آواز آئی۔

سورج لال غبارے کی طرح بادلوں میں گم ہو رہا تھا۔ چمنی سے کالا کالا دھواں نکل رہا تھا۔ فضا میں بادل اُڑ رہے تھے۔ سیاہ بادل — ! گوشت کے جلنے کی سڑاند پھیل گئی۔ برجو نے ناک چھوڑ کر کہا۔ "کیا چیز جل رہی ہے؟"

رامو بولا۔ "ارے کہاں سے آ رہی ہے بدبو" چاروں طرف دیکھا۔ ہودی سے ایک شعلہ نکلا، چنگاریاں بکھیرتا ہوا۔ تیز بدبو فضا میں پھیل گئی — !

" ارے ہودی کس نے کھولی ہے؟" دوڑ کر آیا۔ "کاکا کھڑے تو تھے یہاں، ناریل پڑا ہے اور بیلچہ — !" اس نے جھانک کر دیکھا

بدبو سے دماغ پھٹ گیا۔ لڑکھڑا کر پیچھے جا پڑا — !
"کیا ہوا برجو؟" رامو نے دیکھا برجو اوندھا پڑا تھا۔
" برجوا سے بالو کہاں ہیں۔ یہ ناریل یہ بیلچہ — ! تو وہ نک گیا۔

کوئی ہڈی زور سے ٹوٹی۔ تڑاک کی آواز کے ساتھ — !

" کاکا ہودی میں گر پڑے ہیں؟" برجو زمین پر لوٹتے ہوئے بولا
رامو چیخ مار کر گر پڑا۔ بستی میں ہلڑ مچ گیا۔ کھیلتے ہوئے لڑکے دوڑ کر آئے۔ عورتیں چولہوں کے آگے سے اُٹھ اُٹھ کر چمنی کے نیچے جمع ہو رہی تھیں۔ روتی اور چلاتی ہوئیں — ! سورج غروب ہو رہا تھا۔ چمنی کا سیاہ دھواں سُرخ تھا۔ شاید یہ شفق کی جھلکیاں تھیں۔ ! ایک بڈھے کے خون کی آمیزش — !!

احمد ندیم قاسمی

ایک طویل مختصر افسانہ

طلوع و غروب

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں؟
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

(۱)

سنہرا غبار

ٹیلوں پر چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور دُور کھجوروں کے ایک جھنڈ میں کوئی پنچھی سہمی سہمی تانیں اُڑا رہا تھا۔ میں اس صحرا میں شکار کھیلنے آیا تھا۔ میرا بوڑھا ملازم سوگیا تھا اور چونکہ پردیس میں مجھے نیند بہت کم آتی ہے اور صحراؤں کی چاندنی راتیں سونے کے لئے نہیں بلکہ جاگنے کے لئے ہوتی ہیں اس لئے پہلے تو میں بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا مگر جب کھجوروں کے جھنڈ میں کسی بے نام پنچھی کی دُکھی دُکھی سہمی سہمی تانیں سُنیں اور پھر ان تانوں کو میں نے مجسم صورت میں فضا کے بے پناہ پھیلے ہوئے خلا میں کسی بھاگتی ہوئی خوفزدہ دوشیزہ کے گھنگریالے بالوں کی طرح لہراتا دیکھا تو میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ میرے کُتے اپنی دُمیں ہلانے لگے اور طلائی ریت اُن کی دُموں کی ہر حرکت پر اُڑنے لگی۔ ایک اُونچے ٹیلے پر چڑھ کر میں نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ اِکّی دُکّی کھجوروں کے آسیبی سائے اور سائیں سائیں کرتی ہوئی خاموشی کے سوا تنہائی کے اس لق و دق برِّ اعظم میں کوئی چیز موجود نہ تھی۔ میں ٹھنڈی ریت کو مٹھیوں میں دبا کر اُسے ہولے ہولے نیچے گرانے لگا، ریت کے ننھے ننھے مینار سے اُبھر آئے اور میں سوچنے لگا کہ اگر خدا نے زمین کا اس قدر طویل و عریض ٹکڑا ریت اور صرف ریت کے لئے وقف کیا ہے تو آخر اس کا مقصد! ——
یوں کیوں نہ ہُوا کہ یہاں سرسبز اور شاداب کھیت ہوتے۔ گیہوں کی سنہری بالیاں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ایک اندازِ بے نیازی سے اپنی گردنیں خم کر دیتیں اور سارا منظر کوؤں کی روں روں اور چڑیوں کے دبے دبے گیتوں سے لبریز ہوتا —— یا یوں کیوں نہ ہُوا کہ یہاں اونچے اونچے پہاڑ ہوتے جن پر بلند صنوبروں کے جنگل ہوتے، ننھی ننھی ندیاں چٹانوں پر پٹختی، جھاگ کے بادل اُڑاتی زخمی ناگنوں کی طرح لہراتی پھرتیں اور ڈھلانوں پر الھڑ چرواہیاں پتلی پتلی اُنگلیوں میں موتی موتی بنسریاں تھامے گلابی ہونٹوں کے ایک ذرا سے مَس سے فضاؤں میں موسیقی کا رس گھولتیں —— یا یوں کیوں نہ ہُوا کہ یہاں بڑے بڑے شہر —— میرے خیالات کی پرواز اچانک رُک گئی۔ اور چاندنی کے سہمے اندھیرے میں مجھے اُونٹوں کی گھنٹیوں کی دھیمی دھیمی صدائیں سُنائی دیں۔ خاموشی کے اس سمندر پر ان سُریلی آوازوں کا سفینہ تیرتا ہُوا آیا اور میرے احساسات کے ساحل سے ٹکرانے لگا۔ اور اچانک میرے ذہن پر پُرانے زمانے کے ایک قافلے کے نقوش اُبھرنے لگے —— اُونٹوں کی دور اُفق میں گم ہوتی ہوئی قطار —— حدی خواں —— ساربان —— محملوں میں بیٹھی ہوئی حسین دوشیزائیں جن کے پھُول سے کانوں کی لووں میں چاندی کے بُندے اُونٹ کے ہر ہچکولے پر پھڑکتے تھے —— اور جن کے اُبھرے ہوئے سینوں میں دبی ہوئی اُمنگیں سہمے سہمے گیت بن کر محمل کے پردوں کے آس پاس گھومتی رہتی تھیں!

کھجوروں کے جھنڈ میں بے نام پرندے نے ایک تان اُڑائی اور خاموشی کے سینے پر جیسے ایک تیز نشتر چلا دیا۔ قافلہ ہولے ہولے قریب ہوتا گیا۔ اُونٹوں اور ساربانوں کے خطوط واضح ہوتے گئے اور

اب کجاووں میں کبھی کبھی ایک چمک سی بھی نظر آجاتی تھی جو شاید چاند کی کرنوں کے، دوشیزاؤں کے بُندوں کو چھونے سے پیدا ہوتی تھی۔ میرے شکاری کُتّے زور زور سے بھونکتے ہوئے اُونٹوں کی طرف لپکے۔ میں انہیں روکنے کی کوشش میں اُن کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ لیکن قافلہ کتّوں کے خوف سے بے پروا آہستہ آہستہ رینگتا چلا گیا۔ پیتل کی گھنٹیاں اُسی طرح ٹنٹناتی رہیں اور کسی ساربان کا یہ گیت کتّوں کی کرخت آوازوں سے لپٹتا دھندلی سنہری فضا پر تانوں کے ملائم تار پھیلاتا بدستور جاری رہا :۔

اے کالی راتوں میں لمبے لمبے ڈگ بھرنے والے خوفناک جنو!
میں تمہاری ہڈیوں کی چیخ اور دانتوں کی کپکپاہٹ اور
آتشیں سانسوں کے بگولوں سے ذرّہ بھر نہیں گھبراتا۔
کیوں میں اپنی محبوبہ کے ساتھ جا رہا ہوں !
اے کھلے صحراؤں پر گرجنے والے بادلو اور کڑکتی ہوئی بجلیو! میں جانتا ہوں کہ
تمہارے خوف سے بڑے بڑے درخت چیخ رہے ہیں اور کھلی فضاؤں میں تھرا رہی ہیں
میں جانتا ہوں کہ نالے چڑھنے والے ہیں اور پگڈنڈیاں مٹنے والی ہیں لیکن
میں بالکل ہراساں نہیں کیونکہ میں اپنی محبوبہ کے ساتھ جا رہا ہوں۔
اے چاندنی سے ڈھلے ہوئے ٹیلے پر بیٹھی ہوئی اجنبی
عورت! مجھے اپنی طرف بلانے کی کوشش نہ کر۔ میں جانتا
ہوں کہ تیرے بال ساون کی گھٹاؤں کی طرح سیاہ ہیں۔
تیری آنکھوں میں پہاڑی جھیلوں کی سی گہرائیاں اور
سیاہیاں ہیں تیرے ہونٹ گلاب کی نو میدہ پنکھڑیاں
ہیں تیرے گال ریشم کی طرح نرم اور شفق کی طرح نارنجی
ہیں۔ تیرا سارا جسم کنوارے نوجوانوں کے خوابوں کے مشابہ ہے
لیکن میں تیرے بس میں نہیں آسکتا کیونکہ میں تجھ سے
کہیں اچھی محبوبہ کے ساتھ جا رہا ہوں !

ایک جگہ پر جا کر میں نے کتّوں کو روک لیا۔ اور انہیں دھتکار کر خیمے کی طرف بھگا دیا۔ اب اونٹ میرے سامنے سے گزر رہے تھے۔ کجاووں پر شمعوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ اور اونٹوں کی گھنٹیاں سینکڑوں جل ترنگوں کی طرح بج رہی تھیں۔ مجھے بھی اسی رہگزار کے کسی گاؤں تک پہنچنے کی آرزو تھی۔ شکار کی دھن میں شام پڑ گئی تھی۔ اور رات بھر کسی گاؤں کی تلاش میں ٹیلوں پر بھٹکتے پھرنے کی بجائے میں نے یہیں خیمہ تان لینا مناسب سمجھا تھا۔ اس لئے آواز دی: "بھئی کس گاؤں جائے گا یہ قافلہ؟"

چند ساربانوں نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور بیک زبان بولے۔

"سوسن۔"

میں بھاگ کر ایک ساربان کے پاس گیا اور کہا: "بھئی مجھے بھی سوسن ہی جانا ہے شکار کھیلنے آیا تھا۔ رات پڑ گئی۔ رستہ معلوم نہ تھا۔ تم اگر میرے لئے کچھ دیر انتظار کر سکو تو میں سب سامان لیکر تمہارے ساتھ چلا چلوں کل دن کو میں کس سے راستہ پوچھتا پھروں گا:"

ساربان جس نے مُنڈاسے سے منہ چھپا رکھا تھا۔ بولا: "ہرج تو کوئی نہیں لیکن ——" اور وہ کچھ دیر سوچ کر زور سے پکارا: "ارے گلاب خاں یہ ایک مسافر ہے بیچارا کہتا ہے مجھے بھی سوسن لے چلو۔ کہو تو چند گھڑی یہاں دم لے لیں۔"

اور قافلے کے اگلے سرے سے آواز آئی: "کون ہے یہ مسافر؟"

اور ساربان نے جواب دیا: "کوئی شکاری ہے۔"

اُدھر سے گلاب خاں نے آواز دی: "ٹھہر جائیں گے، تم اس سے کہو ذرا جلدی کرے۔ پہلے بھی بہت دیر ہو چکی ہے۔ برات کو پو پھٹنے سے پہلے پہنچ جانا چاہئیے —— تاروں کی چھاؤں میں !"

قافلہ رُک گیا گھنٹیوں کی آوازیں مدھم پڑ گئیں۔ کجاووں پر چہچے سے سُنائی دینے لگے اور میں اپنے خیمے کی طرف بھاگا۔ میرا ملازم خیمے سے باہر میرا انتظار کر رہا تھا۔ بولا: "آپ کدھر نکل گئے تھے؟ راتوں کو ان ریگستانوں میں بھوت پریت کھیلا کرتے ہیں آپ کو تو اپنی جان کی کچھ پرواہ ہی نہیں !"

کُتّے میرے قدموں میں لوٹنے لگے۔ اور میں ملازم کی پیٹھ تھپکاتے ہوئے بولا: "گھبراؤ نہیں۔ یہ قافلے والے یہاں کے ایک گاؤں سوسن میں جا رہے ہیں خیمہ لپیٹو۔ بندوق سنبھالو اور چلو میرے ساتھ۔ بھوت پریت کا قصہ چھوڑو۔ یہ سب واہمے ہیں۔"

اب میرا ملازم تیزی سے خیمے کو اکھیڑتے ہوئے کہنے لگا: "واہمہ تو نہیں آقا۔ ساری دُنیا پر روشن ہے کہ ان ٹیلوں میں بہت سے شکاری

آئے اور دیوانے ہو کر واپس گئے، ابھی کل کا واقعہ ہے کہ نواب ریحان خاں کا نوجوان بیٹا ادھر شکار کھیلنے آیا اور جب واپس گیا تو کھویا کھویا۔ حکیموں سے مشورے کئے گئے۔ جواب ملا یہ کوئی مرض نہیں۔ بھوت پریت کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ ایک اندھیری رات کو گھر سے نکل بھاگا۔ اس روز قیامت خیز آندھی آئی اور وہ اس میں ایسا کھویا کہ پھر لوٹ کر نہ آیا۔ آپ تو میری ہر بات کا مذاق اڑا دیتے ہیں!"

انہیں باتوں میں خیمہ لپیٹ لیا گیا۔ اور ہم قافلے کی طرف بڑھے ٹیلے کے دامن میں کچھ اونٹ بیٹھے سستا رہے تھے۔ کچھ گردن موڑے ہماری طرف دیکھ رہے تھے اور کئی چپ چاپ کھڑے جیسے کجاووں میں بیٹھی ہوئی دوشیزاؤں کی باتیں سن رہے تھے!

منڈاسے والا نوجوان میرے انتظار میں تھا میرے پہنچتے ہی اس نے گلاب خاں کو کوچ کرنے کو کہا۔ اور یہ قافلہ ہولے ہولے ٹیلوں کے درمیان رینگنے لگا۔ "کہاں سے آ رہے ہیں آپ لوگ؟" میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔

"سمن سے" اس نے جواب دیا۔

"تم نے اپنے گاؤں کے لئے پھولوں کے سے نام کیوں چن رکھے ہیں۔ سمن، سوسن۔ بہت پیارے نام ہیں یہ"

اور وہ بولا۔ "یہاں پھول نہیں ملتے نا۔ اس لئے!"

میرا ملازم بھاری خیمے کو ایک کندھے سے دوسرے کندھے پر منتقل کرتے ہوئے بولا "یہاں پھول نہیں ملتے اس لئے! —— کیا مطلب!"

اور ساربان اپنی آنکھوں پر سے منڈاسا اٹھاتے ہوئے بولا "تم شہروں میں رہنے والے اپنے باغوں میں ننھی ننھی مصنوعی پہاڑیاں اور چھوٹے چھوٹے ریت کے قطعے بنا لیتے ہو کہ وہاں پہاڑ اور ریگستان نہیں ہیں۔ ہم ریگستانوں والے اپنے گاؤں کو پھولوں کے نام اس لئے دیتے ہیں کہ یہاں پھول نہیں ملتے۔ بات ایک ہی ہے۔ جو چیز حاصل نہ ہو سکے اس کا نام لینے سے ہی دل کو تسلی ہوتی ہے۔ ہم سمن سے آ رہے ہیں —— ہم سوسن جا رہے ہیں۔ کیا تمہیں ان ناموں میں کوئی گیت، کوئی رس محسوس نہیں ہوتا!"

اور میں ہنستے ہوئے بولا "کتوں کے باورچی کو پھولوں سے کیا لگاؤ! —— اُلو کیا جانے کہ دن کی روشنی کیا چیز ہے! بچھیلے کو کیا معلوم کہ ——"

اور بوڑھا میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "آپ کو تو میرا مذاق اڑانے میں بہت مزا ملتا ہے۔ ابھی تو مجھے آپ نے الو اور بھینسا بنایا ہے۔ اب اگر میں آپ کو نہ ٹوکتا تو خدا جانے آپ میرے لئے کیا کیا نام تجویز کرتے!"

"گھن چکر" میں بولا۔ اور ساربان اور میں زور زور سے قہقہے لگانے لگے۔ اور جب ہمارے قہقہے ختم ہوئے تو میں نے کجاوے پر دبی دبی ہنسی سنی۔ پلٹ کر میں نے اوپر دیکھا اور رنگے لباسوں کو بھینچ سے اپنے ارد گرد لپیٹتی ہوئی لڑکیاں سمٹ سمٹ گئیں۔ میرے دماغ پر ہلکی ہلکی نسیم سی چلنے لگی۔ جس سے میرے احساسات کی کونپلیں جھک جھک گئیں اور دیر تک میرے خوابوں کے پھول اپنی پنکھڑیاں پھڑپھڑاتے رہے۔ اور جب مجھے سکون سا محسوس ہوا تو ساربان اور میرا ملازم بھوت پریت کی باتیں کرنے لگے۔ "بھوت تو خیر بھوت ہوئے" میرا ملازم کہہ رہا تھا: "لیکن یہ پریت کا کیا مطلب!"

"ساربان بولا "پریت پریوں کو کہتے ہیں نا"

"اور پریاں کیا چیز ہوتی ہیں؟" میرے ملازم نے پوچھا۔

"پریاں؟"

"ہاں پریاں۔ اور یہ خیمہ تو اوپر کسی کجاوے میں اٹکا دو!"

ساربان نے ہنستے ہوئے خیمہ اس کے کندھوں سے اٹھایا اور اوپر کجاوے کی طرف اٹھاتے ہوئے بولا: "لے نرگس تو اپنے آگے رکھ لے یا ادھر نسترن کو دے دے!"

میرا ملازم ایک لمبی سانس لیتے ہوئے بولا۔ "ہاں تو کیا ہوتی ہیں پریاں؟"

"پریاں؟" ساربان سوچنے لگا۔ "پریاں خوبصورت لڑکیاں ہوتی ہیں۔ ان کے سنہرے پر ہوتے ہیں۔ وہ ہواؤں میں تیرتی رہتی ہیں اور جب ان کا سایہ کسی پر پڑ جاتے تو وہ اپنے حواس کھو بیٹھتا ہے:"

—— اور میں لاشعوری طور پر کجاوے کے سائے سے ہٹ کر ایک طرف ہو گیا —— خوبصورت لڑکیاں —— سنہرے بالوں والی —— جادو بھرے سایوں والی —— اور اچانک یہ خیال میرے دل میں چبھنے لگا کہ کہیں میں بھوت پریت کے بس میں تو نہیں آ گیا! ——

"روشنائی ہوئی چاندنی ۔۔۔۔ یہ گھنٹیوں کی خواب آور ٹنٹنا ہٹیں! ۔۔۔۔ یہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اونٹ ۔۔۔۔ یہ ہواؤں میں تیرتی ہوئی پریاں ۔۔۔۔ یہ سمن سے آنے والا اور سوسن کو جانے والا قافلہ ۔۔۔۔ یہ عجب دنیا ہے! میں گھبرا سا گیا۔ لیکن اچانک میرے ہمسفر ساربان نے کانوں پر ہاتھ رکھا اور یہ گیت گا کر مجھے پھر انہی ریتلے میدانوں میں لے آیا۔

اے کھجور کی ڈالی پر پھدکتی ہوئی ممولن۔ اُڑ جا۔ اور
اپنے ممولے کا کبھی اور کھجور پر انتظار کر کہ اس کھجور کے تلے
آج میری محبوبہ آئے گی!

اے کھجوروں کی ڈالیو۔ ہولے ہولے جھولو اور اپنے
سوکھے ہوئے پتوں کو کھڑکھڑاؤ نہیں۔ کہ آج یہاں میری
محبوبہ آئے گی!

اے تیز و تند ہواؤ ان شاخوں سے لپٹ لپٹ کر سر اٹھاؤ
نہیں، اور اس بوڑھے تنے میں گھس کر سیٹیاں نہ بجاؤ کہ آج
یہاں میری محبوبہ آئے گی!

اے ستارو۔ روشنی کی پھلواریں برساؤ۔ اور اے تیتریو
اپنے پروں کی ایک سیج بچھاؤ کہ آج یہاں میری محبوبہ آئیگی!

"کس کا گیت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرا اپنا" وہ بولا۔

"اچھا تو تم گیت بھی بنا لیتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں" وہ بولا "جب چاندنی راتوں میں ایک تنہا نوجوان اونٹ کی نکیل تھامے وسیع میدان میں کسی دور کی منزل کو جا رہا ہو تو وہ گیت بنانے پر مجبور ہو جاتا ہے"

"ٹھیک ہے" میں نے کہا "لیکن گیت بنانے والوں کو ایک اور چیز بھی چاہیئے"

"وہ کیا؟" اس نے پوچھا۔ اور پھر اچانک میرا بازو پکڑ کر آہستہ سے بولا "دیکھئے۔ کجاووں پر کنواری لڑکیاں بیٹھی ہیں!"

اور یہ موضوع یہاں ختم ہو گیا۔

"کس کی برات ہے؟" میرے ملازم نے پوچھا۔

اور ساربان نے جواب دیا "سمن کے سفید پوش کے بیٹے کی۔ ہم سوسن کے ایک بہت غریب گھرانے میں جا رہے ہیں"

"کیوں؟" میرے ملازم نے پوچھا۔

اور ساربان میرا ہاتھ دباتے ہوئے بولا "یہ محبت پریت کا اثر ہے"

۔۔۔۔۔ اور اوپر کجاووں میں نئے لباس سرسرائے۔ اور جب ہم سوسن کے قریب پہنچے تو دور ہمیں بہت سی لالٹینیں نظر آئیں ادھر سے گولے چھوٹنے لگے، برات کے اگلے سرے پہ ڈھول اور شہنائیاں بجنے لگیں۔ اونٹوں کے گھٹنوں اور گردنوں کے ساتھ گھنگروؤں کے ہار باندھ دئے گئے۔ اور مختلف سریلی آوازوں سے میدان میں ایک طوفان سا برپا ہو گیا۔ ساربان نے مجھ سے پوچھا "رات کہاں بسر کریں گے آپ؟"

اور میں نے جواب دیا "میری یہاں کوئی جان پہچان تو ہے نہیں۔ میں تو گاؤں اس لئے آیا ہوں کہ یہاں کھانے پینے کی چیزیں بآسانی مل جائیں گی۔ میں باہر کسی کھیت کے کنارے خیمہ تان لوں گا"

وہ میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا "کیا ضرورت ہے خیمہ کھڑا کرنے کی۔ میرے ہاں ٹھہرئیے گا۔ ہم سب تو گانے ناچنے میں لگ جائیں گے، اور پھر آپ بھی مسافر، ہم بھی مسافر، سب مسافر، ہم وطن ہوتے ہیں۔

"بہت اچھا" میں نے کہا۔ شاید میں انکار کر دیتا۔ لیکن وہ شاعر تھا، اور شاعروں کے متعلق میں نے جو کچھ کتابوں میں پڑھا ہے اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہ بہت سادے اور بہت مخلص ہوتے ہیں۔

گو اس رات مجھے نیند نہ آئی لیکن مجھے ایک سادہ سا بستر مل گیا۔ اور شہنائیوں، ڈھولوں اور باجوں، تاشوں کی گونج میں میں سوچتا رہا کہ مہذب دنیا سے دور رہنے والے ان ان پڑھ ساربانوں کو مسافر نوازیاں کس نے سکھا دیں! مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں پہلی بار دہلی گیا اور وہاں چاندنی چوک میں ایک صاحب سے کشمیری دروازہ کا رستہ پوچھا تو وہ ناک بھوں چڑھا کر بولا۔ "ادھر چلے جائیے۔ اور پھر ادھر مڑ کر سیدھے چلے جائیے گا!" ۔۔۔۔ اور جب میں نے ادھر دیکھا تو ایک بلند اور وسیع عمارت کھڑی تھی۔ ادھر ایک چھاپہ خانہ تھا اور سامنے ناک کی سیدھ میں وہی ٹریموں کی کھڑکھڑاہٹوں سے لبریز چاندنی چوک!

۔۔۔۔ سمن کا رہنے والا یہ نوجوان کتنی محبوب شخصیت کا مالک ہے! اور کتنا اچھا گاتا ہے! اور اس کے گیتوں میں کتنا رس اور کتنی مٹھاس ہے!

اور وہ کجاووں میں بیٹھی ہوئی عورتیں جنہوں نے برات کے اچانک رُک جانے کو ذرّہ بھر بھی بُرا نہ مانا —— اور وہ قافلہ سالار گلاب خاں جس نے ایک اجنبی کے لئے ویران صحرا میں قافلے کا قافلہ روک لیا —— اور پھر یہ کھلے میدان اور یہ اُبھرے ہوئے ٹیلوں پر چھٹکی ہوئی چاندنی —— یہ چالیس پچاس گھروں والا ننھا سا گاؤں —— یہ ڈھول اور یہ شہنائیاں —— یہ خالص کھدر کا بستر اور یہ پُرانی بھونڈی لالٹینیں —— کتنی آزاد ہے یہ دُنیا اور کتنی پاک ہے اس کی فضا! سوچتے سوچتے میں اپنے بستر سے اُٹھا اور دروازے پر کھڑے ہو کر میں نے سامنے نظریں دوڑائیں۔ لمبے لمبے شعلے اچھالتی اور دھواں اُڑاتی ہوئی مشعلوں کے ارد گرد نوجوان دہقان گھوم رہے تھے اور پاس ہی ایک گڑھ سے کنواریوں کے مل کر گانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں ہولے ہولے قدم اُٹھاتا مجمع کے قریب پہنچا۔

تال سُر سے بے نیاز اور زیر و بم سے بے خبر بین کی طرح بجتی ہوئی پُرانی ڈھولک کے ارد گرد سب ناچ رہے تھے مشعلیں ان سب کے چہروں میں آگ سی لگا رہی تھیں۔ اور بہت پرے کچے گھروندوں کی چھتوں پر نوجوان لڑکیاں —— اور آس پاس ٹنڈ منڈ بیریوں پر شریر بچے دم بخود بیٹھے گیت سُن رہے تھے۔ اور ناچ دیکھ رہے تھے۔ چوڑے تلووں اور پھٹی ہوئی ایڑیوں کی پے بہ پے دھمک سے ڈھولک بجانے والے کے ارد گرد ایک بگولا سا منڈلا رہا تھا۔ اور پھیپھڑوں کی پوری قوت سے نکلی ہوئی صدائیں سنہرے غبار میں گونجتی ہمیں ٹیلوں سے ٹکراتی کائنات سے چمٹی پڑتی تھیں۔

تھالی میں کٹورا دھرا ہے - پنگھٹ کے پانی میں تیرا چہرہ کانپ
رہا ہے!
بیری پر طوطی بیٹھا ہے - گبرو منڈیروں کی اوٹ میں کنواریوں
کی تاک میں ہیں!
بستی سے دھواں اُٹھ رہا ہے - یہ پگڈنڈی پر کس مسافر کی گھوڑی نے
غبار سا اُڑا دیا ہے!
دُلہن میکے سے آ رہی ہے - دولہا مہندی رچے پاؤں کے لئے
گیندے کی کلیاں اکٹھی کر رہا ہے!
دھم دھما دھم دھپ دھپ! دھم دھما دھم دھپ دھپ! ——

اور پاؤں کے تال اور گیت کی لَے سے ہم آہنگ سُننے والے نوجوانوں کی "ہائے ہائے" "واہ واہ" —— اور ڈھولک بجانے والے کی انگلیوں کا والہانہ رقص —— بشیما، مٹیالے پاؤں کی وحشیانہ کروٹیں —— ڈھولک کی آخری دھپ —— اور پھر قہقہے اور حقّے کی گڑگڑاہٹیں، سرگوشیاں اور نئے گیت کی تیاریاں!

مجھے دیکھ کر میرا نوجوان ساربان دوست میری طرف لپکا اور میرا ہاتھ تھام کر بولا "آپ سوئے نہیں ابھی تک؟ میں تو سمجھے بیٹھا تھا کہ آپ کب کے آرام کر رہے ہوں گے۔ آپ دن بھر کے تھکے ماندے ہیں۔ جا کر لیٹ رہیئے۔ ہمارے ناچ گانے میں کیا دھرا ہے! سُنا ہے آپ کے شہروں میں لڑکیاں ریشمی لباس پہن پہن کر ناچتی ہیں۔ اور جب قسم قسم کے سازوں کی دُھن پر گاتی ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کانسی کے بے شمار کٹورے آپس میں ٹکرا کر جھنجھنا رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے" میں نے کہا۔ لیکن وہ لڑکیاں لڑکیاں نہیں ہوتیں پُتلیاں ہوتی ہیں۔ جیسے دوا اور نچوا لو۔ اپنی خوشی سے ناچنے والیاں صرف ان صحراؤں میں رہتی ہیں۔ وہاں تو ناچ اور گانا کوڑیوں کے مول بکتا ہے"

ناچتے ہوئے قدم رُک چکے تھے اور ڈھولک بجانے والا ڈھولک کی گرہیں تن رہا تھا۔ سب لوگ چپ چاپ کھڑے مجھے یوں گھور رہے تھے جیسے پُرانے زمانے کی داستانوں کا ہیرو ہوں اور لنکا دیپ کے جنوں اور پریوں کی قید سے نکل کر آیا ہوں۔

میرے ساربان دوست نے مجھے میری اقامت گاہ تک پہنچا دیا اور کہا "آپ آرام کریں۔ میں علی الصباح آپ کو جگا دوں گا۔ صبح سویرے آپ کیا چیز پینے کے عادی ہیں؟"

"پتلی چھاچھ" میں نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا اور وہ ہنستا ہُوا دُور ناچنے والوں کے جمگھٹ میں مل گیا۔

میں بستر پر دراز تھا اور اس عجیب غریب ماحول کی لطافتوں اور سحر انگیزیوں کے متعلق سوچ بچار میں مصروف تھا کہ اپنے قریب مجھے پہاڑیوں کا ایک چھوٹا سا سائنائی دیا۔ میں سر سے پاؤں تک چادر میں لپٹا پڑا تھا اور اپنے خیالوں کی دُنیا میں محوِ پرواز تھا۔ اس لئے اِس چھناکے کو ایک واہمہ سمجھ کر کروٹ بدل لی۔ لیکن اچانک میرے کانوں

کسی نے چھوا اور ساتھ ہی دھیمی سی آواز آئی "سنبل ـــــ اے سنبل۔ تم کہتے تھے کہ مجھے آج رات نیند ہی نہیں آئے گی؟"

میرے خیالوں کی جنت میں صرف ایک لڑکی کی تھی جو اب پوری ہو گئی۔ لیکن پردیس میں ایک اجنبی لڑکی کو اپنے اس درجہ قریب پا کر میں گھبرا سا گیا۔ چادر منہ سے ہٹا پھینکی اور کھاٹ پر اٹھتے ہوئے بولا۔ "نیند تو مجھے بھی نہیں آتی لیکن میں سنبل نہیں۔ میرا نام غضنفر ہے!" ـــــ اور میرا بھاری بھرکم نام سن کر وہ بجلی کی سی تیزی سے ہٹی اور لپک کر مکان سے باہر نکل گئی!

"اچھا تو یہ بات ہے!" میں نے سوچا۔ اور کالی چھت کے نیچے جھونپڑی لالٹین کی زرد روشنی میں میں اپنے آپ کو الف لیلہ کا ایک وجوان شہزادہ سمجھنے لگا جو شکار کے بہانے نازک اندام لڑکیوں سے کھیلتا پھرتا ہے۔ جسے شرمیلی کنواریاں رات کے اندھیرے میں شانہ پکڑ کر بلاتی ہیں اور جس کے اشارے سے قافلے کے قافلے ایک دم رک جاتے ہیں!

میں نے محسوس کیا کہ میری روح کے نہاں خانے میں جگنو سے چمکنے لگے ہیں۔ بالکل اس طرح جیسے دہلی میں ایک بار چمکے تھے۔ میں نے وہاں ایک نفیس بالاخانہ کرایہ پر لے رکھا تھا۔ مقابل کی عمارت میں ایک انکم ٹیکس افسر رہتے تھے جن کی لڑکیاں اکثر چھت پر چڑھ کر کشیدہ کاڑھا کرتی تھیں اور جب کشیدہ کاڑھتے کاڑھتے تھک جاتی تھیں تو سہگل کے گائے ہوئے گیتوں اور ملکہ پکھراج کی الاپی ہوئی غزلوں اور امراضیا کی اڑائی ہوئی تانوں کو دھیمے مگر دلآویز سروں میں نقل اتارتیں۔ میں کئی بار اپنے بالاخانے کی کھڑکیوں کے رنگین شیشوں میں سے انہیں دیکھنے کی کوشش کیا کرتا تھا اور جب ان میں سے مجھے کسی کے چمکتے ہوئے بال یا گورے شانے یا ناچتی پتلی مخروطی انگلیاں، یا گلابی پاؤں دکھائی دیتے تو میرے دل کے اندھیرے میں اچانک بہت سے جگنو ٹمٹمانے لگتے اور یہ ٹمٹماہٹ اس وقت تک قائم رہتی جب میں بستر پر لیٹ کر سو جاتا۔ اور دوسرے روز پھر نیلے سبز اور گلابی شیشوں پر اپنے رخسار لٹکا کر میں ان ٹمٹماہٹوں کو زندہ کر لیتا۔ کئی بار جی میں آتی کہ ان میں سے کسی ایک کی توجہ اچانک میری طرف منعطف ہو جائے۔ وہ اپنی دوسری بہنوں کے جھرمٹ سے نکل کر دیوار پر کہنیاں رکھ دے اور ہاتھوں کے پیالے میں اپنی ٹھوڑی جما کر مجھے دیکھے۔ دیکھتی جائے اور مسکراتی جائے اور جب دوسری لڑکیاں نیچے اتر جائیں تو وہ کہیں سے چھپتی چھپاتی میرے پاس آ جائے اور میرے بازوؤں پر اپنی زلفیں بکھیر کر کے۔ "غضنفر۔ تم میرے خوابوں کے دیوتا ہو۔ میں چھت پر کشیدہ کاڑھنے نہیں آتی۔ تمہیں دیکھنے آتی ہوں غضنفر۔ تم سبز اور نیلے اور گلابی شیشوں کے پیچھے سے مجھے نہ جھانکا کرو۔ اس مقصد کے لئے سفید شیشے بہت اچھے رہتے ہیں۔ یا اگر تم کھڑکی کھول دیا کرو تو کیا حرج ہے۔ تہذیب کا اگر ہمیں یہ پہلا سبق بھی یاد نہیں تو تف ہے ہم دونوں کی جوانیوں اور تعلیموں پر!" ـــــ اور غضنفر۔ اگر تم برا نہ مانو تو میں ہر رات تمہارے چرنوں میں اپنے پریم کے پھول ارپن کر جایا کروں کیونکہ تم میرے خوابوں کے دیوتا ہو:" ـــــ یہ سرگوشیاں مجھے اپنے بالاخانے کی چار دیواری میں سرسراتی ہوئی سنائی دیتیں۔ اور میں سوچنے لگتا کہ ان سب لڑکیوں میں سے وہ کون سی لڑکی ہے جو یوں چھپ چھپ کر میرے دل میں جگنو سے روشنی کرتی رہتی ہے ـــــ اور جب جگنو چنگاریوں میں تبدیل ہونے لگے ـــــ جب مجھے ان ٹمٹماہٹوں میں ہلکی ہلکی تپش کا احساس ہونے لگا۔ تو میں گھبرا سا گیا کیونکہ میری منگنی ہو چکی ہے۔ اور کہتے ہیں کہ میری ہونے والی بیوی اس قدر خوبصورت ہے کہ میں اگر اسے دیکھ لوں تو شاعر بن جاؤں!

کھڑکیوں سے ڈر ڈر کر اور سہم سہم کر جھانکنے والے کے شانے سے اگر پتلی آواز والی دوشیزہ کی انگلی چھو جائے تو نیند کہاں سے آئے۔ میری نیندیں اڑ گئیں۔ میری ماندگی دور ہو گئی اور جب پو پھٹنے سے کوئی ایک گھنٹہ باقی تھا تو میں باہر نکل آیا۔ زرد چاند دور مغربی افق کے قریب اونگھ رہا تھا اور موٹے موٹے ستارے سلیٹی آسمان پر ناچ رہے تھے۔ ہوا میں خنکی آ گئی تھی اور گاؤں سے ڈھولک کی دبی دبی تھاپ کی دھن پر لڑکیوں کے تھکے تھکے گیتوں کی بھنک کبھی کبھی میرے کانوں میں پڑ جاتی تھی۔ جن میں سے میں صرف یہ الفاظ سمجھ سکا: ندیاں ـــــ جھرنے ـــــ چاندنی راتیں ـــــ ستارے ـــــ محبوب ـــــ آنکھیں ـــــ بال ـــــ ہونٹ ـــــ!"

یہ کیسی دنیا ہے! میں نے سوچا۔ یہاں کے شاعروں کے ذہن میں جھرنوں ستاروں آنکھوں اور بالوں کے سوا اور کوئی موضوع نہیں! کیا یہاں کے لوگ موت کے نام سے واقف ہیں کہ ان کے گیتوں میں جاودانی

کیفیتیں جھلکتی ہیں ـــــ کیا یہاں اس حقیقت سے کوئی باخبر نہیں کہ پھول رُک جائیں گے ۔ستارے بجھ جائیں گے ۔آنکھیں مُند جائیں گی۔ اور بال بکھر جائیں گے ـــــ ۔اور پھر اس ناچتے اور گاتے ہوئے ہجوم سے آنکھ بچا کر اس دھندلے مکان میں کھسک آنے والی من چلی لڑکی کے دل میں کیا خیال سمایا تھا کہ وہ سنبل کی دُھن میں سب بے چارے غضنفر کی آرزوؤں میں چنگاریاں بھر کر دھوئیں کے مرغولے کی طرف فضا میں کھو گئی ـــ غضنفر جس نے دہلی میں رنگین شیشوں کی آرٹیلکٹی ہوائی محل بنانے اور جوان پتلی آوازوں اور لانبے بالوں اور جھکی جھکی آنکھوں والیوں کے ذرا سے مس کے لئے پچیس سال تک ترستا رہا !

گیتوں کی آوازیں دھیمی پڑتی گئیں اور میرے خیالات دہلی اور اس صحرا کی نازنینوں کے ہیولوں میں لپٹتے گئے ۔ٹیلوں کی ٹھنڈی ریت میرے جوتوں میں بھر گئی تھی جس کی وجہ سے میرے جلتے ہوئے تلووں کو بہت سکون پہنچ رہا تھا ۔صبح کا ستارہ مشرقی اُفق پر کسی سانولی دلہن کے ماتھے پر سیندوری ٹیکے کی طرح چمک رہا تھا اور آس پاس اکیلی دُکیلی ببولوں میں ٹڈے پیں پیں چلّانے جا رہے تھے کہ اچانک مجھے اپنے قریب ہی ایک بھرّائی ہوئی سرگوشی سنائی دی ۔میں جھٹ ریت پر دبک گیا ۔کان لگا کر سنا تو آواز آئی ۔" اسی لئے تو میں بار بار تم سے پوچھ رہا ہوں کہ تم آج اتنی اُداس کیوں ہو ؟ سمن سے باہر ڈراؤنی کھجوروں میں جب ہم چھپ چھپ کر باتیں کرتے تھے تو تم کتنی بشاش ہوتی تھیں ۔تمہارے ہونٹوں پہ پپڑیاں اور تمہاری آنکھوں میں یہ نمی مجھے اُن دنوں نظر نہ آتی حالانکہ ہر گھڑی ہمیں اپنے راز کے افشا ہونے کا احتمال تھا ۔لیکن اب ـــــ یہ سوسن کا صحرا اور یہ خشک چاندنی۔ ـــــ لوگ گاؤں میں ناچ اور گا رہے ہیں ۔اور ہم اِدھر ببول کی اوٹ میں ایک دوسرے کے اتنے قریب ـــــ اس قدر قریب بیٹھے ہیں۔ نرگس ۔تمہارے دل میں آج کیسا کانٹا کھٹک رہا ہے ۔تم اتنی چپ چاپ کیوں ہو نرگس ؟" ـــــ اور اس کے بعد مجھے نرگس کی سسکیاں بھری آواز سنائی دی ۔" مجھے تو یہ مُرا میدان جیسے نگل لے گا ۔میں تو گھبرا گئی ہوں سنبل ـــــ سنبل میں سوسن میں گھبرا گئی ہوں مجھے آج بخار ہو رہا ہے !"

اور اس کے بعد بہت سی اُلجھی ہوئی اور ہراساں سرگوشیاں سرسراتی رہیں ۔اور پھر ببول کی اوٹ سے ایک سایہ اُٹھا اور سنبل کی آواز آئی ۔" چلو چلیں ـــــ یا تم پہلے چلی جاؤ ۔اکیلی گھبراؤ گی یہاں !"

"نہیں " نرگس نے جواب دیا ۔" پہلے تم جاؤ ۔پو پھٹتے تک میں گاؤں آجاؤں گی ، اب اگر مجھے رستے میں کوئی مل جائے اور پوچھ بیٹھے کہ میں اس وقت کدھر گئی تھی تو کیا جواب دوں گی میں ؟"

اور سنبل بولا ۔" تو پھر پو پھٹنے تک میں یہیں تمہارے پاس ہی کیوں نہ بیٹھا رہوں !"

" نہیں نہیں سنبل " دبی دبی اور ملتجیانہ آواز آئی ۔" تم جاؤ ۔ بس ـــــ اب تم جاؤ "

اور سنبل ہولے ہولے قدم اٹھاتا ٹیلوں کی پرلی طرف غائب ہو گیا۔

صبح کا ستارا بہت اونچا چڑھ آیا تھا اور پورب کے اندھیرے کپکپانے لگے تھے ۔دِلّی کی کشیدہ کاڑھتی ہوئی لڑکیوں اور یہاں کی صحرائی دوشیزاؤں کے ہیولے سمٹنے لگے اور آخر ایک پرچھائیں میں سما گئے جو میرے سامنے ببول کی اوٹ میں بیٹھی جانے کدھر دیکھ رہی تھی !

اچانک ایک خیال میرے دِل پر ایک لمبی سی خراش ڈالتا میرے دماغ میں گھومنے لگا ، جیسے لڑکے تالابوں کی سطح پر پتھر پھینکتے ہیں اور وہ طویل سفید لکیریں پیدا کرتے بہت سے دائرے بناتے اور بلبلے چھوڑتے تہ کی طرف ڈوبنے لگتے ہیں !

ایک بہت لمبا چکر کاٹ کر میں نے اس ببول کا رُخ کر لیا جہاں نرگس پو پھٹنے کا انتظار کر رہی تھی سیٹی بجاتا ہوا میں اس کے قریب سے گزرا ۔وہ ببول کے نیچے گٹھڑی کی طرح سمٹی جا رہی تھی ۔میں یونہی بے پروایانہ انداز میں ببول کے قریب سے گزرتے ہوئے ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا ۔" شی ۔ شی !" میں نے تالی بجائی ۔اور پھر دو قدم آگے بڑھ کر میں نے نرگس کے جسم کو چھو لیا ۔" شی !" میں نے پھر تالی بجائی ۔اور اب نرگس دیوانوں کی طرح بال جھٹک کر اُٹھ بیٹھی ۔اس کا سینہ تیز تیز سانسیں لینے کی وجہ سے اُبھر اور ڈوب جا رہا تھا ۔اور اس کی زلفیں اُڑ اُڑ کر ببول کی سوکھی شاخوں سے لپٹی جا رہی تھیں ۔

" کون ہے تو ؟" میں نے ڈپٹ کر پوچھا ۔

"ہائے! ——— غضنفر!" دبی دبی آواز آئی۔

"تم نے مجھے کیسے پہچانا؟"

"تمہارے شکاری لباس سے۔"

"اور تم کون ہو؟"

"میں ——— میں ——— میں اِدھر سمن سے برات کے ساتھ آئی ہوں۔ وہاں گاتے ناچتے تھک گئی تو جی بہلانے اِدھر چلی آئی۔"

"ہاہاہاہا!" میں ہنسا! "میں سمجھا کوئی ہرنی دبکی بیٹھی ہے، شکاری جہاں جائے شکار کا بھوت اُس کے سر پہ سوار ہوتا ہے۔ شکر ہے میرے پاس اس وقت بندوق نہ تھی ورنہ بڑی مشکل بنتی۔"

وہ خاموش بیٹھی رہی۔ اُس سے باتیں کرنے کے کئی بہانے تیز جھونکوں کی طرح میرے دل پر بہت سی لہریں پیدا کرتے گزر گئے۔ مشرقی اُفق پہ اندھیرے اُسی طرح کپکپا رہے تھے اور صبح کا ستارا جیسے میرے جذبات کے بے ہنگم طوفان پر دل ہی دل میں گنگنا رہا تھا۔ آخر میں بولا۔ "کہو تو تمہیں گاؤں پہنچا دوں۔"

اُس نے اُڑتی ہوئی زلفوں کو ایک ہاتھ سے اکٹھا کر کے چٹنے کے پیچھے سرکاتے ہوئے کہا۔ "میں خود چلی جاؤں گی۔ میں رستہ جانتی ہوں۔"

"رستہ تو تم ضرور جانتی ہوگی۔" میں نے کہا۔ "لیکن مجھے سُنبل کا فکر ہے تمہاری راہ دیکھ رہا ہوگا!"

وہ چونک پڑی جیسے ننھے بچے سوتے میں بادل کی گرج سے ڈر کر گھبرا جاتے ہیں اور حواس باختہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے ہیں۔ اُس نے چار طرف نظریں دوڑائیں اور پھر مجھے چند لمحے دیوانوں کی طرح گھور کر گردن جھکا لی اور ریت مٹھیوں میں بھرنے لگی:

"میں سب کچھ دیکھ رہا تھا!" ——— میں نے اُس کے کلیجے میں ایک سوئی گھونپ دی۔ مجھے کمزوروں کی کمزوری کا فائدہ اُٹھاتے میں بڑی لذت ملتی ہے۔ بولا۔ "میں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ لیکن نرگس۔ تم آج اِتنی اُداس کیوں تھیں سُنبل بے چارے کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ جانے اس ریت میں اُس بے چارے کے کتنے آنسو جذب ہو چکے ہیں۔ نرگس مجھ کوئی حق نہیں کہ تمہارے ذاتی معاملات میں دخل دوں اور مجھے امید بھی نہیں کہ جو بات تم سُنبل کو نہ بتا سکیں وہ میرے سامنے کہہ ڈالو گی لیکن اگر میں تمہارے کسی کام آسکوں تو میں بخوشی یہاں چند روز ٹھہر جاؤں گا دیکھو نا سُنبل میرا دوست ہے۔ اگرچہ میری اور اُس کی دوستی صرف چند گھنٹے قبل شروع ہوئی ہے لیکن میں اُس سے محبت کرنے لگا ہوں تمہیں اس کے خلاف کوئی شکایت پیدا ہو گئی ہو تو مجھے بتا دو۔ میں اُسے سیدھی راہ پر لے آؤں گا، میں شکاری ہوں اور میرا نشانہ بہت کم چوکتا ہے۔ سُنتی ہو؟"

"جی سُن رہی ہوں۔" وہ بولی۔ "سُنبل سے مجھے کوئی شکایت نہیں۔ سُنبل میرا بہت پرانا ساتھی ہے۔ سُنبل کے من میں میرے متعلق کبھی میل نہیں آیا۔ سُنبل گیت بناتا ہے اور یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ گیت بنانے والوں کو لڑکیاں بہت چاہتی ہیں۔ لیکن وہ اُن سب کے حُسن سے یوں آنکھیں بند کر لیتا ہے جیسے وہ سوائے میرے دُنیا کی سب کنواریوں کے لئے اندھا ہو چکا ہے۔ لیکن میں ——— میں نے ——— مجھے ———"

وہ رُک گئی اور مٹھیوں میں بھری ہوئی ریت نیچے گرانے لگی!

"تم نے بات ختم نہیں کی۔" میں اُس کے قریب ہو کر بولا۔

"میں۔" وہ ہکلانے لگی۔ "میں آج بہت اُداس ہوں۔ میں برات کے ساتھ نہ ہی آتی تو اچھا تھا۔"

میں نے پُوچھا۔ "لیکن آخر تمہاری یہ اُداسی سُنبل کے ساتھ بے پروائی سے کیا تعلق رکھتی ہے!"

اور اچانک ہوا میں اُس کا دوپٹہ پھڑ پھڑایا اور میرے بازو سے لپٹ گیا۔ اُس نے دوپٹہ کھینچنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اِدھر میں نے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کی اور ہم دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے سے چھو گئے۔ میرے بازو سے اُس کا دوپٹہ لپٹا رہ گیا اور وہ پیچھے ہٹ گئی۔ اُس کے بال ہوا میں اُڑنے لگے اور میں نے اُس کا دوپٹہ بازو سے اُتارتے ہوئے کہا۔ "لو ———" اور ہمارے ہاتھ پھر چھو گئے۔ لیکن اب کے جو چھوئے تو الگ نہ ہو سکے، جیسے چمٹ کر رہ گئے ہیں ——— ہم دونوں کی انگلیوں میں کوئی مبہم سی لرزش بھر گئی۔ اور وہاں ببول کی سُوکھی ٹہنیوں کی آڑ میں میں نے دیکھا کہ اُفقِ مشرق پر پَو پھُوٹ رہی ہے۔ نرگس کے چہرے کے اردگرد مجھے ایک نُورانی ہالا نظر آنے لگا۔ میں نے اُس کی نرگسی آنکھوں کی چمک۔ اُس کے گلابی گالوں کی غیر محسوس نمی اور اُس کے باریک ہونٹوں

کی کپکپاہٹ پر نظریں گاڑدیں اور جب ہماری اکڑی ہوئی انگلیاں ڈھیلی پڑیں اور ہمارے سر پر سے ایک پرندہ سن سے گزر گیا۔ تو میں نے پوچھا "لیکن تم اُداس کیوں ہو نرگس؟"

اور وہ میری گھڑی کے شیشے پر انگلی پھیرتے ہوئے بولی: "آج رات جب سے میں نے آپ کی باتیں سُنی ہیں اور پھر آپ کو سُنبل سے دھمکے میں جگا بیٹھی ہوں میرے دل میں آپ کا چہرہ بس رہا ہے۔ مجھے اِن صحراؤں سے نفرت ہو گئی ہے۔ مجھے آپ سے اور آپ کے وطن سے محبت ہے لیکن آپ پردیسی ہیں۔ آپ آج کل یہاں سے چلے جائیں گے اور میں راتوں کو سمن کی کھجوروں کے جھنڈوں میں بیٹھ کر آپکی پرچھائیوں سے باتیں کیا کروں گی ——— آپ کب جائیں گے؟"

"میں کبھی نہیں جاؤں گا" میں نے اُس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ آٹھ دس کوّوں کا غول ہمارے سر پر سے کائیں کائیں کرتا سوسن کی طرف اُڑ گیا!

اور جب وہ ببول کی آڑ سے نکل کر سوسن کو چلدی تو میں نے یوں محسوس کیا جیسے اچانک مجھ پر مسرتوں کے بادل برس پڑے ہیں۔ جیسے خستہ مقتدر کی گردن کٹ کر الگ جا گری ہے اور جیسے دُنیا جہان کی لڑکیاں اور خاصکر دہلی شہر کے اُس بالاخانے کی دوشیزائیں لپک لپک کر میرے قدموں پر سر رکھ دیتی ہیں اور کہتی ہیں: "ہمیں چاہو" ——— اور میں سب کو ٹھکراتے ہوئے کہتا ہوں: "نرگس کے پھولوں اور رفتو ہر کے کانٹوں کا کیا مقابلہ! جاؤ۔ یہ شکاری اِنہیں صحراؤں میں شکار کھیلے گا ——— جاؤ!" اور اُن لڑکیوں کو ٹھکرانے کی دُھن میں میں نے کئی بار چلتے چلتے ریت کا ایک طوفان اُڑا اُڑا دیا!

میں واپس سوسن پہنچا۔ اور جب برات کے جانے کی تیاریاں ہونے لگیں تو اُداس سُنبل نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

میں مسکراتے ہوئے کہنے لگا: "میں تمہارے ساتھ سمن میں چند روز رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے تم جیسا سادہ مزاج اور پیارا دوست کہیں نہیں ملا۔ اور تمہارے ہمراہ چند لمحے گزار کر مجھے روحانی خوشی ہو گی۔"

اور سُنبل خوش ہو کر بولا: "آپ میری آنکھوں پر رہیئے۔ میرا گھر آپ کا گھر ہے۔ آپ شوق سے تشریف لایئے۔"

اور میرا بوڑھا ملازم تڑپ کر کہنے لگا: "لیکن میاں جی۔ وہ میری بڑھیا بچاری کھاٹ پر پڑی ایڑیاں رگڑ رہی ہو گی میرے بغیر اُسے پوچھنے والا ہی کوئی نہیں۔ پھر اس صحرا میں ہرنیاں تو اب کے ملتی نہیں۔ کہ وقت گزر سکے۔"

میں نے اُس کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا: "ملتی ہیں۔ لیکن تم خوشی سے واپس چلے جاؤ۔ میرے ساتھ تم کہاں ریت پھانکتے پھرو گے۔ کتوں کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ میں سُنبل بھائی کے ساتھ چند روز رہ کر واپس آجاؤں گا۔"

اور بوڑھا یوں جھکا کر اور پتلیاں پھیر کر مجھے یوں گھورنے لگا جیسے کہ رہا ہے "تن بچے۔ تم پر بھُوت پریت کا اثر ہو گیا ہے۔ اور اب تُم پر میرا بس نہیں چل سکتا۔ خدا ہی تمہیں واپس لائے تو لائے!"

اور جب برات واپس سمن کو روانہ ہوئی تو سب نوجوان باراتیوں نے میری طرف اشارے کرتے ہوئے سُنبل سے آکر پوچھا۔ "کیا آپ بھی سمن جا رہے ہیں؟" ——— "ہاں" وہ فخریہ انداز میں جواب دیتا اور سب ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے اور کہتے: "بڑی خوشی کی بات ہے!" ——— اور اُدھر سُنبل کے اُونٹ پر جھولتے ہوئے کجاوے میں میں نے نرگس کو دیکھا جس کا چہرہ تیز دھوپ میں کُندن کی طرح دمک رہا تھا اور جس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی جو شاید صبح کے ستارے کی کپکپاہٹوں سے مل کر بنی تھی!

اُس روز مجھے معلوم ہوا کہ شاعر بے چارے جھُوٹ نہیں لکھا کرتے۔ بالکل سچ کہتے ہیں۔ اُن کے خیالات میں غلو کا نقص نکالنے والے ذرا کسی ایسے کجاوے کے سائے میں چل کر دیکھیں جس پر ایک پیکرِ شباب بیٹھی جھُول رہی ہو۔ تو اُنہیں اپنے معتقدات کی قدر و عافیت معلوم ہو جائے۔ میں چاہتا تھا کہ اس کجاوے کے ساتھ مرتے دم تک سفر کرتا رہوں اور پھر یوں ہو کہ یہ اُونٹ اپنے قافلے سے الگ ہو کر بھٹک جائے۔ بے شمار ٹیلوں کے سنسناتے ہوئے بیکراں میدان میں یہ کجاوے والی نیچے اُترے اور وہاں ہم چاندنی راتوں اور سیمیں صبحوں کے آغوش میں ایسی میٹھی میٹھی باتیں کریں جو شاعر لوگ اپنے شعروں میں لکھا کرتے ہیں اور پھر اچانک مجھے سُنبل کا خیال آگیا۔ اس اونٹ کے بھٹک جانے سے

سُنبل بے چارے پر کیا گزر جائے گی؟ سر پھوڑے گا کسی دیوار سے! دیوانہ ہو جائے گا اور تپتی دوپہروں میں دھکتی ریت پر ننگے پاؤں مجھے تلاش رہے گا اور کسی اداس شام کو، جب —— لیکن اچانک مجھے سُنبل کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ گا رہا تھا۔

تمہارا چہرہ دن کے چاند کی طرح بے رنگ اور بے رونق
کیوں ہے؟ تمہارے بالوں پر یہ گرد اور تمہاری پلکوں پر
یہ نمی کیسی ہے! تمہاری چال میں یہ مُردنی اور تمہاری
باتوں میں یہ ناامیدیاں کیسی ہیں؟ تم یہ کیوں نہیں کہ دیتی
کہ تم نے کہیں میری موت کا فرشتہ دیکھ لیا ہے!

اُونٹوں کی گھنٹیاں ٹنا ٹن بجی جا رہی تھیں۔ اور اُن کے قدم ریت پر ہلکی سی کُھس پُھس کی آواز پیدا کرتے ٹیلوں کے درمیان ناچتے ہوئے بڑھے جا رہے تھے۔ کجاوے پر ایک بار میں نے نرگس کی طرف دیکھا جو سُنبل پر نظریں گاڑے کچھ سوچ رہی تھی اور جونہی اس کی آنکھیں میری آنکھوں سے ملیں تو وہ مُسکرا دی، اور میں سمجھا جیسے یہ اُونٹ اپنے قافلے سے بھٹک گیا ہے!

سمن بہت پیارا گاؤں تھا۔ پچاس ساٹھ گھروندے اور پھر سارے گاؤں کو محیط کئے ہوئے لمبی لمبی کھجوروں کی فصیل! —— ان کھجوروں کے آس پاس کھیت تھے اور کھیتوں کی پرلی طرف وہی ریت کا سمندر! —— سُنبل مجھے اپنے گھر لے گیا۔ رنگین پایوں والے ایک پلنگ پر کھدر کی نئی چادر بچھائی گئی اور اسے ایک چھپر کے نیچے دھر دیا گیا۔ پھر سُنبل اور اس کے گھر والے میرے پاس آکر بیٹھے ہیں تو ایسی خلوص بھری باتوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے کہ میرے جی میں آئی میں یہاں سے کھسک کر نرگس کے پاس چلا جاؤں اور اسے کہوں "نرگس میں نے غلطی کی کہ تمہارے سامنے یہاں سے کبھی نہ جانے کا وعدہ کر بیٹھا۔ تم دراصل سُنبل کی ہو جاتیں تو اچھا تھا۔ سادہ اور اتنا مخلص ہے۔ اور میں غاصب نہیں بننا چاہتا۔ میں پڑھا لکھا نوجوان ہوں اور جانتا ہوں کہ کسی کے دل میں بے وجہ سُوئی چبھونے سے یہی بہتر ہے کہ اپنے دل پر نشتر چلا لیا جائے۔"

لیکن اُس روز شام ہونے سے چند لمحے پیشتر میں سُنبل کے گھر سے نکلا کہ ذرا کھیتوں میں ٹہل آؤں، تو دُور کھجوروں کی فصیل کی اوٹ میں مجھے نرگس دکھائی دی، میں اُس کے قریب سے گزرا تو وہ بولی "میں کب کی یہاں بیٹھی آپ کی راہ دیکھ رہی ہوں۔ مجھے یقین تھا آپ کسی وقت وہاں سے نکلیں گے۔ یہ میرا گھر ہے اور آج رات وہ سامنے بڑے بڑے ٹیلوں میں گھری ہوئی کھجوروں تلے ملیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟"

اور جب میں نرگس سے رات کو آنے کا وعدہ کرکے اُسی بڑے بڑے ٹیلوں میں گھرے ہوئے کھجوروں کے جھنڈ تلے پہنچا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہاں ہر طرف ننھے ننھے فرشتے پھڑ پھڑاتے باریک گلوں سے تیز تیز سُر نکالتے چکر لگا رہے ہیں۔ خادمائیں اور ساحر یقیناں عود و عنبر کی خوشبوئیں چھڑک رہی ہیں۔ پھولوں کی سیج بچھی ہے اور بنسریوں اور الغوزوں کی لمبی لمبی تھرتھراتی تانوں میں لپٹا ہوا یہ کُنج اپنا آغوش وا کئے مجھے اور نرگس کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے!

شام کو نہایت پُرتکلف کھانا کھا کر میں سُنبل اور اس کے بزرگوں کو شہروں کی باتیں سُناتا رہا۔ ریڈیو۔ ٹریون۔ بجلی کی روشنیوں اور آپی آپ اُوپر اُڑ جانے والے لٹوں کی باتیں سُن کر وہ میرے نزدیک کھسکتے آئے۔ ایک میراثی میری پیٹھ دبانے پر مامور ہو گیا۔ حقے کی نے اِدھر اُدھر تیزی سے پھرتی ہوئی بار بار میرے لبوں کو چھونے لگتی اور بہت دیر تک وہیں رُکی رہتی۔ اور سُنبل پل پل بھر بعد مجھ سے پُوچھ لیتا۔ "آپ کو نیند تو نہیں آئی۔ آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟ آپ گھبرا تو نہیں گئے؟" —— اور یہ کہہ کر وہ چُپ چاپ سر جُھکا کر بیٹھ جاتا اور جب کبھی اِدھر اُدھر دیکھتا تو سامنے دیوار پر ایک کیل سے لٹکی ہوئی لالٹین کی زرد شعاعوں میں مجھے اُس کی پلکوں اور رخساروں پر ایک مبہم سی چمک نظر آ جاتی!

جب سب اپنی اپنی کھاٹوں پر جانے کے لئے اُٹھنے لگے تو میں نے سُنبل سے کہا "میں ذرا باہر کھیتوں میں گھوم گھام آؤں۔ میں دراصل سیر سپاٹے کا بہت عادی ہوں۔ اور دن بھر کے سفر سے بھی میرا جی سیر نہیں ہوا"

اور سُنبل نے پُوچھا "کیا میں بھی چلوں آپ کے ساتھ؟"

اور میں گھبرا کر بولا "نہیں نہیں۔ تم نے کونسا گناہ کیا ہے کہ مجھ دیوانے کے ساتھ ٹانگیں نکالتے پھرو۔ میں ابھی لوٹ آؤں گا!"

اور جب میں نے کھیتوں کی مینڈھوں پر سے گزر کر کھجوروں کے

اُس فردوسی جُھنڈ کا رُخ کیا تو کوئی پرندہ سن سے میرے سر پر سے گزرا اور کھجوروں کے جھنڈ کے ساتھ ٹکرا کر پھڑپھڑاتا اندھیرے میں ڈوب گیا!

کھجوروں کے منقش تنوں کے درمیان نرگس میرے انتظار میں تھی بہت دیر تک بیٹھے ہم عجیب غریب باتیں کرتے رہے۔ میں اُسے کہتا "نرگس یہ تمہارے بال نہیں۔ یہ تو میری تقدیر کا تانا بانا ہے!" اور وہ کہتی "غضنفر دادیعام کہتے ہوئے اُس کی زبان کئی بار لڑکھڑاتی" یہ تمہاری آنکھیں نہیں یہ تو مستیوں کے دو چشمے ہیں جنہوں نے مجھے اس قدر جھکا دیا ہے" میں کہتا "نرگس یہ تمہارے پاؤں ہیں یا کنول کے پھول جن پر شفق کا عکس پڑ رہا ہے" اور وہ بولی "غضنفر۔ یہ تمہارے ہاتھ گوشت پوست کے بنے ہوئے ہیں یا کمخواب کے!" —— اور اس کے بعد جب میں نے اُسے شہروں کی باتیں سنائیں تو میرے بہت قریب کھسک آئی۔ اپنا سر میرے شانے سے لٹکا دیا اور بہت دیر تک ریڈیو۔ ٹرمیوں۔ بجلی کی روشنیوں اور آپی آپ اُٹھ جانے والے لِفٹوں کے حالات سن کر وہ دم بخود رہ گئی ——۔ پھر ہم ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے اور جب میں سنبل کے مکان کے قریب ایک موڑ مُڑا تو اچانک سُنبل میرے بالمقابل آگیا۔ "بہت دیر لگا دی آپ نے!" اُس نے کہا۔

"ہاں بہت دیر ہو گئی!" میں نے رُکتے رُکتے جواب دیا۔ "دراصل مجھے ریت پر بہت رات گئے تک بیٹھے رہنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ شہروں میں اس قسم کی ریت اور خاموش راتیں اور کھلے میدان نہیں ہوتے نا —— لیکن تم کہاں پھرتے رہے؟"

اور اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر کا رُخ کرتے ہوئے کہا "میں بھی اُدھر اس کھجوروں کے جھنڈ کے پاس پھرتا رہا۔"

"کس جُھنڈ کے پاس؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

اور وہ مشرق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "اُدھر۔ اُس جھنڈ کے پاس!"

اور میں نے جی ہی جی میں خدا کا شکر ادا کیا کہ ہمارا جھنڈ مغرب کی طرف تھا!

جب تین راتیں کھجوروں کے اُس فردوسی جھنڈ کے نیچے دفن ہو چکیں اور چوتھی رات کا آغاز تھا —— اور جب میں نرگس کے زانو پر سر رکھے اُسے اختر شیرانی کی ایک نظم کا مطلب ذہن نشین کرا رہا تھا تو ایک قد آور سایا ہمارے سامنے آکھڑا ہو گیا۔ ہم دونوں بھڑک کر اُٹھے اور ہمارے سر ٹکرا گئے۔ میں نے خوفزدہ ہو کر پوچھا "کون ہے تو؟"

"میں سُنبل ہوں" وہ بولا "اور یہ نرگس اور آپ غضنفر علی خاں ہیں"

اور وہ قریب آکر ایک ہاتھ میرے کاندھے پر اور دوسرا نرگس کے کاندھے پر رکھتے ہوئے بولا "لیکن آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں میں آپ کو کوسنے نہیں آیا۔ میں آپ سے صرف ایک بات کرنے آیا ہوں۔ آپ جانتے ہیں نرگس نے مجھے شاعر بنایا۔ نرگس نے میری اُجاڑ راتیں بسائیں۔ نرگس نے میری زندگی پر خوابوں کی پھواریں برسائیں آپ سب کچھ جانتے ہیں کیونکہ آج چوتھی رات ہے۔ میں ان تنوں کی اوٹ میں آپ دونوں کی باتیں سُنتا رہا ہوں۔ آپ میرے دوست ہیں۔ اور گو یہ آپ کا حق نہ تھا کہ میری محبوبہ کو ہتھیا لیتے لیکن اب —— کہ نرگس سُنبل سے تھک چکی ہے۔ میں اپنی یہ امانت آپ کے سُپرد کرتا ہوں۔ میں غیور دہقان ہوں۔ میں چاہتا تو آپ کے کلیجے سے ایک کُند چھرا پار کر کے آپ کو انہیں ٹیلوں پر پھینک دیتا اور وحشی گدھیں آپ کی بوٹیاں نوچ نوچ کر آپ کے شہر پر جا کر منڈلاتیں لیکن میں شاعر ہوں، میں گیت بناتا ہوں۔ اور میں صرف اپنی محبت کی تشنگی بجھانے کا قائل نہیں۔ مجھے ہر دل کی دھڑکن کی قدر ہے، نرگس سے آپ کو محبت ہو گئی ہے۔ تو اس میں آپ کا قصور نہیں۔ میں اگر آپ کی محبت میں دخل دوں تو یہ میرا پاگل پن ہو گا کیونکہ نرگس کے دل میں اب میری کوئی جگہ نہیں رہی۔ لیکن اتنا یاد رکھیئے۔ کہ آپ پردیسی ہیں مسافر ہیں آپ۔ نرگس کا دل نہ توڑیئے گا، اگر نرگس کا دل آپ کے ہاتھوں ٹوٹا تو یاد رکھیئے کہ —— لیکن چھوڑیئے اس قصے کو۔ میں صرف اپنی نرگس کو آپ کے حوالے کرنے آیا تھا۔ میں اپنے دوست اور اپنے مہمان پر ہاتھ اُٹھانا گناہ سمجھتا ہوں۔ اس لئے نرگس بیٹھ جاؤ یہاں اور غضنفر علی خاں کا سر اپنے زانو پر رکھ لو۔ اور غضنفر علی خاں صاحب۔ آپ اسے کسی شاعر کی نظم کا مطلب سمجھا رہے تھے سمجھایئے۔ اور اب مجھے اجازت دیجئے۔ اور میری اس مداخلت کو بُرا نہ مانیئے کہ جب جلتی ہوئی لکڑیوں پر پانی ڈالا جائے تو اُن میں سے جو دھواں اُٹھتا ہے وہ کڑوا ہوتا ہے —— اچھا خدا حافظ"

ہم دونوں دم بخود کھڑے تھے۔ اور سُنبل ہولے ہولے چلتا کھجوروں کی فصیل میں غائب ہو گیا تھا۔ کتنی دیر تک ہم نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کی۔ اور جب نرگس کی سسکیاں بلند ہو گئیں اور میرے دل کی دھڑکن سے کھجور کے تنے بھی لرزتے ہوئے معلوم ہوئے تو میں دھم سے ریت پر بیٹھ گیا۔ نرگس بھی بے جان لوتھڑے کی طرح گر پڑی ——— وہ روتی رہی ——— میں سوچتا رہا ——— اور جب اس نے روتے روتے اپنا سر میرے شانے سے لگا دیا تو میں نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ سُنبل انسان ہے یا فرشتہ! ——— اور نرگس ہم جاگ رہے ہیں یا خواب دیکھ رہے ہیں؟" ——— اور وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی: "ہم جاگ رہے ہیں اور یہ سُنبل ہی تھا جس نے اپنی محبت کی نعش کو اپنے ہاتھوں کفنایا ——— لیکن میں کیا کروں غضنفر۔ میں مجبور ہوں۔ تم اتنے اچھے۔ اتنے پیارے ہو ——— اور مجھے تم سے اور تمہارے وطن سے اتنی محبت ہے! ———"

(۲)

چکاچوند

جلد ہی وہ بادل چھٹ گئے جو سُنبل کا سایا ہم پر پھیلا گیا تھا۔ اور جب میں نرگس سے جُدا ہو کر سُنبل کے مکان کے قریب پہنچا تو سوچنے لگا کہ میں کیا منہ دکھاؤں اپنے میزبان کو! جی میں آئی چلد دوں یہاں سے لوٹ جاؤں اپنے شہر کو۔ لیکن ایک ابابیل کھجوروں کے اُسی فردوسی جھنڈ سے اُڑتی ہوئی آئی اور سن سے میرے سر پر سے گزر گئی ——— یہیں سے واپس چلے جانا میرے لئے بہت دشوار تھا ——— اور جب سُنبل نے اتنی بڑی قربانی کی تو اب اُس سے جھجک کیسی ——— جب اُس کا من اتنا صاف ہے تو اپنے من پہ یہ میل کیسا! ——— اور جب میں اُس کے مکان کے دالان میں داخل ہُوا تو وہ کھاٹ پر اُٹھ بیٹھا اور بولا: "آپ آ گئے؟ ——— آپ نے میری باتیں محسوس تو نہیں کیں! آپ میرے بھائی ہیں اور یقین جانئے میں آپ پر خفا نہیں ——— میں جس امانت کا بوجھ نہ اُٹھا سکا وہ آپ کے حوالے کر دی اور اب آپ کے ہاتھ میں میری امانت کی لاج ہے!"

میں خاموش بستر پر لیٹ گیا اور دیر تک حیران ہوتا رہا کہ یہ عجیب و غریب دنیا ہے یہاں ایک دوسرے کی محبت کی اس درجہ قدر کی جاتی ہے۔ اور یہ ...... عجیب نوجوان ہے جس نے اپنے جذبات کا تنور اپنے سینے میں چھپا لیا ہے ——— چنک رہا ہے لیکن دم نہیں مارتا!

اور اب یہ سلسلہ شروع ہُوا کہ جب رات کو سب لوگ سو جاتے تو وہ کہتا: "بھائی صاحب ——— آپ ابھی تک باہر نہیں گئے؟" میں شرمندہ اور حیران باہر چلا آتا اور جب لوٹتا تو وہ کھاٹ پر سے اُٹھتے ہوئے کہتا۔ "آ گئے آپ؟ کسی چیز کی ضرورت ہے؟"

ایک مہینہ گزر گیا۔ ہر رات نرگس کی زُلفیں میرے بازوؤں پر پریشان ہو جاتیں۔ اُس کے نرم زانوؤں پر سر رکھ کر میں دیر تک کھجوروں کی شاخوں میں اُلجھے ہوئے ستاروں کو دیکھتا رہتا۔ اب ہم باتیں بہت کم کرتے تھے۔ کیونکہ ہم وہ سب حسین خیالات ایک دوسرے کے سامنے اُگل چکے تھے جو عشق و محبت کے عام قصّوں میں استعمال کئے جاتے ہیں اور اب ایک شب ایسی بھی آئی کہ جب میں کھجوروں کے اُس جھنڈ کے قریب پہنچا تو مجھے اُس کے اِردگرد پھڑپھڑاتے ہوئے چمگادڑوں والے خوفناک بھتنے وحشیانہ ناچ میں مصروف نظر آئے اور کھجوروں کی شاخیں مُردوں کے پنجروں کی طرح فضا میں ہولے ہولے جھولتی دکھائی دیں۔ میرے قدموں میں وہ تیزی نہ تھی۔ میری رگوں میں وُہ کھولاؤ نہ تھا۔ میں رینگتا ہُوا جھنڈ کے پاس پہنچا۔ نرگس میری منتظر بیٹھی تھی۔ بولی: "تم نے آج اتنی دیر کیوں لگا دی؟ تکتے تکتے میری آنکھیں پتھرا گئیں۔ تم آج تھکے تھکے کیوں ہو اور تمہارے چہرے پر یہ اُداسی کیوں ہے؟ غضنفر تم آج کیا سوچ رہے ہو؟"

حقیقت یہ ہے کہ اب میں نرگس سے تھک چکا تھا۔ فطرتِ انسانی سکون کی شیدائی ہوتے ہوئے بھی ایک خاص وقت میں سکون سے فرار بھی چاہتی ہے۔ مجھے اب اُس کے نرم زانوؤں میں فولاد کی سی سختی محسوس ہونے لگی۔ اور جب اُس کے بال میری باہوں پر لہراتے تو میرے جسم میں ایک پھریری سی دوڑ جاتی جیسے چیونٹیاں رینگ رہی ہیں! یہ عجیب زندگی ہے۔ میں اُس روز سوچتا رہا۔ کہ دن بھر اجنبی دہقانوں کے جمگھٹ میں بیٹھ کر فضول گپیں ہانکو اور رات۔ ایک اجنبی لڑکی کی خاطر اِس ہولناک صحرا میں۔ اِن ڈراؤنی کھجوروں کے جھنڈ میں

گزار دو۔ نہ سینما۔ نہ ریڈیو۔ نہ چاندنی چوک اور نہ کناٹ سرکس۔ نہ ہمایوں کا مقبرہ اور نہ جامع مسجد کی سیڑھیاں! یہ ایک جیسے ٹیلے ـــــ تیز دھوپ اور پھر رات کو یہ ایک سی لڑکی ـــــ روزانہ وہی بال۔ وُہی باہیں وہ آنکھیں ـــــ اور ان سب پر مستزاد یہ کہ وُہی باتیں! چھوڑی ہوئی بڑیاں۔ ہر وقت جان کا خوف، اور پھر ایک اداس اور تھکی ہوئی بھیگی آنکھوں والا چُپ چاپ میزبان جو نہ پہلے کی طرح گاتا ہے اور نہ قہقہے لگا کر ہنستا ہے ـــــ اور یہ دیہاتی چھوکری ـــــ یہ مجھ سے محبت نہیں کرتی۔ میرے وطن سے۔ نئی تہذیب کے اُس گہوارے سے محبت کرتی ہے جہاں اُس کے زعم میں غضنفر بغیر کسی خوف کے بازار کے عین درمیان کھڑا ہو کر اُس کے لب چوم سکتا ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ وہ اکثر کہا کرتی ہے ـــــ "تم مجھے اپنے وطن لیجاؤ گے نا! تم مجھے ٹریموں پر سوار کراؤ گے۔ تم مجھے ریڈیو سناؤ گے۔ سینما دکھاؤ گے۔ نئے نئے کپڑے خرید دو گے۔ میرے کانوں میں سونے کے بُندے ہوں گے اور باہوں میں ہاتھی دانت کا چُوڑا ـــــ ہے نا؟"

مجھے اُبکائیاں آنے لگیں۔ میں انگڑائیاں لینے لگا۔ میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو گئیں۔ میں تھک چکا تھا۔ مجھے اردگرد ٹھہرے ہوئے پانی کی بُو سی آنے لگی۔ اُس روز جب نرگس نے میری اُداسی کی وجہ پوچھی تو میں بولا: "دراصل نرگس مجھے شکار کا بہت شوق ہے۔ ایک مہینے سے میں نے کوئی نیا شکار نہیں کیا۔ کہو تو کل شکار پر چلا جاؤں! دو چار دن کے بعد لوٹ آؤں گا۔ اور پھر تجھے اپنے دیس لے جاؤں گا۔ جہاں ہر کام بجلی کے زور سے ہوتا ہے۔ عمارتوں پر چڑھنے کے لئے سیڑھیوں کی ضرورت نہیں۔ بٹن دباؤ اور کھٹ سے اُوپر ـــــ دُور جانے کیلئے پیدل چلنے کی ضرورت نہیں۔ موٹر میں بیٹھو اور چپاک سے وہ جا پہنچے ہیں ـــــ نئے کپڑے خرید کے درزی کی دکان کے چکر کاٹنے کی ضرورت نہیں، سلے سلائے جمپر اور ساڑھیاں خرید دو اور پل میں دلہن بن جاؤ ـــــ چلو گی نا؟"

لیکن وہ تو موم کی مورت بن کر بیٹھی تھی۔ میں نے شانہ ہلایا تو رونے لگی۔ میں نے جھلا کر کہا: "عجیب بات ہے! میں اب ساری عمر اس جھنڈ تلے کیسے تنہا منتظر رہوں! محبت کے علاوہ انسان کو دوسرے کام بھی ہوتے ہیں۔ میرے ماں باپ ہیں۔ بھائی بہن ہیں۔ میرے قیمتی شکاری کتے ہیں۔ اُن کی فکر کرنا بھی مجھ پر فرض ہے۔ شکار بھی کھیلنا ہے۔ اور پھر لوٹ آؤں گا۔ یہاں ـــــ یہاں سے کبھی نہ جانے کا جو میں نے وعدہ کیا تھا اُس کا یہ مطلب تو نہ تھا کہ بس یہیں جم کر بیٹھ رہوں گا ـــــ ابھی یہی آٹھ دس دن لگیں گے۔ پھر یہی جھنڈ ہو گا اور یہی غضنفر ہو گا۔ اور ـــــ، ـــــ" لیکن وہ بدستور روتی رہی۔ اُس کے چند آنسو میرے ہاتھ پر آگرے اور میری ہتھیلی پر جیسے کسی نے تیزاب چھڑک دیا ہے گھبرا کر اُٹھا: "اچھا تو نرگس۔ آج اتوار ہے نا؟ اگلی اتوار کو اسی وقت یہیں موجود رہنا۔ میں ضرور آؤں گا۔ سُنتی ہو؟ ـــــ اچھا" ـــــ میں اس کے ہاتھ کو تھپکا کر جھنڈ سے باہر نکل آیا۔ لیکن وہ وہیں بیٹھی رہی اور جب بہت دیر کے بعد اُٹھی تو نہایت تیزی اور وحشت سے! ـــــ قدم یوں اُٹھائے جیسے اُڑ جائیگی ـــــ اُس کے ہر قدم پر ریت یوں اُڑنے لگی۔ جیسے اُس روز میں نے نرگس سے پہلی ملاقات پر پَو پھٹے اُڑائی تھی!

دُوسرے روز علی الصباح میں نے سُنبل سے شکار کے بہانے سے اجازت مانگی۔ اُس کی بھیگی ہوئی آنکھیں میں چمک سی پیدا ہو گئی۔ اور لاشعوری طور پر میری انگلیاں دباتے ہوئے بولا: "آپ واپس آئینگے؟ آپ سیدھے اپنے وطن کا رُخ تو نہیں کر لیں گے؟"

"نہیں نہیں" میں نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا: "یہ بھی کبھی ہو سکتا ہے! بس ہفتہ بھر کے لئے اِدھر اُدھر گھوم گھام کر واپس آجاؤں گا۔ صحرائی دیہات میں میرے بہت سے شناسا ہیں جن سے مل کر جلد لوٹوں گا۔ میں تمہیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں ـــــ تم تو سب کچھ سمجھتے ہو!"

"جی ہاں!" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا: "سب کچھ سمجھتا ہوں اسی لئے تو کہہ رہا تھا کہ جلد لوٹیے گا!"

اور جب میں صحن سے نکلا تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا جیسے کوئی تتلی کسی بچے کی ڈبیا میں بہت دیر تک قید رہتی ہے اور جب اُس زنداں سے نکلتی ہے تو یوں تیز اور سیدھی پرواز کرتی ہے۔ جیسے کائنات کے آخری سرے پر جا کر دم لے گی!

شام کو میں ایک اسٹیشن پر پہنچا۔ دہلی کا ٹکٹ لیکر گاڑی پر سوار ہوا

صبح سویرے حویلی جا اُترا۔ اپنے بالا خانے پر پہنچا تو کتے میرے قدموں میں لوٹنے لگے۔ میرا بوڑھا ملازم مُنہ کھولے بھویں لٹکائے مجھے گھُورنے لگا: "آپ گھبرائے ہوئے ہیں! آپ ہانپ کیوں رہے ہیں؟ آپ ——— آپ ——— میں ابھی پیر جی سے کوئی تعویذ گنڈا لاتا ہوں۔ میں نہیں کہتا تھا آپ پر بھوت پریت کا سایا پڑ گیا ہے!"

میں نے زور سے قہقہہ لگایا اور ہنستا ہُوا اُوپر بالا خانے پر آیا ذرا اچانک رنگین شیشوں کی پرلی طرف انکم ٹیکس افسر صاحب کی ایک لڑکی میرے کمرے کی طرف یوں دیکھتی نظر آئی جیسے اُس نے یہاں سے کوئی عجیب غریب آواز سن پائی ہے۔ میرے قہقہے رُکے تو وہ آنکھیں جھپکانے لگی اور جیب میں نے تازہ ہوا کے بہانے سے کھڑکی کھول دی کہ اب مجھے لڑکیوں سے وہ پہلی جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی ——— تو وہ جھٹ دیوار کے پیچھے چھپ گئی۔ لیکن دیوار میں بے شمار رخنے تھے جن میں سے میں نے دیکھا کہ وہ میری طرف دیکھ رہی ہے! جگنو سے چمکنے لگے میرے دل میں! ——— زندگی تغیرات کا نام ہے اور خشک کھجوروں کی اوٹ میں بیٹھی ہوئی چھوکری سے اینٹوں کی اس دیوار کے پیچھے دبکی ہوئی نیم پوشیدہ لڑکی کتنی پیاری معلوم ہوتی ہے۔ میں نے کاغذ کے ایک پُرزے پر "مزاج شریف" کے الفاظ لکھے اور ایک کنکر پر لپیٹ کر پرلی چھت پر پھینک دیا۔ میں نے کھڑکی بند کر دی کیونکہ اب ملازم کُتّے باندھ کر میرے بُوٹ اُتارنے آرہا تھا۔ وہ میرے پاس آکر بیٹھا ہی تھا کہ اچانک کٹاک سے ایک رنگین شیشہ کرچی کرچی ہو کر فرش پر بکھر گیا اور ایک کاغذ میں لپٹا ہُوا کنکر میری کنپٹی پر آن گرا۔ "کون بے وقوف کا بچہ ہے!" میرا نوکر چنگھاڑتا ہوا کھڑکی کی طرف لپکا۔ "کون ہے اپنی ماں کا لاڈلا" ——— اور پھر اچانک پاؤں پکڑ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ شیشے کا ایک ٹکڑا اُس کے پاؤں میں چُبھ گیا تھا۔ بلبلاتا اور پتھر پھینکنے والے کو ہزاروں صلواتیں سُناتا وہ سیڑھیاں اُتر گیا۔ میں نے کنکر پر سے کاغذ اُتارا۔ نسوانی طرزِ تحریر میں لکھا تھا ؎

مزاج پوچھ کے رگ رگ میں بجلیاں بھر دیں
وہ آئے تھے میرے دل کی لگی بجھانے کو

"با مذاق معلوم ہوتی ہے!" میں نے چٹخنی کھولتے ہوئے سوچا۔ ہاتھ کے اشارے سے میں نے اُسے شعر کی رسید پہنچائی تو وہ کھڑی ہو گئی بہت دیر تک مجھے دیکھتی رہی جیسے کہ رہی ہے: "میری سب بہنوں کی شادی ہو چکی ہے اور میں یہاں تنہا رہ گئی ہوں، میرا یہاں اکیلے جی نہیں لگتا۔ مجھے ایک ساتھی کی تلاش تھی اور میں حیران تھی کہ تم اتنے عرصے سے ان رنگین شیشوں میں سے نہیں جھانکتے۔ میں تمہاری راہ دیکھ رہی تھی شکر ہے تم آگئے ——— شکر ہے ——— شکر ہے!" ——— اور پھر اُس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے اور وہ آنچل سے اپنا چہرہ چھپاتی پرے چلی گئی ——— دیوار کے رخنے سے میں نے اُس کی اُونچی ایڑی کی گرگابی دیکھی اور میں سمجھا جیسے وہ اُونچی نکیلی ایڑی میری پسلیوں کو چھُتاتی میرے دل میں دھنسی جا رہی ہے!

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کنکر پھینکنے کا سلسلہ دو چار روز جاری رہا اور ساگل، تیوار کی ایک دھندلی چاندنی رات کو میرا بالا خانہ لونڈر کی خوشبو سے لبریز ہو گیا۔ اونچی ایڑی والی گرگابی جب میرے کمرے کے فرش پر پڑی تو میرے دل میں بے شمار شمعیں سی جھلملا اُٹھیں۔ سنہرے بال بازوؤں پر بکھر گئے۔ اور کھجوروں کے آسیبی سائے سرسراتے ہوئے خشک بالوں، پپڑیاں جمے ہونٹوں اور فولادی زانوؤں والی ایک چھوکری کو ساتھ لئے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے نکلتے جانے کدھر گم ہو گئے۔

دوستوں کی محفلوں میں میرے قہقہے بلند ہو گئے اور میرے سب احباب حیران ہونے لگے کہ لڑکیوں سے کترانے والا اور جنسی تعلقات کا موضوع چھیڑنے پر آنکھیں بند کر کے کارل مارکس کے اقوال گنگنانے والا خشک غضنفر اب ساقِ سیمیں اور عارضِ گلگوں، اور کاکلِ عنبر فشاں اور تبسمِ شرر بار کی باتیں کرنے میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتا ہے اور یہ کیا وجہ ہے کہ اِسے جوشؔ کے سارے "نقش و نگار" اور اخترؔ کی ساری سلمائی نظمیں اور حافظؔ کے سارے خمریات ازبر ہو گئے ہیں ——— جی ہاں ——— وہ بے چارے یہ نہ سمجھ سکے کہ مرغابیوں اور ہرنیوں کا شکاری اب کجاوے میں جھُولتی ہوئی اور بھونڈے زیوروں سے لدی پھندی لڑکیوں اور اُونچی ایڑی کی گرگابیوں اور لونڈر میں بسی ہوئی زلفوں والی مسوں کا شکار کھیلتا ہے۔

میرا بوڑھا شکاری ملازم روزانہ دس بار مجھ سے کہتا: "آپ شکار پر کب جائیں گے، اب بڑھیا تو مر چکی جس کی مجھے فکر رہتی تھی۔ اب میں

آپ کے ساتھ رہوں گا۔ کتے بھی تیار ہیں اور آجکل شکار بھی عام ملتا ہے۔"

اور میں مسکرا کر کہتا: "کتّے بیچ دو، شکار کا ذکر چھوڑو۔ سامنے کھڑکی کے شیشے صاف کرو۔ اب میں شکار پر نہیں جاؤں گا۔ میں آجکل بہت مصروف ہوں!"

اور پھر اچانک اس شکاری کے سر پر ایک بادل زہرہ گداز کڑک پیدا کرتا ہوا اُبھرا۔ اور ایسی ژالہ باری ہوئی کہ میرے کھیت ڈھکے گئے ٹیلے چڑھ آئے اور پگڈنڈیاں مٹ گئیں!

(۳)

دُھندلکے

میرا نیا شکار خلافِ معمول دو تین روز میرے پاس نہ آیا۔ اور میں ساری رات بالاخانے کی کھڑکیوں اور سیڑھیوں کو دیکھ دیکھ کر ترستا رہا۔ اور جب ایک شام کو میں ہمایوں کے مقبرے پر سیر کو گیا تو ایک کنج میں مجھے ایک بنچ پر وہ ایک نوجوان کے زانو پر سر رکھے بیٹھی نظر آئی۔ وہ کہہ رہی تھی: "کون کہتا ہے کہ اپنے منگیتر سے شادی سے پہلے ملنا خلافِ تہذیب ہے۔ لیکن تم اپنے دوستوں میں یہ باتیں نہ کرنا۔ کہ پرسوں منگنی ہوئی اور کل سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ کہیں گے میں کوئی اوچھی لڑکی ہوں!"

"پگلی!" ——— ہنستے ہوئے نوجوان نے جواب دیا۔

اور اچانک کھجوروں کے سائے سرسراتے ہوئے، لہراتے ہوئے بالوں، نارنجی ہونٹوں اور گداز زانوؤں والی ایک دوشیزہ کو ساتھ لئے کہیں سے آئے اور میرے دماغ کے ارد گرد قیامت خیز تیزی سے گھومنے لگے!

لڑکھڑاتا ہوا میں وہیں سے دہلی اسٹیشن پر پہنچا۔ صبح سویرے میں اُسی ننھے اسٹیشن پر جا اُترا اور پھر سمن کا رُخ کر لیا۔

تیز دھوپ کی وجہ سے ٹیلے تپ رہے تھے اور ہر طرف ایک بھاپ سی اُٹھ رہی تھی۔ دہکتی ہوئی ریت میرے جوتوں میں بھر گئی۔ لیکن میں حیران و ششدر، پریشان و پشیمان چلتا گیا ——— چلتا گیا ——— اور جب سورج مغربی ٹیلوں کی اوٹ میں غروب ہو گیا۔ تو اچانک پورب کی طرف سے ایک آندھی اُٹھی۔ اور آن کی آن میں چار طرف چھا گئی۔ میری آنکھوں میں ریت بھر گئی۔ میرا لباس پھڑپھڑانے لگا۔ میرے قدم اُکھڑ اُکھڑ گئے۔ بگولے شور کرنے لگے اور کوئی ان دیکھے ہاتھ لپک لپک کر میرے گلے کو اس زور سے دبانے لگے کہ میرا دم گھٹ گیا۔ میں بے دم ہو کر ایک جگہ گر گیا کہ اچانک تند جھونکوں کی پُرخوف چیخوں میں مجھے ایک گیت سُنائی دیا:—

آندھیو۔ اور زور سے چلو اور کائنات کو جڑوں سے اکھیڑ کر فضا میں لڑھکا دو۔

طوفانو۔ چیختے ہوئے آؤ اور کھجوروں کے جُھنڈ اپنے شانوں پر رکھ کر اُفق پر غائب ہو جاؤ۔

گھٹاؤ۔ ژالہ باری کرو۔ اور سمن اور سوسن کی چراگاہیں دھنک کر رکھ دو۔

کیونکہ اے آندھیو، طوفانو اور گھٹاؤ اس دُنیا نے محبت کو ایک وقتی کھیل سمجھ لیا ہے!

میں نے آواز پہچان لی: "سُنبل۔ سُنبل۔" میں پکارتا ہوا گرجتے ہوئے طوفان میں اِدھر اُدھر دوڑنے لگا۔

اور پھر سامنے ایک اونٹ کا سایا اُبھرا۔ لپک کر میں اُس کے قریب پہنچا اور چیخا: "سُنبل، سُنبل!"

"آئیے۔ غضنفر علی خاں صاحب کہئے۔ خیریت تو ہے!"

"میں تمہیں ملنے آیا ہوں!" میں نے اُس سے لپٹتے ہوئے کہا۔ وہ بے جان بُت کی طرح کھڑا رہا اور پھر بولا: "شوق سے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی!"

"تم کہاں سے آ رہے ہو؟"

"سمن سے"

"مجھے نرگس سے بھی ملنا ہے!" میں نے کہا۔

"ملئے!" وہ اونٹ کی مہار کو اپنی انگلی کے ارد گرد لپیٹتے ہوئے بولا۔

"لیکن دیکھئے۔ وہ مصروف ہو گی۔ سورج غروب ہونے سے سورج کے طلوع ہونے تک وہ قریب قریب دس نوجوانوں سے

مفاہمت کرلیتی ہے ہم نے اُسے ایک کھلونا سمجھ کر پھینکا اور وہ ساری دنیا کے لئے کھلونا بن گئی سنبل اور غضنفر آج کل اُس کے خوابوں کے بھوت ہیں! جانیے۔ ـــــ خدا حافظ!"

اور اُس نے مُہار کھینچی اور آن کی آن میں بڑھتے ہوئے اندھیرے میں سایہ بن گیا۔ ہر طرف جھینگے ناچنے لگے اور جب میں اپنے تپتے دماغ کو دونوں ہاتھوں سے دبا کر چنگھاڑتے ہوئے اندھیرے میں ایک طرف منہ اُٹھا کر چل دیا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دل میں چمکتے ہوئے جگنوؤں کو اچانک کسی نے مٹھی میں دبا کر مسل ڈالا ہے!

سعادت حسن منٹو

ڈرپوک

میدان بالکل صاف تھا۔ مگر جاوید کو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ میونسپل کمیٹی کی لالٹین جو دیوار میں گڑی ہے اُس کو گھور رہی ہے۔ بار بار وہ اُس چوڑے صحن کو جس پر نانک شاہی اینٹوں کا اُونچا نیچا فرش ہو رہا تھا طے کر کے اس نکڑ والے مکان تک پہونچنے کا ارادہ کرتا جو دوسری عمارتوں سے بالکل الگ تھلگ تھا۔ مگر یہ لالٹین جو مصنوعی آنکھ کی طرح ہر طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی اُس کے ارادے کو متزلزل کر دیتی اور وہ اُس بڑی موری کے اُس طرف ہٹ جاتا جس کو پھاند کر وہ صحن چند قدموں میں طے کر سکتا تھا —— صرف چند قدموں میں۔

جاوید کا گھر اس جگہ سے کافی دور تھا۔ مگر وہ یہ فاصلہ بڑی تیزی سے طے کر کے یہاں پہونچ گیا تھا۔ اُس کے خیالات کی رفتار اُس کے قدموں کی رفتار سے زیادہ تیز تھی۔ راستے میں اُس نے بہت سی چیزوں پر غور کیا۔ وہ بیوقوف نہیں تھا۔ اُس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ ایک بیسوا کے پاس جا رہا ہے اور اُس کو اس بات کا بھی پورا شعور تھا۔ کہ وہ کس غرض سے اُس کے یہاں جانا چاہتا ہے۔

وہ عورت چاہتا تھا۔ عورت، خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ عورت کی ضرورت اُس کی زندگی میں یک بیک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ایک زمانے میں یہ ضرورت اُس کے اندر آہستہ آہستہ موجودہ شدت اختیار کرتی رہی تھی اور دفعتہً اُس نے محسوس کیا تھا۔ کہ عورت کے بغیر وہ ایک لمحہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ عورت اُس کو ضرور ملنی چاہیئے۔ ایسی عورت جس کی ران پر ہولے سے طمانچہ مار کر وہ اُس کی آواز سُن سکے۔ ایسی عورت جس سے وہ واہیات قسم کی گفتگو کر سکے۔

جاوید پڑھا لکھا ہوشمند آدمی تھا۔ ہر بات کی اُونچ نیچ سمجھتا تھا۔ مگر اس معاملے میں وہ مزید غور و فکر کے لئے تیار نہیں تھا۔ اُس کے دل میں ایک ایسی خواہش پیدا ہوتی تھی جو اُس کے لئے نئی نہ تھی۔ عورت کی قربت حاصل کرنے کی خواہش اس سے پہلے کئی بار اُس کے دل میں پیدا ہوئی اور اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے انتہائی کوششوں کے بعد جب اُسے نا امیدی کا سامنا کرنا پڑا تو وہ اس نتیجے پر پہونچا کہ اُس کی زندگی میں سالم عورت کبھی نہیں آئے گی اور اگر اُس نے اس سالم عورت کی تلاش میں کوشش جاری رکھی تو کسی روز وہ دیوانے کتے کی طرح کسی راہ چلتی عورت کو کاٹ کھائے گا۔

کاٹ کھانے کے ارادہ میں ناکام رہنے کے بعد اب دفعتہً اُس کے دل میں اس خواہش نے کروٹ بدلی تھی۔ اب کسی عورت کے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کرنے کا خیال اُس کے دماغ میں سے نکل چکا تھا۔ عورت کا تصور اُس کے دماغ میں موجود تھا۔ اُس کے بال بھی تھے۔ مگر اب اُس کی یہ خواہش تھی کہ وہ ان بالوں کو وحشیوں کی طرح کھینچے، نوچے، اکھیڑے۔

اب اُس کے دماغ میں سے وہ عورت بالکل نکل چکی تھی جس کے ہونٹوں پر وہ اپنے ہونٹ اس طرح رکھنے کا آرزو مند تھا۔ جیسے تیتری پھولوں پر بیٹھتی ہے۔ اب وہ ان ہونٹوں کو اپنے گرم ہونٹوں سے داغنا چاہتا تھا —— ہولے ہولے سرگوشیوں میں باتیں کرنے کا خیال بھی اُس کے دماغ میں نہیں تھا۔ اب وہ بلند آواز میں باتیں کرنا چاہتا تھا۔ ایسی باتیں جو اُس کے موجودہ ارادے کی طرح ننگی ہوں۔

اب سالم عورت اُس کے پیشِ نظر نہیں ملتی تھی —— وہ ایسی عورت چاہتا تھا جو گھس گھس کر شکستہ حال مرد کی شکل اختیار کر گئی ہو۔ ایسی عورت جو آدھی عورت ہو اور آدمی کچھ بھی نہ ہو۔

ایک زمانہ تھا جب جاوید عورت کہتے وقت اپنی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی ٹھنڈک محسوس کیا کرتا تھا۔ جب عورت کا تصور اُسے چاندنی ٹھنڈی دنیا میں لے جاتا تھا۔ وہ "عورت" کہتا تھا، بڑی احتیاط سے جیسے اُس کو اس بے جان لفظ کے ٹوٹنے کا ڈر ہو۔ ایک عرصے تک وہ اس دنیا کی سیر کرتا رہا مگر انجام کار

اُس کو معلوم ہُوا کہ عورت جس کی تمنا اُس کے دل میں ہے اُس کی زندگی کا ایسا خواب ہے جو خراب معدے کے ساتھ دیکھا جائے۔

جاوید اب خوابوں کی دُنیا سے باہر نکل آیا تھا۔ بہت دیر تک ذہنی طور پر وہ اپنے آپ کو بہلاتا رہا۔ مگر اب اُس کا جسم خوفناک حد تک بیدار ہو چکا تھا اُس کے تصوّر کی شدت نے اُس کی حسیات کی کچھ اس طرح پر نوک پلک نکالی تھی کہ اب زندگی اُس کے لئے سوئیوں کا بستر بن گئی تھی۔ ہر خیال ایک نشتر بن گیا اور عورت اُس کی نظروں میں ایسی شکل اختیار کر گئی جس کو اگر وہ بیان بھی کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا۔

جاوید کبھی انسان تھا مگر اب انسانوں سے اُسے نفرت تھی۔ اِس قدر کہ اپنے آپ سے بھی وہ متنفر ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود کو ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ اس طور پر کہ ایک عرصے تک اُس کے خوبصورت خیال جن کو وہ اپنے دماغ میں پھولوں کی طرح سجا کے رکھتا تھا، غلاظت سے لتھڑے رہیں۔

"مجھے نفاست تلاش کرنے میں ناکامی رہی ہے لیکن غلاظت تو میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ اب جی یہ چاہتا ہے کہ اپنی رُوح اور اپنے جسم کے ہر ذرّے کو اس غلاظت سے آلود کر دوں۔ میری ناک جو اس سے پہلے خوشبوؤں کی متجسس رہی ہے اب بدبودار اور متعفن چیزیں سونگھنے کے لئے بیتاب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے آج اپنے پُرانے خیالات کا چھتنا اُتار کر اس محلے کا رُخ کیا ہے جہاں ہر شئے ایک پُراسرار تعفن میں لپٹی نظر آتی ہے۔

...... یہ دُنیا کس قدر بھیانک طور پر حسین ہے!!"

نانک شاہی اینٹوں کا ناہموار فرش اُس کے سامنے تھا۔ لالٹین کی بیمار روشنی میں جاوید نے جب اُس فرش کی طرف اپنی بدلی ہوئی نظروں سے دیکھا تو اُسے ایسا محسوس ہُوا کہ بہت سی ننگی عورتیں اوندھی سیدھی لیٹی ہیں جن کی ہڈیاں جابجا اُبھر رہی ہیں۔ اُس نے ارادہ کیا کہ اس فرش کو طے کر کے نکڑ والے مکان کی سیڑھیوں تک پہونچ جائے اور کوٹھے پر چڑھ جائے مگر میونسپل کمیٹی کی لالٹین غیر مختتم ٹکٹکی باندھے اُس کی طرف گھور رہی تھی۔ اُس کے بڑھنے والے قدم رُک گئے اور وہ بھنّا سا گیا: "یہ لالٹین مجھے کیوں گھور گھور کر دیکھ رہی ہے — یہ میرے راستے میں کیوں روڑے اٹکاتی ہے۔"

وہ جانتا تھا کہ یہ محض واہمہ ہے اور اصلیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں لیکن پھر بھی اُس کے قدم رُک جاتے تھے اور وہ اپنے دل میں تمام بھیانک ارادے لئے موری کے اُس پار کھڑا رہ جاتا تھا۔ دراصل اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اُس کی زندگی کے ستائیس برسوں کی جھجک جو اُسے ورثے میں ملی تھی اُس لالٹین میں جمع ہو گئی ہے۔ یہ جھجک جس کو پُرانی کینچلی کی طرح اُتار کر وہ اپنے گھر چھوڑ آیا تھا اُس سے پہلے وہاں پہونچ چکی تھی۔ جہاں اُسے اپنی زندگی کا سب سے بھدا کھیل کھیلنا تھا۔ ایسا کھیل جو اُسے کیچڑ میں لت پت کر دے۔ اُس کی رُوح تک کو ملوّث کر دے۔

ایک میلی کچیلی عورت اُس مکان میں رہتی تھی۔ اُس کے پاس چار یا پانچ نوجوان عورتیں تھیں جو رات کے اندھیرے اور دن کے اُجالے میں یکساں بھدے پن سے پیشہ کرواتی تھیں۔ یہ عورتیں گندی موری سے غلاظت نکالنے والے پمپ کی طرح دن رات چلتی رہتی تھیں۔ جاوید کو اس قحبہ خانے کے متعلق اُس کے ایک دوست نے بتایا تھا جو حسن و عشق کی لاش کئی مرتبہ اس قبرستان میں دفن کر چکا تھا۔ جاوید سے وہ کہا کرتا تھا۔ "تم عورت عورت پکارتے ہو — عورت ہے کہاں؟ ..... مجھے تو اپنی زندگی میں صرف ایک عورت نظر آئی جو میری ماں تھی — مستورات دیکھی ہیں اور اُن کے متعلق سُنا بھی ہے۔ لیکن جب کبھی عورت کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ میں نے مائی جیواں کے کوٹھے کو اپنا بہترین رفیق پایا ہے — بخدا، مائی جیواں عورت نہیں فرشتہ ہے — خدا اُس کو خضر کی عمر عطا فرمائے۔"

جاوید، مائی جیواں اور اُس کے یہاں کی چار پانچ پیشہ کرانے والی عورتوں کے متعلق بہت کچھ سُن چکا تھا۔ اُس کو معلوم تھا کہ اُن میں سے ایک ہر وقت گہرے رنگ کے شیشوں والا چشمہ پہنے رہتی ہے۔ اس لئے کہ کسی بیماری کے باعث اُس کی آنکھیں خراب ہو چکی ہیں۔ ایک کالی کلوٹی لونڈیا ہے جو ہر وقت ہنستی رہتی ہے — "ایسی عورتوں کو ہنستے ہی رہنا چاہیئے — جب وہ ہنستی ہوگی تو اُس کے کالے ہونٹ یوں کھلتے ہوں گے جیسے بدبودار گندے پانی میں میلے بُلبُلے بن بن کر پھٹتے ہیں۔"

مائی جیواں کے پاس ایک اور چھوکری بھی تھی۔ جو باقاعدہ طور پر پیشہ کرانے سے پہلے گلیوں اور بازاروں میں بھیک مانگا کرتی تھی۔ اب ایک برس

سے وہ اُس مکان میں تھی جہاں اٹھارہ برسوں سے یہی کام ہو رہا تھا۔ اب یہ پوڈر اور سرخی لگاتی تھی۔ جاوید اس کے متعلق بھی سوچتا: اس کے سُرخی لگے گال بالکل واندار سیبوں کے مانند ہوں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو ہر کوئی خرید سکتا ہے:

ان چار پانچ عورتوں میں سے جاوید کی کسی خاص پر نظر نہ تھی ——— مجھے کوئی بھی مل جائے ——— میں چاہتا ہوں کہ مجھ سے دام لئے جائیں اور لٹ سے ایک عورت میری بغل میں تھما دی جائے ——— ایک سیکنڈ کی دیر نہ ہونی چاہیئے۔ کسی قسم کی گفتگو نہ ہو۔ کوئی نرم و نازک فقرہ منہ سے نکلنے نہ پائے ——— قدموں کی چاپ سنائی دے۔ دروازہ کھلنے کی کھڑکھڑاہٹ پیدا ہو ——— روپے کھنکھنائیں ——— کپڑے سرسرائیں ——— چارپائی چرچرائے ——— یہ سب آوازیں آئیں مگر منہ بند رہے۔ اگر آواز نکلے تو ایسی جو انسانی آواز معلوم نہ ہو ——— ملاقات ہو بالکل حیوانوں کی طرح تہذیب و تمدن کے صندوق کو تالا لگ جائے۔ تھوڑی دیر کے لئے ایک ایسی دنیا آباد ہو جائے جس میں سونگھنے دیکھنے اور سُننے کی نازک حسّات زنگ لگے استرے کے مانند کُند ہو جائیں"

جاوید بے چین ہو گیا۔ ایک اُلجھن سی اُس کے دماغ میں پیدا ہو گئی۔ ارادہ اُس کے اندر اتنی شدت اختیار کر چکا تھا کہ اگر پہاڑ بھی اُس کے راستے میں ہوتے تو وہ اُن سے بھڑ جاتا۔ مگر میونسپل کمیٹی کی ایک اندھی لالٹین جس کو ہوا کا ایک جھونکا بجھا سکتا تھا اُس کی راہ میں بہت بُری طرح حائل ہو گئی تھی۔

اُس کی بغل میں پان والے کی دکان کھلی تھی۔ تیز روشنی میں اُسکی چھوٹی سی دکان کا اسباب اس قدر نمایاں ہو رہا تھا۔ کہ بہت سی چیزیں نظر نہیں آتی تھیں بجلی کے قمقمے کے ارد گرد مکھیاں اس انداز سے اُڑ رہی تھیں جیسے اُن کے پر بوجھل ہو رہے ہیں۔ جاوید نے جب اُنکی طرف دیکھا تو اس کی اُلجھن میں اضافہ ہو گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُسے کوئی سُست رفتار چیز نظر آئے۔ اُس کا گزرنے کا ارادہ جو وہ اپنے گھر سے لیکر یہاں آیا تھا۔ ان مکھیوں کے ساتھ بار بار ٹکرایا اور وہ اس کے احساس سے اس قدر پریشان ہُوا کہ ایک ہلڑ سا اُس کے دماغ میں برپا ہو گیا: میں ڈرتا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ میں خوف کھاتا ہوں ——— اس لالٹین سے مجھے ڈر لگتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ میرے تمام ارادے اس نے تباہ کر دیئے ہیں ——— میں ڈرپوک ہوں ——— میں ڈرپوک ہوں ——— لعنت ہو مجھ پر"

اُس نے کئی لعنتیں اپنے آپ پر بھیجیں مگر خاطر خواہ اثر پیدا نہ ہُوا۔ اُس کے قدم آگے نہ بڑھ سکے۔ نانک شاہی اینٹوں کا ناہموار فرش اُس کے سامنے لیٹا رہا۔

گرمیوں کے دن تھے نصف رات گزرنے پر بھی ہوا ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ بازار میں آمد و رفت بہت کم تھی گنتی کی صرف چند دُکانیں کھلی تھیں۔ فضا خاموشی میں لپٹی ہوئی تھی۔ البتہ کبھی کبھی کسی کوٹھے سے ہوا کے گرم جھونکے کے ساتھ تھکی ہوئی موسیقی کا ایک ٹکڑا اُڑ کر اُدھر چلا آتا تھا اور رگا رہی خاموشی میں گھُل جاتا تھا۔

جاوید کے سامنے یعنی مائی جیواں کے قحبہ خانے سے اِدھر ہٹ کر بازار میں جو دکانوں کے اُوپر کوٹھوں کی ایک قطار تھی اُس میں کئی جگہ زندگی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اُس کے بالمقابل کھڑکی میں تیز روشنی کے قمقمے کے نیچے ایک سیاہ فام عورت بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی۔ اُس کے سر کے اُوپر بجلی کا بلب جل رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سفید آگ کا ایک گولا ہے جو پگھل پگھل کر اُس دیشیا پر گر رہا ہے۔

جاوید اس سیاہ فام عورت کے متعلق کچھ غور کرنے ہی والا تھا۔ کہ بازار کے اُس سرے سے جو کہ اُس کی آنکھوں سے اوجھل تھا۔ بڑے بھدے نعروں کی صورت میں چند آوازیں بلند ہوئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد تین آدمی جھومتے جھامتے شراب کے نشے میں چُور نمودار ہوئے۔ تینوں کے تینوں اُس سیاہ فام عورت کے کوٹھے کے نیچے پہونچ کر کھڑے ہو گئے۔ اور جاوید کے کانوں نے ایسی واہیات باتیں سُنیں۔ کہ تمام ارادے اُسکے اندر سمٹ گئے۔

ایک شرابی نے جس کے قدم بہت زیادہ لڑکھڑا رہے تھے اپنے مونچھوں بھرے ہونٹوں سے بڑی بھدّی آواز کے ساتھ ایک بوسہ نوچ کر اُس کالی

ویشیا کی طرف اُچھالا اور ایک ایسا فقرہ کہا کہ جاوید کی ساری ہمت پست ہو گئی۔ کوٹھے پر برقی لیمپ کی روشنی میں اُس سیاہ فام عورت کے ہونٹ ایک آبنوسی قہقہے نے وا کئے اور اُس نے شرابی کے فقرے کا جواب یوں دیا جیسے ٹوکری بھر کوڑا نیچے پھینک دیا ہو ——— نیچے غیظ۔ قہقہوں کا ایک فوارہ سا چھوٹ پڑا اور جاوید کے دیکھتے دیکھتے وہ تینوں شرابی کوٹھے پر چڑھ گئے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد وہ نشست جہاں وہ کالی ویشیا بیٹھی تھی خالی ہو گئی۔

جاوید اپنے آپ سے اور زیادہ متنفر ہو گیا۔ تم ..... تم کیا ہو؟ ..... میں پوچھتا ہوں آخر تم ہو کیا ——— نہ تم یہ ہو اور نہ تم وہ ہو ..... نہ تم انسان ہو نہ حیوان ..... تمہاری ذہانت و ذکاوت آج سب دھری کی دھری رہ گئی ہے۔ تین شرابی آتے ہیں۔ تمہاری طرح اُن کے دل میں ارادہ نہیں ہوتا۔ لیکن وہ بے دھڑک اُس ویشیا سے واہیات باتیں کرتے ہیں اور ہنستے، قہقہے لگاتے کوٹھے پر چڑھ جاتے ہیں گویا پتنگ اُڑانے جا رہے ہیں ..... اور تم ... اور تم جو کہ اچھی طرح سمجھتے ہو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ یوں بیوقوفوں کی طرح بیچ بازار کے کھڑے ہو اور ایک بے جان لالٹین سے خوف کھا رہے ہو ——— تمہارا ارادہ اس قدر صاف اور شفاف ہے۔ لیکن پھر بھی تمہارے قدم آگے نہیں بڑھتے۔ لعنت ہو تم پر!

جاوید کے اندر ایک لمحے کے لئے خود انتقامی کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس کے قدموں میں جنبش پیدا ہوئی اور موری پھاند کر وہ مائی جیواں کے کوٹھے کی طرف بڑھا۔ قریب تھا کہ وہ لپک کر سیڑھیوں کے پاس پہونچ جائے کہ اُوپر سے ایک آدمی اُترا۔ جاوید پیچھے ہٹ گیا۔ غیر ارادی طور پر اُس نے اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش بھی کی۔ لیکن کوٹھے پر سے نیچے آنے والے آدمی نے اُس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

اس آدمی نے اپنا ململ کا کرتا اُتار کر کاندھے پر دھرا تھا اور داہنی کلائی میں موتیے کے پھولوں کا مسلا ہوا ہار لپٹا تھا۔ بدن اُس کا پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ جاوید کے وجود سے بے خبر وہ اپنے تہمد کو دونوں ہاتھوں سے گھٹنوں تک اُونچا کئے نانک شاہی اینٹوں کا اونچا نیچا فرش طے کر کے موری کے اُس پار چلا گیا اور جاوید نے یہ سوچنا شروع کیا کہ اس آدمی نے اُس کی طرف کیوں نہیں دیکھا۔ اس دوران میں اُس نے لالٹین کی طرف دیکھا تو اُسے یہ کہتی معلوم ہوئی: تم کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو گے اس لئے کہ تم ڈرپوک ہو ——— یاد ہے تمہیں! پچھلے برسات میں جب تم نے اُس ہندو لڑکی اندرا سے اپنی محبت کا اظہار کرنا چاہا تھا تو تمہارے جسم میں سکت نہیں رہی تھی۔ کیسے کیسے بھیانک خیال تمہارے دماغ میں پیدا ہوئے تھے ——— یاد ہے، تم نے ہندو مسلم فساد کے متعلق بھی سوچا تھا اور تم ڈر گئے تھے۔ اس لڑکی کو تم نے اسی ڈر کے مارے بھلا دیا۔ اور حمیدہ سے تم اس لئے محبت نہ کر سکے۔ کہ وہ تمہاری رشتہ دار تھی۔ اور تمہیں اس بات کا خوف تھا۔ کہ تمہاری محبت کو غلط نظروں سے دیکھا جائے گا۔ کیسے کیسے وہم تمہارے اُوپر اُن دنوں مسلط تھے اور پھر تم نے بلقیس سے محبت کرنا چاہی مگر اس کو صرف ایک بار دیکھ کر تمہارے سب ارادے غائب ہو گئے اور تمہارا دل ویسے کا ویسا بنجر رہا ..... کیا تمہیں اس بات کا احساس نہیں کہ ہر بار تم نے اپنی بے لوث محبت کو خود آپ ہی شک کی نظروں سے دیکھا ہے۔ تمہیں اس بات کا کبھی پوری طرح یقین نہیں آیا کہ تمہاری محبت ٹھیک فطری حالت میں ہے، تم ہمیشہ ڈرتے رہے ہو۔ اسوقت بھی تم ڈر رہے ہو۔ یہاں گھریلو عورتوں اور لڑکیوں کا سوال نہیں۔ ہندو مسلم فساد کا بھی اس جگہ کوئی خدشہ نہیں لیکن اس کے باوجود تم کبھی اس کوٹھے پر نہیں جا سکو گے۔ میں دیکھونگی تم کس طرح اُوپر جاتے ہو۔

جاوید کی رہی سہی ہمت بھی پست ہو گئی۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ واقعی پرلے درجے کا ڈرپوک ہے۔ بیتے ہوئے واقعات تیز ہوا میں رکھی ہوئی کتاب کے اوراق کی طرح اُس کے دماغ میں دیر تک پھڑپھڑاتے رہے اور پہلی مرتبہ اُس کو اس بات کا بڑی شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ اُس کے وجود کی بنیادوں میں ایک ایسی جھجک بیٹھی ہوئی ہے جس نے اُسے قابلِ رحم حد تک ڈرپوک بنا دیا ہے۔

سامنے اُسے سیڑھیوں سے کسی کے اُترنے کی آواز آئی۔ تو جاوید اپنے خیالات سے چونک پڑا۔ وہی جو گہرے رنگ کے شیشوں والی عینک پہنتی تھی اور جس کے متعلق وہ کئی بار اپنے دوست سے سن چکا تھا۔ سیڑھیوں کے اختتامی چبوترے پر کھڑی تھی۔ جاوید گھبرا گیا۔ قریب تھا کہ وہ آگے

سرک جائے کہ اُس نے بڑے بھدّے طریقے پر اُسے آواز دی: "اجی، ٹھیر جاؤ ——— میری جان گھبراؤ نہیں ——— آؤ ——— آؤ ———" اس کے بعد اُس نے پچکارتے ہوئے کہا: "چلے آؤ..... آجاؤ!"

یہ سُن کر جاوید کو ایسا محسوس ہؤا کہ اگر وہ کچھ دیر وہاں ٹھیرا تو اُس کی پیٹھ میں دُم اُگ آئیگی جو اُس دیشیا کے پچکارنے پر ہلنا شروع کر دے گی۔ اس احساس سمیت اُس نے چبوترے کی طرف گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ مائی جیواں کے قحبہ خانے کی اُس عینک چڑھی لونڈیا نے اس طور پہ اپنے بالائی جسم کو حرکت دی کہ جاوید کے تمام ارادے پکے ہوئے بیروں کے مانند جھڑ گئے۔ اُس نے پھر پچکارا: "آؤ ——— میری جان اب آ بھی جاؤ!"

جاوید اُٹھ بھاگا۔ موری پھاند کر جب وہ بازار میں پہونچا تو اُس نے ایک ایسے قہقہے کی آواز سُنی جو خطرناک طور پر بھیانک تھا۔ وہ کانپ اُٹھا۔

جب وہ اپنے گھر کے پاس پہونچا تو اُس کے خیالات کے ہجوم میں سے دفعتہ ایک خیال رینگ کر آگے بڑھا اور اُس کو تسکین دی —

"جاوید، تم ایک بہت بڑے گناہ سے بچ گئے ہو۔ خدا کا شکر بجا لاؤ!"

(تامل سے)

بلال احمد

خط

مشہور مدرستہ البنات (ہتری پاٹھشالہ) کی بانی اور پرنسپل بہن انپورنا دیوی حسبِ معمول شام کے وقت مدرسے کے وسیع احاطے میں ٹہل رہی تھیں۔ ذرا فاصلے پر واقع بنگلے سے شہنائی کی مسحور کن آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس سے ان کے حافظے میں پرانی یادیں کروٹیں لینے لگی تھیں۔ یکایک اُن کے چہرے پر ___ جہاں ہمیشہ سکون کی حکومت ہوتی تھی ___ اضطراب کے آثار نمودار ہوئے اور دوسرے ہی لمحے غائب ہو گئے۔ بالکل اسی طرح جیسے بحرِ منجمد میں اچانک ایک عظیم الہیت لہر پیدا ہو، کسی چٹان سے ٹکرائے اور ختم ہو جائے۔ پھر اس سمندر کے کوسوں تک پھیلے ہوئے پانی پر پہلے جیسا سکون طاری ہو جاتا ہے۔ جس طرح لہر کی یادگار کے طور پر چٹان کے گڑھوں میں پانی ٹھہرا رہتا ہے۔ ویسے ہی انپورنا دیوی کی آنکھیں بھی پُرآب ہو گئیں۔

عین اسی وقت مدرسے کی استانی شریمتی ساوتری ایم۔اے ایل۔ٹی کو سامنے دیکھ کر انپورنا دیوی نے آنسو پونچھ ڈالے اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے ساوتری کا استقبال کیا۔ دونوں قریب ہی نیم کے پیڑ کی چھاؤں میں بنے چبوترے پر بیٹھ گئیں۔

انپورنا کے بال اپنی ہم صنفوں کی بے لاگ خدمت گزاری میں سفید ہو گئے تھے۔ ان کی پیشانی پر بکھرے ہوئے چاندی کی مانند سفید بالوں کو دیکھ کر کوہسار کے بادلوں کی یاد آتی تھی لیکن اس کے باوجود کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان کی عمر پچاس سے اوپر ہوگی۔ معلوم ہوتا تھا گویا انہوں نے سدابہار جوانی کے راز کو پالیا ہو سیدھی سادھی، سفید بالوں اور سکون پاش نورانی چہرے والی بہن انپورنا دیوی کو لوگ سرسوتی کا اوتار سمجھتے تھے۔

انپورنا کا فسانۂ حیات سے اکثر اہلِ شہر واقف تھے۔ عمر کے نویں برس میں اچھی طرح ہوش سنبھالنے سے بھی پہلے بیوگی کا شکار ہونا ان کی تقدیر میں لکھا تھا۔ ان کا وہی نوشتۂ مقدر طبقۂ اناث کے حق میں خوش قسمتی کا باعث ہوا۔ انہوں نے اپنی ذاتی کوششوں سے بی۔اے ایل۔ٹی کی ڈگری حاصل کی۔ تب سے وہ نوجوان بیواؤں شوہروں کی ٹھکرائی ہوئی دوشیزاؤں اور لاوارث بچیوں کی خدمت سے زندگی کے دن گزارنے لگیں۔ انہوں نے اپنے مشن کی تکمیل کے لئے مدرسے کی بنیاد ڈالی۔ اور اپنا تن من دھن سب اس کی نذر کر دیا۔

معلمہ ساوتری دیوی نوعمر تھیں۔ ان کا سن حد سے حد ۲۵ سال کا ہوگا۔ وہ ہنوز کنواری تھیں تین سال قبل ایم۔اے ایل۔ٹی کے امتحان میں کامیاب ہو کر جب وہ اس ادارے میں آئی تھیں۔ تو ان کا مقصد یقیناً روپیہ پیدا کرنا تھا۔ مگر انپورنا دیوی کی صحبت سے ان کے خیالات میں زمین و آسمان کا فرق پڑ چکا تھا۔

ساوتری نے کہا "بہنجی آج نظم پڑھاتے وقت بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک مصرعہ آیا ؎ محبت ہی ہے وجہِ تخلیقِ عالم" پدما لیلی۔ شاعر کی مراد یہاں کس محبت سے ہے۔ بڑی نٹ کھٹ لڑکی ہے۔ سنیئے اس کی ہنسی سنائی دے رہی ہے۔"

باغ کے دوسری طرف چند لڑکیاں گیند کھیل رہی تھیں وہاں سے ایک قہقہہ بلند ہوا، اور اس کی گونج جنوبی ہوا کے کومل جھونکوں کے ساتھ ملی ہوئی آئی۔

"پدما کے سوال کا تم نے کیا جواب دیا" انپورنا نے پوچھا

"جواب دیتے ہوئے میں بہت ہچکچائی۔ یہ بات میں لڑکیوں کے سامنے کیونکر زبان سے نکالتی کہ یہاں "محبت" سے مراد عورت مرد ہی کی محبت ہے۔ عام لڑکیوں کے تو ذہن نشین کرانا بھی کٹھن ہوتا ہے۔ جب میں کوئن میری کالج میں پڑھا کرتی تھی۔ تو اس

زمانے میں استانیوں پر کیا بیتتی تھی یہ مجھے خوب یاد ہے۔ یہاں تو سبھی عورتیں بیوائیں یا "تارکاتِ زوج" ہیں۔ محبت کے بارے میں کوئی کہے بھی تو کیا؟"

معاً ساوتری خاموش ہو گئی۔ اُسے یاد آ گیا کہ بہن انپورنا بچپن ہی میں شوہر سے محروم ہو چکی تھیں۔ اُسے ایسا محسوس ہُوا گویا وہ کوئی غیر مناسب جملہ کہہ بیٹھی ہو۔ گفتگو کا رُخ بدلنے کی غرض سے وہ بولی "سچ پوچھئے تو بہن جی یہ سب پاگل پن معلوم ہوتا ہے پیار و یار محض فضول چیز ہے۔ گوشہ نشین شاعروں کی مبالغہ آمیزی کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے ......"

انپورنا نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "سب بے معنی ہے؟ اچھا تو میں آج ڈاکٹر مشری نواس کو اس کی اطلاع دیتی ہوں۔"

ڈاکٹر شری نواس سے ساوتری کا بیاہ ہونے والا تھا۔ اس نے حیا آمیز طریقہ سے کہا "ہاں تو .... کون جانے فی الحال تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ آئندہ کا علم نہیں۔ خیر اِن باتوں کو جانے دیجئے جیجی۔ زیرِ تذکرہ اس شعر میں تو شاعر کا یہ کہنا مبالغہ سے خالی نہیں۔ کہ دنیا کی ہر چیز کی تخلیق محبت کے کارن ہوئی ہے۔ دُنیا کا بڑے سے بڑا کام اپنے وجود کے لئے محبت کا ممنون ہے۔ اِسی مدرسے کو لیجئے یہ ۲۵ برس سے جاری ہے۔ اور راس کماری سے کشمیر تک کوئی ایسا انسان نظر نہیں آتا جو اس کی تعریف نہ کرتا ہو اسی کے ساتھ آپ کی خدمات کا بھی سب کو اعتراف ہے۔ اِس کارِ عظیم پہ تو شاعر کا قول صادق نہیں آتا"

ساوتری! دُنیا کے دوسرے بڑے کاموں پر شاعر کا مطلب صادق ہے یا نہیں۔ یہ میں نہیں جانتی۔ لیکن اگر میری ناچیز خدمت کی کوئی وقعت ہے۔ تو اس کے بارے میں شاعر نے قطعاً درست کہا ہے۔ میری کوششوں کی اصل محرک محبت ہی ہے ......"

"اِس سے کسے اِنکار ہے؟ بے سہاروں پہ آپ کی محبت تو مشہور ہے ہی"

میری غرض اِس محبت سے نہیں ہے۔ میں کوئی کے ساتھ

کردہ پریم کی بات کہتی ہوں۔ زندگی میں میں نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ سب محبت ہی کا پھل ہے"

ساوتری کو یہ سُن کر استعجاب ہُوا۔ اُس نے ناز کے ساتھ گردن ہلا کر کہا "سچ جیجی؟ سچ کہتی ہیں آپ؟ تو پھر مجھے پورا ماجرہ سنائیے ......"

۲

انپورنا کہنے لگی:-

یہ شادی والے مکان سے شہنائی کی جو آواز آ رہی ہے سُنتی ہو نا؟ ویر سوامی "ریتی گوڑ" راگ کو کیسے اچھوتے انداز سے گا رہا ہے۔ تمہاری آمد سے ذرا دیر پہلے جب اِس کا سُر میرے کان میں پڑا۔ تو بچپن کی یاد جاگ اُٹھی۔ جن آنکھوں سے عرصہ ہُوا کبھی ایک آنسو بھی نہ ٹپکا تھا وہ بھی ڈبڈبا آئیں۔ برس گزرے شادی کی محفل میں یہ راگ شمبو ناز کا را ماسوامی گا رہا تھا اس زمانے میں وہی اِس راگ کا مسلّم گویا تھا"

یہ باتیں آپ کو اب تک یاد کیسے ہیں جیجی؟ میں نے تو سُنا ہے کہ آپ کی شادی بہت چھٹپنے ہی میں ہو گئی تھی۔"

میں اپنی شادی کی بات نہیں کرتی۔ کہتے ہیں چھ برس کی عمر میں میرا بیاہ ہُوا تھا۔ نویں برس بیوہ ہو گئی۔ یہ باتیں میرے ذہن میں بالکل صاف نہیں۔ پرانے خواب کی مانند تھوڑا بہت یاد رہ گیا ہے۔ چھوٹی عمر میں بیوہ ہو جانے سے ایک فائدہ بھی ہُوا ...... ارے تم تو ہنس رہی ہو۔ میں حقیقت بیان کر رہی ہوں۔ اگر چار پانچ سال بعد ودھوا ہوتی تو اوروں کی طرح میرا بھی سر مونڈ کر دُرگت بناتے۔

میں اپنی چچازاد بہن کی شادی کا تذکرہ کر رہی ہوں۔ ابو جم مجھ سے عمر میں دو سال چھوٹی تھی۔ اس کی شادی کے وقت میرا سن لگ بھگ ۱۶ سال کا تھا۔ ابو جم مجھے دل سے چاہتی تھی جب سے رانڈ ہوئی تھی اپنے چچا ہی کے ہاں رہا کرتی تھی۔ میرا دھیان ہٹانے کی خاطر گھر کے سب لوگ میری تواضع میں لگے رہتے ہر کام میں ہمیں رائے مقدم سمجھی جاتی تھی۔

جب انوجم کی شادی کا فیصلہ ہو گیا تو جملہ انتظام میرے ہی حسبِ منشا ہوا۔ داماد کیلئے کیسا لباس تیار کرایا جائے۔ کس شہنائی والے کو طلب کیا جائے۔ کھانے کے ساتھ کون سی مٹھائی رکھی جائے۔ وغیرہ۔

شادی سے قبل والی رات میں داماد کو بلا کر لگن سے متعلق باتوں کا فیصلہ کیا گیا۔ خاندان کی دوسری عورتوں کے جھنڈ میں میں بھی تھی۔ چارپائی پر بیٹھی انوجم کے ماتھے سے جڑاؤ جھومر کھسک کر نیچے گرا ہی چاہتا تھا۔ کہ میں جھپٹ کر اس کے قریب پہنچی اور اُسے درست کر دیا۔ جب واپس آنے کے لئے مڑی تو دیکھتی کیا ہوں کہ دولہا کی بغل میں بیٹھے ایک نوجوان مجھے غور سے دیکھ رہے ہیں۔ میرے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔ سر چکرا گیا بہ ہزار خرابی اپنے کو سنبھالا۔

(میرے دل میں) ان کو دوبارہ دیکھنے کی بڑی زبردست خواہش ہوئی۔ اس سے قبل خواب میں بھی میں نے اس قبیل کی کوئی آرزو نہ کی تھی۔ جہاں تک امکان میں تھا میں نے دل پہ قابو رکھنے کی کوشش کی۔ اور جذبات کو پوری طاقت سے پیچھے دھکیلا۔ مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ میں نے دزدیدہ نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا۔ وہ بھی مجھ پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ اب فوراً انہوں نے سر جھکا لیا۔

"اس رات میں بالکل نہ سو سکی"

" دوسرے دن انوجم کا بیاہ دھوم دھام سے ہو گیا۔ بظاہر تو میں کام کاج میں مشغول تھی لیکن دراصل میرا دل کسی دوسری دُنیا میں بھٹک رہا تھا۔

" شادی کے دن والے تجربے نے یہ بات اور واضح کر دی کہ وہ محض نظر بازی نہیں تھی۔ بلکہ محبت کی کارفرمائیاں تھیں

چاند کو اس سے پہلے بھی میں نے بارہا دیکھا تھا۔ تاہم انوجم کی شادی کی رات ماہِ کامل میں مجھے جس قدر کشش محسوس ہوئی۔ وہ بالکل نئی چیز تھی۔ شہنائی کی مدھر تان اس سے قبل مجھے اتنا مسحور کن نہیں کر پائی تھی۔ چندن کی خوشبو وہ پہلی سے اتنا مسرور کبھی حاصل نہ ہوا تھا۔

میرے دل میں ایسے ایسے سوال پیدا ہونے لگے جن سے آج تک کبھی پالا نہیں پڑا تھا۔ سوچنے لگی ——— دوسری لڑکیوں کی طرح میں بال سنوار کر پھول کیوں نہیں پہن سکتی؟ سیندور سے مانگ کیوں نہیں بھر سکتی؟ چندن کیوں نہیں لگا سکتی؟

شادی کے تیسرے دن میں انوجم کے ہمراہ جنواسے میں گئی۔ اس کی نند اس کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ کپڑے زیوروں کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ مگر میری توجہ ادھر نہیں تھی۔ بیٹھک میں کوئی گفتگو کر رہا تھا۔ بیچ بیچ میں کوئی لفظ میرے کان میں بھی پڑ جاتا تھا۔ یہ وہی بول رہے تھے۔ میں دھیان دے کر سننے لگی۔ ان کی باتوں میں کتنی مٹھاس اور کیسا اپنا پن تھا۔ کمسن بیواؤں کی حالت موضوعِ بحث تھی۔ انہوں نے بیوگی کی نحوست کے سلسلے میں متعدد اکابر کے قول پیش کئے۔

کوئی اُن سے مخاطب ہوا۔ "یار تم باتیں بنانا خوب جانتے ہو۔ اگر بیواؤں کا ایسا ہی درد ہے۔ تو انپورنا کے ساتھ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

انہوں نے مجروح ہوتے ہوئے جواب دیا۔ "چھی! چھی! تم لوگ بالکل بے وقوف ہو تم سے بات کرنے کی بجائے دیوار سے سر پھوڑنا لاکھ درجے بہتر ہے"۔ اور وہ کمرے سے نکل گئے۔

ان کی غیر موجودگی میں لوگوں کی باہمی گفت و شنود سے مجھے ان کے متعلق اکثر امور کا علم ہو گیا۔ اس سال وہ سارے صوبہ مدراس میں بی۔ اے کے امتحان میں اوّل رہے تھے۔ لوگ انہیں اپنی بیٹی کے علاوہ پانچ ہزار روپیہ جہیز میں دینے پر آمادہ تھے۔ ایسے شخص کی محبت کی میں مستحق بنی؟ اپنے نصیبے پر یقین نہیں آتا تھا۔

۳

شادی کے چوتھے روز خبر آئی کہ سمدھن کی طبیعت ناساز ہے۔ میں ان کی مزاج پرسی کرنے جنواسے گئی۔ سوچ رہی تھی

شاید وہ وہیں ہونگے۔ صاحب میں دہلیز سے گزر کر برآمدے میں داخل ہوئی تو انہیں تنہا ٹہلتے پایا۔ انہوں نے مجھ سے دریافت کیا "آپ کسے ڈھونڈھ رہی ہیں؟" میں اچھل کھڑی رہ گئی۔ کوئی جواب بن نہ پڑا۔ انہوں نے جھٹ میری ہتھیلی پر ایک کاغذ کا پُرزہ رکھکر مٹھی بند کر دی۔ اور مزید قیام کئے بغیر تیزی سے باہر چلے گئے۔

میرا بدن یوں کانپ اٹھا جیسے آندھی میں گھاس کی پتیاں لیکن دل مضبوط کرکے وہ خط بحفاظت میں نے اپنے سینے میں چھپا لیا۔ اور اندر چلی گئی۔ سب سے باتیں کرتے وقت میری عقل ٹھکانے نہیں تھی۔ وہ کہنے لگیں "میری طبیعت کا حال پوچھتی ہو۔ لیکن بیٹی تم کو کیا ہو گیا ہے؟ چہرے پر ہوائیاں سی کیوں اُڑ رہی ہیں"

"جی ہاں میرے سر میں بھی درد ہے" کہکر میں اُلٹے پاؤں واپس آگئی۔

"گھر پہنچکر سیدھی اندر کے کمرے میں گھس گئی۔ اور چٹائی بچھا کر پڑ رہی جس کسی نے پوچھا "طبیعت خراب" کا بہانہ کرکے گھنٹوں روتی رہی۔ پھر مجھے ان کے درشن کبھی نہ ہوئے......"

"کیوں جیجی اس چٹھی میں کیا لکھا تھا؟" ساوتری نے دخل اندازی کی۔

"چٹھی میں؟ وہ میرے ساتھ جتنی محبت کرتے تھے سب اس میں انڈیل دی تھی۔ انہوں نے لکھا تھا کہ وہ میرے لئے بڑے سے بڑا ایثار کرنے اور دُنیا بھر کا مقابلہ کرنے کو تیار ہیں مگر مجھے مجبور یا ذمی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ نیز یہ کہ اگر میں بھی اُن سے محبت رکھتی اور زمانہ بھر کی مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ تھی تو وداع کے وقت چنبیلی کا پھول ہاتھ میں لیکر کھڑی ہو جاؤں تاکہ وہ سمجھ لیں کہ جواب اس بات میں ہے اور مزید انتظام کریں۔"

"تو اس وقت آپ رو کیوں پڑیں؟ کیا ان کی تحریر پر آپ نے عمل نہیں کیا؟"

بالکل نہیں کیا بلکہ اندر پڑی روتی رہی جس سے انہوں نے سمجھ لیا ہوگا کہ میں اُن سے قطعی محبت نہیں کرتی۔ اور ان کے الفاظ نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے۔ اس طرح میری زندگی کی وہ نوبتِ پنج روزہ "ختم ہوگئی ...."

"لیکن جیجی آپ نے ان کا کہا کیوں نہ مانا؟ میری سمجھ میں یہ نہ آیا کہ معاملہ کیا تھا؟"

"یہ بات بتلاتے ہوئے بھی مجھے اب شرم آتی ہے ہُوا یہ کہ وہ خط میں نے اسی روز نہیں پڑھا تھا اسوقت میں لکھنا پڑھنا جانتی ہی نہ تھی۔ اور جب پڑھنے لکھنے کے قابل ہوئی تو آنسوؤں سے وہ خط خراب ہو چکا تھا۔ مجھے اپنی کمزوری کا احساس ہُوا اسی کی بدولت میں نے بی۔اے ایل۔ٹی کی ڈگری لی" ساوتری کی سیاہ آنکھوں میں آنسوؤں کی دو بوندیں یوں جھلک رہی تھیں جیسے اماوس کی رات کو آسمان میں تارے چمکا کرتے ہیں۔ اور وہ شہنائی والا کائنات کے درد کو لکڑی کی ایک نلی کے ذریعے بکھیرے جا رہا تھا۔

ابراہیم جلیس

تنخواہ کا دِن

آج مزدوروں کے چہرے پر خلافِ معمول تازگی اور توانائی جھلک رہی تھی۔ آج سب مستعدی دکھلا رہے تھے۔ آج کسی کو تھکن محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ آج کسی کو بخار نہیں تھا — آج ان کی تنخواہ کا دن تھا۔

مُراد پگھلے ہوئے سرخ لوہے کے ٹکڑوں پر ہتھوڑے برساتے ہوئے کچھ سوچ سوچ کر آپ ہی آپ مسکرا رہا تھا۔ کھٹا کھٹ، کھٹا کھٹ ایسے زور زور کے ہتھوڑے برسا رہا تھا کہ گویا وُہ سرخ لوہے کے ٹکڑے مہینہ کے پچھلے مفلسی کے دن ہیں، جن سے وہ اپنا پورا پورا بدلہ لے رہا ہے تیس دن میں یہ تنخواہ کا ایک دن ہی تو ایسا آتا ہے جب یہ سب دُکھ بھول جاتا ہے — صرف اسی ایک دن اُسے یہ دُنیا — یہ دُنیا والے — بیوی بچے سب پیارے معلوم ہوتے ہیں — صرف اسی ایک دن وہ خوب جی بھر کر محنت کرنا چاہتا ہے — جان لڑا کر کام کرنا چاہتا ہے، اور باقی اُنتیس دن — ؟ ہونہہ باقی اُنتیس دن کی آج فکر کیوں ؟

آج تو اس کی تنخواہ کا دن تھا۔

مہینہ بھر کی تنخواہ — اکٹھے دس روپے — چاندی کے چمکتے ہوئے دس سکّے — انہی پر تو دُنیا قائم ہے — انہی کے لئے چوٹی کا پسینہ ایڑی تک بہایا جاتا ہے۔ کیا راجہ کیا پرجا، یہ چمکتے ہوئے سکے ہی قسمتوں کو چمکاتے ہیں۔ آج اس کی بھی قسمت چمکنے والی تھی —!

آج چمکدار سکّوں سے جگمگاتا ہوا تنخواہ کا دِن تھا۔

مُراد کو آپ ہی آپ مسکراتا دیکھ کر اس کے ایک ساتھی مزدور نے اس کے گنجے سر پر ایک چپت لگائی، مگر مُراد مسکراتا ہی گیا۔ وہ کیسے بیسے ڈھنا نہیں جانتا تھا، اگر اس کا ساتھی ننھے بچے کی طرح اس کے کاندھے پر بھی سوار ہو جائے تو مُراد مسکراتا ہی جائے گا — مسکراتا ہی رہے گا —!

تیس دن تک اپنے جسم کی طاقت کارخانے کو بیچتا رہا۔ آج اس کی ساری بیچی ہوئی طاقت چاندی کے سکوں میں تبدیل ہو کر اسے ملنے والی تھی — آج تو وُہ خوب ٹھاٹھ کرے گا — لاٹ کے سے ٹھاٹھ — آج اس کے گھر میں گوشت بھُونا جائے گا۔ جس کی خوشبو جب محلے کے ہر گھر میں پہنچے گی تو سب کو معلوم ہو جائے گا کہ آج مراد کے گھر میں مزے مزے کے کھانے کھائے جا رہے ہیں۔ آج دو وقت کی بجائے امیروں کی طرح وہ بھی تین وقت خوب ڈٹ کر کھائے گا۔ بیوی بچوں کے لئے کپڑے خریدے جائیں گے۔ آج بیڑی کے بجائے جھنڈا چھاپ سگریٹ پیا جائے گا — آج شکنتلا کا ناٹک بھی دیکھا جائے گا —!

" اُو — اُو — اُو — اُو —"

کارخانے کا گھگھو پکار رہا تھا۔

تمام مزدور اچھل پڑے، اپنا اپنا کام چھوڑ منیجر کے دفتر کی طرف دوڑنے لگے۔ مُراد بھی اپنا ہتھوڑا پھینک ان میں جا ملا۔

آج منیجر کی بھی تنخواہ کا دن تھا، منیجر کی تنخواہ آٹھ سو روپے تھی۔ مُراد نے اپنے ایک ساتھی سے پوچھا۔

" ارے بھیّا! یہ مانیجر آٹھ سو روپے لے کر کیا کرتا ہو گا۔ اس کے نہ تو بیوی ہے نہ بچّہ، اس کے پاس تو خوب روپیہ جمع ہو گا۔ دن تمام دفتر میں بیٹھا رہتا ہے، نہ کام نہ کاج، مگر مہینے کے مہینے ٹھنا ٹھن آٹھ سو روپے مِل جاتے ہیں، ہم صبح کے پانچ بجے سے شام کے چھ بجے تک کارخانے میں مرتے رہتے ہیں مگر وہی دَس روپے۔"

اس کے ساتھی نے جواب دیا:۔

"بھیا وہ مانیجر ہے مانیجر، سمجھا!"

مراد خاموش ہو رہا، ایسے جیسے اس کا جواب ایک ناقابلِ انکار دلیل ہے۔

مراد جب تنخواہ لے کر کارخانے سے باہر نکلا تو سڑکوں پر کی بجلی جل چکی تھی، دکانیں جگمگا رہی تھیں، موٹریں دوڑ رہی تھیں، ٹریم گھڑگھڑا رہی تھیں، سائیکلیں ٹن ٹنا رہی تھیں، ریڈیو نائیں وڈار رہے تھے، گراموفون بج رہے تھے۔ ہر طرف شور ہی شور تھا، ہر طرف ہنگامہ ہی ہنگامہ تھا، ایک بڑی دکان سے ایک صاب اور ایک میم لٹ لٹا کر باہر نکلے، ایک فقیر نے ان کے آگے ہاتھ پھیلا دیئے مگر صاب نے گھُرکی بتائی، وہ لٹ چکے تھے، مگر مراد آج مالدار تھا، اس نے آگے بڑھ کر فقیر کے ہاتھ میں ایک پیسہ پکڑا دیا۔ فقیر اسے دعائیں دینے لگا، مراد دیر تک وہیں کھڑا دعائیں سنتا رہا وہ جی بھر کر دعائیں سننا چاہتا تھا، اس کا دل پھولے نہیں سما رہا تھا، اچانک وہ چونک پڑا، اسے کوئی پکار رہا تھا:۔

"ارے مراد بھیا! ذرا سنیو تو —"

مراد نے پلٹ کر دیکھا۔

شمسو پنواڑی تھا، اپنی اونچی دکان کے میلے آئینے کے آگے بیٹھا قینچی سے پان کی ڈنٹھلیں کتر رہا تھا، اس کے گنجے سر پر بجلی کا ایک چھوٹا سا گولا جل رہا تھا۔ مراد نے قریب پہنچکر پوچھا۔

"کیا ہے بھیا — آج تیری صورت اتری کیوں جا رہی ہے۔"

"ارے کیا بتاؤں بھیا! ابھی ابھی رحمن کے لڑکے نے آکر خبر دی کہ میری بھابی کا منجھلا لڑکا مر گیا۔ تو تو جانتا ہی ہے بھیا۔ اس کو سردی کا بخار ہو گیا تھا، نمونیا — ڈاکٹر نے کہا تھا کہ گرم کپڑے پہنا اسے بھیا۔ یہ پان کی دکان میں ایسا کہاں کا منافع کہ گرم کپڑے خرید لے۔ تین وقت کی روٹی کا اپنا ٹھکانہ نہیں۔ آخر ننھی سی جان مر ہی گئی۔ جرا بھیا تو یہاں دکان پر بیٹھ رہیو، میں جری گھر ہو آؤں۔"

مراد نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلا دیا۔ اونچی دکان پر بیٹھ کر وہ سوچنے لگا۔ اس کا بھی ایک بچہ ہے، آٹھ برس کی ننھی جان، اس کے پاس بھی گرم کپڑے نہیں ہیں — آج کل سردی ایسی غضب کی پڑ رہی ہے کہ جس کو دیکھو سردی کے بخار سے آٹا پڑا ہے۔ اس کو فوراً اپنے لڑکے کے لئے گرم کپڑے خرید لینے چاہئیں، اس کے خیالات بھٹکنے لگے۔

سردی کے بعد پھر گرمی آئے گی، پچھلی گرمیوں میں ننھا کہتا تھا کہ مدرسے کو جاتے ہیں اس کے پیر جلتے ہیں۔ وہ ننھے کو جاپانی ربر کا سفید جوتا لے دیگا۔ گرمی کے بعد برسات آئے گی۔ ننھا برسات میں بھیگ جائے گا تو اسے سردی کا بخار ہو جائے گا — رجب کے لڑکے کے پاس چھوٹی کالی چھتری ہے۔ وہ بھی ننھے کے لئے ایک چھوٹی کالی چھتری خرید لے گا۔ مگر اب تو اسے گرم کپڑے جلد سے جلد خرید لینے چاہئیں۔ ورنہ سردی کا بخار — نمونیا — اور موت —!

وہ کچھ گھبرا سا گیا۔

اسی اثنا میں شمسو پنواڑی لوٹ آیا۔ اس نے دکان بند کر دی، دونوں اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ مراد جب گھر کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ سیٹھ ہری داس چارپائی پر بیٹھے اس کا انتظار کر رہے ہیں — باپ رے باپ — اس نے ایسا محسوس کیا کہ اس کی روح اچانک مردہ ہو گئی ہے، سیٹھ کا قرضہ دینا ہے، گیہوں، نمک، تیل جو بھی قرض لیا تھا اُن کے پیسے دینے ہیں۔ یہ سیٹھ کل تک بھی صبر نہ کر سکے، وہ جانتے تھے کہ ان مزدوروں کے پاس آج پیسہ آیا کل ختم، — رات کے ساڑھے آٹھ بج گئے مگر یہ جیوٹ شیطان کی طرح پہرہ جمائے بیٹھا ہے۔ مراد نے آگے بڑھ کر کہا۔

"سیٹھ سلام۔ آج ذری دیر ہو گئی سیٹھ، معلوم ہوتا ہے تم بہت دیر سے بیٹھے ہو۔ ہاں سیٹھ! تمہارے کتنے روپے ہیں؟"

"چھ روپے"

مراد نے ایسا محسوس کیا گویا کسی نے اس کے منہ پر زور سے تھپڑ لگا دیا ہو، مگر وہ سنبھلا اور کہنے لگا۔

"سیٹھ! اس مہینے میں تین روپے لے لو۔ اگلے مہینے پر

سب حساب ہو جائے گا!"

" نہیں، نہیں، ہر مہینے تو ایسا ہی کہتا ہے، مجھے تو اس مہینے میں بڑی تنگی ہے۔ میری ماں کاشی جا رہی ہے۔ اسے روپوں کی ضرورت ہے۔ باپ کی چتا کی ہڈیاں دو مہینے سے گھر ہی میں رکھی ہیں، اس مہینے ماں نہیں ضرور کاشی لے جائیگی ــــ اس مہینہ میں تو دے ہی دے، ورنہ بھیا مہینہ بھر کچھ ادھار نہیں ملیگا۔"

سیٹھ کی دھمکی کامیاب ہو گئی، مہینہ بھر اسے ادھار ہی تو کھانا ہے۔ اب اگر وہ نہ دے۔ تو سیٹھ مہینہ بھر کچھ بھی نہ دیگا۔ اس نے بے دید بھلا کر چھ روپے سیٹھ کے حوالے کر دیئے۔

سیٹھ روپیہ لے کر بجلی کے کھمبے تک بھی نہ گیا ہو گا۔ کہ ایک اور فدائی فوجدار وارد ہوا۔ گوبند بابو کا نوکر تھا اور مکان کا کرایہ وصول کرنے آیا تھا۔ مکان کا کرایہ دو روپے، ایک دم دو روپے۔ ایسے غلیظ مکان کا کرایہ جس میں دو اندھیرے کمرے ــــ دھوئیں سے کالی دیواریں ــــ ٹوٹے چھپر کا دالان جو برسات میں تالاب بن جاتا تھا، چار قدم کا صحن، سنڈاس نا موجود نہیں، مگر کرایہ دو روپے، اور مہینے کے مہینے وصول ہوتا ہے۔ خواہ مخواہ کا غصہ مراد کے جسم میں سرایت کرنے لگا۔ مگر کس پر غصہ کرے وہ بیچارا ــــ اس نے بڑبڑاتے ہوئے دو روپے اس طرح اس نوکر کے ہاتھ میں تھما دیئے گویا وہ روپے انگارے تھے۔ جن کی جلن کی وہ تاب نہیں لا سکتا تھا، دانت چباتا اُول جلُول بکتا گھر میں گھسا۔ اس کی بیوی آج بنی سنوری بیٹھی تھی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ آج تنخواہ کا دن ہے ــــ مگر مراد نے اس کی طرف نگاہ تک نہ کی ــــ بچہ جا۔ پائی پر سو رہا تھا۔ مٹی کے تیل کے چراغ کی روشنی میں چمکتے ہوئے اس کے سانولے چہرے میں مراد جیسے باپ کے لئے بہت دلکشی تھی، مگر اس نے منہ پھیر لیا۔ اور قریب پڑی ہوئی چار پائی پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں اپنا سر دیئے سوچنے لگا۔

سردی ــ گرم کپڑے ــ گرم جاپانی ربڑ کا جوتا ــــ

برسات ــــ چھوٹی کالی چھتری۔

اسی وقت ایک ہلکی سی خوشبو ہوا کے دوش پر بہتی ہوئی اس کے گھر میں بھی بھٹک نکلی۔ اس کی بیوی نے ہونٹوں پر تر زبان پھیرتے ہوئے کہا:۔

" آہا ــــ سونگھتے ہو، آج شرفو ڈرائیور کے گھر گوشت بُھنا جا رہا ہے۔"

" ہونہہ" اس نے نفرت سے چڑ کر کہا۔

اسی اثنا میں شرفو بھی ڈرتا ہوا اس کے گھر میں گھس آیا۔ شرفو ایک بڑے کرسٹان کا موٹر ڈرائیور تھا، اس کی تنخواہ چالیس روپے تھی، آج اسکی بھی تنخواہ کا دن تھا۔ آج وہ بیڑی کے بجائے حصینڈا چھاپ سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ مراد سے کہہ رہا تھا کہ وہ آج شکنتلا کا ناٹک دیکھنے جا رہا ہے؛

مراد کے منہ سے ایک ٹھنڈی آہ نکلی، وہ اپنے گھر ہی میں بیٹھے ایک ناٹک دیکھ رہا تھا۔ ایک دکھ بھرا ناٹک جسے شرفو نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ آج اسکے گھر گوشت بھنا جا رہا تھا اور وہ بیڑی کے بجائے جھنڈا

اوپندر ناتھ اشک

چٹان

شام کا سورج غروب ہونے سے پہلے ہی بادل کے دامن میں چھپ گیا تھا، اور اندھیرا وقت سے پہلے چاروں طرف چھا گیا تھا گگریٹ کے پہاڑی پڑاؤ میں دھواں دیتے ہوئے ایک دو ٹین کے چراغ بھی روشن ہو گئے تھے۔ جب پیدل چلتا ہوا تھکا ماندہ شنکر وہاں پہنچا۔

سب سے پہلے اس نے مختصر سے بازار کے ایک گھٹیا سے ڈھابے پر جا کر کسی نہ کسی طرح پیٹ کی آگ بجھائی، پھر وہ پناہ کی تلاش میں چل پڑا ـــــ یاتریوں کی اتنی بہتات تھی کہ دونوں سراؤں میں تل دھرنے کو بھی جگہ نہ تھی، بیشمار لوگ باہر کھلے ہی ڈیرے ڈالے پڑے تھے، اینٹیں رکھ کر چولھے جلائے گئے تھے۔ ٹھنڈی تیکھی ہوا چلنے لگی تھی، شعلے کانپ رہے تھے اور نیچے وادی میں چیل کے درخت سرسرا اُٹھے تھے۔

شنکر نے بےلبسی کی ایک نگاہ چاروں طرف ڈالی۔ اسے اپنے کپڑوں کی کم مائیگی کا بھی خیال آیا اور وُہ ان منا سا گھومتا گھومتا بازار سے نیچے وادی میں اُتر گیا۔

وہیں ایک چھپّن میں اُسے رات بھر کے لئے اسے پناہ کی جگہ مل گئی۔ کوئی ماسٹر جی تھے انہوں نے وہاں بچوں کے لئے ایک سکول کھول رکھا تھا، اور غریب پہاڑی لوگوں کے لئے ایک چھوٹا سا دواخانہ انہوں نے نیچے بچھانے کے لئے ایک چٹائی اسے دے دی اور اوپر اوڑھنے کو کمبل .... اور شنکر آرام سے لیٹ گیا

× × × × × × × × ×

لیٹ تو گیا، لیکن اسے نیند نہیں آئی۔ وہ بہت تھک گیا تھا یا کھانا ٹھیک طرح نہ کھا سکا تھا، یا پھر جگہ نئی تھی، کچھ بھی ہو وُہ سو نہ سکا، اٹھ کر کمبل کو کندھوں تک کھینچ کر وُہ کھڑکی میں بیٹھ گیا۔ اور وہیں بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھوں کے سامنے ماضی کے تمام واقعات ایک ایک کر کے پھر گئے۔

انہی دنوں جب وہ طالب علم تھا اور اپنے صوبے سے میلوں دُور اس پنجاب میں آ بسا تھا، اس کے دل میں نامعلوم طور پر کہیں سے ویراگ کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا، عورت اور دولت کی طرف سے اس کے من میں کچھ نفرت سی پیدا ہو گئی تھی، یہ جذبہ ان عقوبتوں کی وجہ سے پیدا ہوا جو اسے حصولِ تعلیم کے لئے اٹھانی پڑیں، ـــــ اس فرق کو دیکھ کر پیدا ہوا جو اُسے اپنے اور دوسرے طلبا کے درمیان نظر آیا۔ یا انگوروں کی دُوری نے انہیں کھٹا بنا دیا ـــــ کچھ بھی ہوا جب اس نے شاستری کرنے کے بعد بی۔ اے کی ڈگری لی، تو جسم سے نہ سہی، من سے وہ ویراگی بن چکا تھا۔

اس کے ماں باپ بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے، بھائی صرف بیس روپے تنخواہ پاتا تھا، لیکن اس کے اپنے تین بچے تھے، اور بیس میں وہ ان کا پیٹ ہی بڑی مشکل سے پال سکتا تھا، پھر وہ اپنے اس چھوٹے بھائی کے بوجھ کو کیسے برداشت کرتا۔ شنکر خود بھی اس پر بار ثابت نہ ہونا چاہتا تھا، اسی لئے جب اس نے سنا کہ پنجاب میں تعلیم کی کافی سہولت ہے ـــ سنسکرت کے دو تین امتحانات دے کر ایم۔ اے، ایم۔ او۔ ایل بنا جا سکتا ہے تو وہ کسی نہ کسی طرح کرایہ کا انتظام کر کے اپنے بہار سے اس پنجاب میں چلا آیا تھا ـــ

اس کے دل میں تعلیم حاصل کرنے کی ایک زبردست خواہش موجود تھی اور محض پندرہ بیس روپیہ ماہوار کما کر اپنی زندگی کو تباہ کرنا اسے منظور نہ تھا۔

پنجاب میں تعلیم کی سہولت تو تھی ہی ـــ انگریزی، حساب، ہندی سنسکرت، تاریخ، جغرافیہ، سائنس اور دھرم شکھشا ـــ سب کو

ایک ساتھ پڑھنے کی بجائے صرف ایک دو مضامین پڑھنے کے بعد یونیورسٹی کی سب سے بڑی ڈگری تو حاصل کی جا سکتی تھی، لیکن ان دو ایک مضامین کے لئے بھی تو کتابیں چاہئیں، اور ان کتابوں کو پڑھنے کے لئے تن میں جان چاہیئے، اور پھر جان کو قائم رکھنے کے لئے کھانے پینے کا سامان چاہیئے ۔۔۔ بی۔ اے تک کسی نہ کسی طرح ان سب کا انتظام کرتے کرتے وہ تنگ آ گیا تھا۔۔۔ اس دوران میں اسے کئی دھرم شالاؤں میں دن کاٹنے پڑے تھے ۔۔۔ کئی فاقے کرنے پڑے تھے۔ اور کئی سردیاں گرم کپڑوں کے بغیر گزارنی پڑی تھیں، یہی وجہ تھی کہ وہ بی۔ اے کرتے کرتے قنوطی ہو گیا تھا، اور قنوطیت کی زمین ویسے بے حد زرخیز ہے۔

کھڑکی کے باہر وادی تاریک تھی، کبھی کبھی کسی چھپر کا کوئی چراغ جھلملا اٹھتا تھا، باہر دیکھنا چھوڑ کر شنکر کھڑکی سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا ۔۔۔ کتنی دیر سے وہ بھٹک رہا تھا، اور ابھی اسے کتنا بھٹکنا باقی تھا، اور وہ منزل کی طرف کچھ بھی تو نہیں بڑھا ۔۔۔

انہی دنوں، جب وہ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد روزگار کی تلاش میں منہمک تھا، اس نے مایاوتی المورہ سے چھپی ہوئی سوامی رام کرشن کے اپدیشوں کی ایک کتاب پڑھی "عورت اور دولت" ۔۔۔ پہلی کے حسن وسحر اور دوسری کے جاہ وجلال کی طرف سے اس کا من اور بھی متنفر ہو گیا۔ پڑھائی چھوڑنے کے بعد اس کے من میں یہ خیال بھی کبھی سر اٹھایا کرتا تھا، کہ اپنی تمام بکھری ہوئی قوتوں کو جمع کر کے حوصلہ اور ہمت کے ساتھ، تمام تکالیف پہ عبور حاصل کر کے وہ ایم اے، ایم۔ او۔ ایل بن جائے، کسی اچھے سے کالج میں پروفیسر کے عہدہ پر فائز ہو کر اپنے ان تمام ساتھیوں کی نظروں میں اونچا اٹھ جائے، جو اسے ہیچ سمجھتے تھے، لیکن اس نے پڑھا کہ دولت تو کوئی ایسی چیز نہیں جس کے حصول کو زندگی کا مقصد بنایا جائے ۔۔۔ جسے حاصل کر کے اس پر غرور کیا جائے ....

"جب شام ہوتی ہے اور جگنو چمکنے لگتے ہیں تو وہ مسرت اور غرور سے ہو کے سینے پھیلاتے ہوئے کہتے ہیں ۔۔۔ سنسار کو روشن رکھنے والے ہم ہی ہیں، لیکن جب آسمان میں ستارے جگمگا اٹھتے ہیں تو انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے ۔۔۔ لیکن تب ستاروں کے دل میں بھی غلط فہمی جاگزیں ہو جاتی ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کے تاریک راستے انہی کے دم سے روشن ہیں، ان کی اس بیوقوفی پر چاند ہنستا ہے، اور ساری دنیا کو چاندنی میں نہلا دیتا ہے ۔۔۔ دنیا کو میں ہی روشن کرتا ہوں، وہ سوچتا ہے ۔۔۔ لیکن ادھر شفق پھول کر سورج کی آمد آمد کی خبر دیتی ہے، اور ادھر چاند کی ضو ماند ہو جاتی ہے ۔۔۔ امارت کا بھی تو یہی حال ہے، ہم اپنے جاہ و جلال پر غرور کرتے ہیں، لیکن اکثر کے مقابلہ میں ہم محض گداگر معلوم ہوتے ہیں ۔۔۔ اور پھر دولت سے سب کچھ مل سکتا ہے ۔۔۔ سکون تو میسر نہیں آ سکتا"

اور عورت ۔۔۔ وہ سوچا کرتا تھا، پروفیسر بن کر کسی حسین اور تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کرے گا۔ اور کالج کی ان تتلیوں کو، جو اس کی طرف نگاہِ غلط انداز سے بھی دیکھنا گوارا نہ کرتی تھیں دکھا دے گا کہ وہ ان سے کہیں زیادہ حسین ساتھی کی رفاقت کے قابل ہے ۔۔۔ شادی کے لئے ہندوستان میں ابھی تک بھی روپے اور رتبے کی زیادہ ضرورت ہے، ان کے مقابلے میں علم، دماغ، اور حسن اب بھی بازی ہار جاتے ہیں۔ اس نے بارہا اپنے سے کہیں زیادہ کالے کلوٹے لیکن متمول نوجوانوں کو حسین ترین بیویاں بغل میں لئے گھومتے دیکھا تھا، لیکن اس نے پڑھا ۔۔۔ یہ عورت ہی ہے جو انسان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیتی ہے، آزاد طائروں کے پر نوچ لیتی ہے، ضروریات زندگی کو بڑھا کر ان کے حصول کی خاطر اسے جھکنا سکھا دیتی ہے ۔۔۔ اور اس نے سوچا، نہیں، وہ نہیں جھکے گا، وہ آزاد رہے گا، آسمان کی بلندیوں میں اڑے گا، اور خوش آئند نغمے الاپے گا۔

اس نے منہ پر بھی کمبل لے لیا۔ اور لیٹ گیا۔ اوپر بازار میں ۔۔۔ گاڑیوں کی چرمر، چرچوں شروع ہو گئی تھی، پچھلے یاتری جو صبح منزل پر ہی پہنچ کر آرام کرنا چاہتے تھے، راستے کی راحت کا موہ چھوڑ کر چل دیئے تھے ۔۔۔ اس نے ایک سرد آہ بھری ۔۔۔ اسکی منزل کہاں ہے؟ اس نے سوچا، وہ تو کہیں بھی نہ پہنچ سکا ۔۔۔ نہ

یونیورسٹی کی سب سے بڑی ڈگری لے سکا۔ اور نہ آزادی سے آسمان کی بلندیوں میں اُڑ کر خوش آئند نغمے ہی الاپ سکا۔

خواہشات کو ترک کر دینے کے متعلق فیصلہ کرنا آسان ہے۔ لیکن اس فیصلہ کو عملی جامہ پہنانا آسان نہیں۔

اور ویراگی بن جانے کی بجائے، اس نے دوآبہ کے ایک نئے کھلے ہوئے سناتن دھرم ہائی سکول میں ملازمت کر لی، —— نئے اور پھر سناتن دھرم میں، اس لئے کہ وُہ ٹرینڈ نہ تھا، اور سرکاری یا پُرانے جمے ہوئے سکولوں میں اسے ملازمت نہ مل سکتی تھی —— یہ سکول نیا نیا کھلا تھا، وہ خود لاہور کے سناتن دھرم کالج کا گریجویٹ تھا، اس لئے پرنسپل کی سفارش کے ساتھ اسے وہ جگہ مل گئی تھی۔

لیکن سناتن دھرمی درسگاہوں کے پاس وہ پیسے کو جوڑ جوڑ کر رکھنا اور دور اندیشی سے خرچ کرنا کہاں، سال ہی میں وہ سکول بند ہوگیا۔ بات یہ ہوئی کہ دوآبہ کے ایک مشہور سیٹھ صاحب کو سٹے میں کئی لاکھ کا فائدہ ہُوا۔ تب انہوں نے ایک لاکھ روپیہ بلڈنگ کے لئے دے دیا۔ اور ایک بڑی رقم ماہوار دینے کا بھی فیصلہ کیا —— لیکن دوسرے سال سیٹھ صاحب کو سٹے میں خسارہ رہا اور رقم دینا انہوں نے بند کر دیا۔ سکول کے پاس بس وُہ بلڈنگ ہی رہ گئی۔ جس کی شان کو دیکھ کر سادھو سنتوں اور کتھا واچکوں نے اسے اپنا اڈہ بنانا نامناسب نہیں سمجھا —— !

شنکر آزاد ہوگیا لیکن وُہ آسمان کی گہرائیوں میں پھر بھی نہ اُڑ سکا۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کو بھی اس کا دل نہ چاہتا تھا، اور دُنیا کی تمام خواہشات کو ترک کرنے کے لئے مشق اور مشورے کی ضرورت ہے، یہ دونوں چیزیں اس کے پاس مفقود تھیں، آخر اس نے سوچا کہ وُہ اپنے دیس چلا جائیگا۔ وہاں کسی گورو کی تلاش کریگا، جو اسے صحیح رستے پر لگا دے، لیکن اپنے وطن کو جانے سے پیشتر وُہ کوہِ شوالک کی پہاڑیوں میں چنت پورنی کے اس میلہ کو دیکھنے کا لالچ نہ چھوڑ سکا تھا۔

چنت پورنی کا میلہ نوراتوں کے شروع میں ہوتا ہے۔ لیکن نوراتوں سے کئی دن پہلے دوابہ کے لوگ اس میلہ کی تیاریوں میں نہمک ہو جاتے ہیں، بھجن منڈلیاں، سیوا پارٹیاں، والنٹیر کوریں معرضِ وجود میں آجاتی ہیں، گہری نیند میں سوئے ہوئے مہابیر دل جاگ اُٹھتے ہیں۔ لوگ یاترا پر چلنے سے پہلے شہر میں جلوس نکالتے ہیں، گانے گاتے اور جیکارے بلاتے بلاتے ان کے چہرے سرخ ہو جاتے ہیں اور گلوں کی رگیں ابھر آتی ہیں، اس جوش و خروش کو دیکھ کر میلہ کو دیکھے بغیر دیس کو واپس چلے جانا، شنکر کے لئے ناممکن تھا۔

اور وُہ میلہ دیکھ آیا تھا، ہوشیار پور سے پیدل چنت پورنی تک گیا تھا اور وہاں سے پیدل ہی واپس آیا تھا۔ اس کے پاؤں میں درد تھا۔ ٹانگیں تھک گئی تھیں، اور اس کے دل میں ایک نامعلوم سی بےچینی کی آگ سلگ رہی تھی،

وہ اُٹھ کر پھر بیٹھ گیا، کھڑکی کے ساتھ اس نے سر ٹکا دیا۔ اور چپ چاپ باہر کی طرف دیکھنے لگا۔

آسمان پر تبتر کے پروں سے بادل چھائے تھے اور ان کے پیچھے سے چاند، اپنی مدھم سی روشنی کو پھیلانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اس روشنی سے مسافروں کو کچھ زیادہ فائدہ نہ پہنچتا تھا، سامنے، دُور سڑک پر شنکر لالٹینوں کی ٹمٹماتی روشنیوں کو دھیمی رفتار سے چلتے دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے کچھ پیدل چلنے والوں کے ہاتھوں میں تھیں، اور کچھ بیل گاڑیوں کے نیچے لٹک رہی تھیں، جب ایک روشنی کے بعد ایک لمبی قطار میں یکے بعد دیگرے روشنیاں نظر آتیں تو شنکر سمجھ جاتا کہ گاڑیوں کے آگے آگے ایک شخص ہاتھ میں لمپ لئے چلا جا رہا ہے ——

اور پھر یہ روشنیاں اسی طرح یکے بعد دیگرے تاریکی میں گم ہو جاتیں۔ اور اسی طرح بیل گاڑیوں کی آوازیں بھی کسی دور افتادہ ملک سے آنے والی آوازوں کی طرح معلوم ہونے لگتیں —— پھر نئی گاڑیاں آتیں، اور نئی روشنیاں .... لیکن نیچے وادی اسی طرح تاریک تھی اور چاند اوپر اسی طرح لہروں سی بدلیوں میں مسکرا رہا تھا۔

شنکر نے ایک لمبی سانس لی، پاؤں کی آہٹ پا کر وُہ چونکا شاید دوسرے مہمانوں کا انتظام کر کے ماسٹر جی ادھر سے ہی گذر رہے تھے۔

"نیند نہیں آ رہی کیا؟" کھڑکی کی مدھم روشنی میں اسے بیٹھے ہوئے دیکھ کر انہوں نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔ ماسٹر جی کی آواز

میں کچھ ایسی بات تھی، جو دوسروں میں بے ساختہ ایک احترام کے جذبہ کو جگا دیتی تھی۔

"جی نہیں" کھڑکی سے نگاہیں ہٹا کر اور کچھ گھبرا کر مڑتے ہوئے اس نے کہا۔ "مجھے ذرا دیر سے ہی نیند آتی ہے۔"

اس وقت ماسٹر جی خود بھی اس کے پاس، کچے فرش پر بچھی ہوئی چٹائی پر بیٹھ گئے۔

× × × × × × × × × × × ×

ماسٹر جی کی باتوں میں کچھ ایسا جادو تھا، ان کے حسنِ سلوک اور ان کی آواز میں کچھ ایسی ہمدردی تھی کہ شنکر نے ایک بھولے بھالے سادہ لوح بچے کی طرح اپنے دل کی تمام خلش، اپنی زندگی کی تمام کشمکش اور جد و جہد، دکھ اور ناکامیوں کو ان کے سامنے رکھ دیا۔

انہوں نے اسے تسلی دی۔ "اپنی مصیبتوں پر تمہیں دکھی نہ ہونا چاہیئے۔ زندگی میں وہ شخص ایک بڑی دولت سے محروم رہ جاتا ہے، جو یہ تجربہ حاصل نہیں کرتا۔ اسے جب مایوسی ہوتی ہے، اس پر جب مصیبت آتی ہے، تو اس کی کمر ٹوٹ جاتی ہے، لیکن جس نے تجربہ کا گھونٹ پیا ہوتا ہے، مایوسیاں اور مصیبتیں اس پر کچھ اثر نہیں رکھتیں۔"

شنکر چپ چاپ سنتا رہا۔

"تجربہ کا گھونٹ تلخ تو ضرور ہے" لمحہ بھر کے توقف کے بعد انہوں نے کہا "لیکن یہ انسان کو مستقل مزاجی بخشتا ہے، اسے آندھیوں اور طوفانوں میں غیر متزلزل فیصلے کرنے کی طاقت دیتا ہے، اور وہ آنکھیں عطا کرتا ہے، جو دکھ سکھ، مسرت و غم سب کو یکساں نظر سے دیکھتی ہیں۔"

اور شنکر نے محسوس کیا، جیسے ان کی آواز ایک ٹھنڈی، راحت بخش مرہم کی طرح اس کے تمام زخموں پر لگتی چلی جا رہی ہے،

وہیں بیٹھے بیٹھے ماسٹر جی نے بتایا کہ کس طرح انہوں نے خود ایک امیر گھرانے میں پیدا ہو کر ان تلخیوں کا مزا چکھا، باپ کے متمول ہونے کے باوجود انہوں نے اس سے کسی طرح کی امداد نہیں لی۔ رشتے داروں کے لنگر کو توڑ کر وہ اپنی زندگی کی کشتی کو خود کھیتے رہے —— وہ سرکاری ملازم رہے —— مدرس، کلرک، ایجاڈنٹ اور والنٹیر بنے —— کئی انجمنوں کے سیکرٹری رہے، کسانوں میں انہوں نے کام کیا، مہاتما گاندھی کے آشرم میں رہے، جیل بھی دو بار ہو آئے اور اس کے بعد انہوں نے نوعِ انسانی کی خدمت کے ساتھ ساتھ اپنی روح کی خدمت کرنے کا بھی فیصلہ کر لیا۔

"میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے" انہوں نے شنکر کی پیٹھ کو تھپتھپاتے ہوئے کہا کہ زندگی میں اگر کوئی اونچا مقصد نہیں، تو یہ زندگی کچھ بھی نہیں، ایک خالی، کھوکھلی سی چیز ہے، اور پھر اپنی روح کو زندگی کی تمام آلائشوں سے پاک کر کے اس عظیم، لامحدود، لاشریک طاقت کے ساتھ ملا دینے سے بڑا مقصد اور کونسا ہو سکتا ہے؟ زندگی کی دلدل لحظہ بہ لحظہ روح کو اپنے اندر دھنساتی چلی جاتی ہے، حتےٰ کہ دلدل رہ جاتی ہے روح نہیں رہتی، ایک ہی بار زور لگا کر روح کو اس دلدل سے آزاد کر لینا، آزاد فضا میں سانس لینا، آسمان کی بلندیوں میں اڑنا، اور قدرت کے ذرہ ذرہ میں اپنے پرتو کو دیکھنا —— اس سے بڑا مقصد اور اس سے بڑی آزادی اور کیا ہو سکتی ہے؟"

شنکر نے پر شکوک لہجے میں کہا۔ "لیکن یہ سب تو، سب کچھ ترک کر دینے، مایا موہ کے جال کو توڑ دینے سے ہی ہو سکتا ہے لیکن اگر سب تارک الدنیا ہی ہو جائیں تو ...."

"میں تارک الدنیا ہونے کے لئے نہیں کہتا" انہوں نے کہا۔ "دنیا میں رہو لیکن دنیا کے ہو کر نہ رہو، اس پہاڑ کی طرح، جس کے پاؤں پاتال کی تاریکیوں میں ہوتے ہیں، لیکن جس کی چوٹیاں ہمیشہ سنہری روشنی سے جگمگاتی رہتی ہیں۔"

"لیکن ...." مگر جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا، اس کے اظہار کے لئے اسے الفاظ نہ ملے —— اس کے تذبذب کو بھانپ کر ماسٹر جی بولے۔ "تم شاید کہنا چاہتے ہو کہ یہ آسان نہیں، ہاں یہ آسان نہیں، لیکن جو شخص ضبط کے پارس کو چھو کر ایک بار سونا بن جاتا ہے، وہ اگر برسوں زمین میں دبا رہے تو بھی سونے کا سونا رہتا ہے، ضبط کی تربیت حاصل کرنے کے بعد جو شخص اس دنیا میں داخل ہوتا ہے، دنیا کا کیچڑ اسے غلیظ نہیں کر سکتا۔ دنیوی خواہشات اس پر کچھ اثر نہیں رکھتیں —— وہ چٹان بن جاتا ہے اور خواہشات

کی کیلیں اس میں سوراخ کرنے کی بجائے خود مڑ جاتی ہیں۔"

× × × × × × × × × × × ×

شنکر کو اس رات نیند نہ آئی، ماسٹر جی کا ایک ایک لفظ اس کے کانوں میں گونجتا رہا، اور جب اس کی آنکھ لگی، تو اس نے اپنے آپ کو چٹان بنتے پایا ــــ چٹان، جس پہ مایا موہ کی بارشیں، آندھیاں اور طوفان کچھ اثر نہیں کرتے ــــ اس نے دیکھا کہ وہ سکھ دکھ کی پروا نہ کرکے، گاؤں کی روکھی سوکھی روٹی پہ خوش رہ کر، زمین پر سو کر بالکوں کو تعلیم دے رہا ہے، پھر اس نے اپنے آپ کو ادویات کا بیگ لئے گاؤں گاؤں گھومتے دیکھا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو جیل میں پڑے پایا، جہاں قیدیوں کو بہتر سلوک دلوانے کے لئے اس نے بھوک ہڑتال کی۔ اسے پیٹا گیا، اسے کوڑے لگائے گئے ــــ لیکن وہ خاموش متین، غیر متحرک بیٹھا رہا ــــ چٹان بن گیا تھا وہ۔

لیکن پھر اس نے اس چٹان کو بجلی کی سی سرعت سے ایک ڈھلوان پہاڑی پر لڑھکتے ہوئے نیچے سمندر کی ابلتی ہوئی لہروں کی طرف جاتے پایا ....

اور اس کی آنکھ کھل گئی، اس کا دل زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر پسینہ آگیا تھا، باہر پیپل کے درختوں میں ہوا کی سرسراہٹ کچھ اور تیز ہو گئی تھی، چاند شاید تھک کر سو گیا، لیکن شنکر جاگتا رہا۔

× × × × × × × × × × × ×

یہ ڈھلوان پہاڑی بھابی تھی، اور ابلتی ہوئی لہریں نفسانی خواہشات ــــ اس کا پتہ شنکر کو بہت دیر بعد لگا۔

× × × × × × × × × × × ×

بھابی، بھائی صاحب کی رفیقِ حیات تھی، وہ ماسٹر جی کو بھائی صاحب کے نام سے پکارنے لگا تھا۔

دوسری صبح اس نے اپنے آپ کو ماسٹر جی کے قدموں پر ڈال دیا تھا۔ اور انہوں نے اسے تسلی دی تھی، کہ خواہ اسے دھن دولت اور عیش و آرام نہ ملیں، لیکن اسے من کا سکون ضرور میسر آجائے گا اور وہ ان کے پاس ہی رہنے لگا تھا۔

اور پہلے پہل تو اسے یہ شانتی ملی بھی، جب وہ کبھی بھائی صاحب کے پاس بیٹھا، جب بھی اس نے ان کی باتیں سنیں اس کے من کو سکون میسر ہوا۔ اسے ایسا معلوم ہوا، جیسے تسکینِ نفس کا ایک بحرِ بیکراں موجزن ہے، اور وہ اس میں جی بھر کر ڈبکیاں لگا رہا ہے، ہاں بعد کی بات دوسری ہے۔

لوگ بھائی صاحب کو 'ماسٹر صاحب' اس لئے کہتے تھے، کہ انہوں نے اپنے خرچ پر دیہاتی بچوں کا ایک چھوٹا سا سکول کھول رکھا تھا، اس لحاظ سے وہ 'ڈاکٹر صاحب' بھی کہلوا سکتے تھے، اور کچھ لوگ انہیں اس نام سے پکارتے بھی تھے، لیکن ان کا اصلی نام دین دیال تھا اور اس نے بھابی سے ان کے متعلق بہت سی باتیں سنی تھیں۔

ماسٹر جی کے والد گورنمنٹ سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے، کافی روپیہ والے تھے، لیکن کالج چھوڑنے کے بعد ہی ان کو پبلک سیوا کی سنک (بھابی یہی لفظ استعمال کیا کرتی تھی) سوار ہو گئی۔ میڈیکل گروپ میں اچھے بھلے پڑھ رہے تھے، فرسٹ ایئر کا امتحان دیا تھا کہ کانگریس کی تحریک شروع ہو گئی۔ بس تعلیم سے ان کا من اچاٹ ہو گیا۔ والد نے سمجھا بجھا کر، ہل ملا کر، اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر میں ملازم کروا دیا۔ اور لگے ہاتھوں (ان کے نہ، نہ کرنے کے باوجود) شادی کر دی، لیکن ....

"نوکری سے استعفیٰ معلوم ہے، انہوں نے کیسے دیا؟" ایک دن کھانا پکاتے ہوئے بھابی کہنے لگی۔ "نہ وہم نہ گمان، بس سن لیا کہ استعفیٰ دے آئے ہیں اور پھر استعفیٰ میں صاف لکھ آئے کہ جس سرکار نے ہمیں ایک صدی سے غلام بنا رکھا ہے، اس کا پرزہ بن کر کام کرنا مجھے منظور نہیں، جب لالہ جی کو پتہ لگا (اپنے سسر کو بھابی لالہ جی کہہ کر پکارتی تھی) تو انہوں نے سر پیٹ لیا، وہ تھے سرکاری ملازم، انہوں نے بہتیرا سمجھایا کہ مجھے نوکری سے جواب مل جائے گا، افسران مجھے شک کی نظروں سے دیکھنے لگیں گے۔ لیکن یہ تو فیصلہ کرکے بدلنے کے دن پیدا ہی نہیں ہوئے، گھر چھوڑ کر گاندھی جی کے آشرم میں چلے گئے۔"

اس کے بعد بھائی صاحب نے پبلک سیوا کے بیسیوں کام کئے۔ والد انہیں ساری عمر سمجھاتے رہے، اپنے بڑھاپے کا واسطہ دلاتے رہے۔ لیکن وہ ہمیشہ اپنی دھن میں جنونیوں کی طرح لگے رہے۔۔ "آزادی کے حصول کو انہوں نے اپنا نصب العین بنا لیا۔ سوشل اور سیاسی آزادی کے لئے کوشش کرتے کرتے وہ روح کی آزادی کے لئے کوشش کرنے لگے، انہی دنوں میں ان کے والد فوت ہو گئے۔ تب ان کے حصہ میں جو روپیہ آیا۔ اسے بنک میں جمع کرانے کے بعد بچوں کو بورڈنگ ہاؤس میں داخل کر کے وہ گنگریٹ آ رہے۔ یہاں انہوں نے یوگ سادھن کا چھوٹا سا آشرم کھول لیا، بنک کے سود سے بچوں کی تعلیم کا خرچ نکال کر جو بچتا تھا، اس سے آشرم کا خرچ چلانے لگے۔ جس میں انہوں نے ایک چھوٹا سا سکول اور دواخانہ بھی کھول دیا۔ "یہ تو مجھے بھی وہاں ہی چھوڑتے تھے" ایک دن بھابی نے اسے بتایا۔ "لیکن میں رہی نہیں، ساتھ ہی آ گئی"

× × × × × × × × × × × ×

لیکن یہاں آ کر بھابی خوش ہو، یہ بات تو نہ تھی، شنکر نے اسے کم ہی ہنستے دیکھا تھا۔ جب بھی کبھی وہ ہنسی تھی، شنکر کو اس کی ہنسی میں ایک گہرے سوز، اور طنز کی لکیر صاف دکھائی دی تھی اور پھر شنکر نے سنا تھا کہ اس کا دل بڑا کمزور ہے، ذرا سی بات پر بے طرح دھڑکنے لگتا ہے فٹ بھی آ جاتے ہیں اور سر درد کی شکایت بھی عام رہتی ہے۔ اور اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی تشنگی، کچھ ایسی پیاس رہتی تھی کہ شنکر کے من میں رحم کا ہلکا سا جذبہ بیدار ہو جاتا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔

لیکن وہ اس کی آنکھوں میں کم ہی دیکھتا تھا، بھائی صاحب سے اس نے سیکھا تھا کہ عورت سے بچنے کے لئے ہمیشہ اس کے پاؤں کی طرف دیکھو، اسے ہمیشہ ماں کے روپ میں دیکھو، اور وہ ایسا ہی کرتا تھا۔ بھابی اسے سارے سنسار کی ماں کے روپ میں دکھائی دیتی اور دل ہی دل میں وہ اس کے چرنوں میں جھک جایا کرتا، اور ایسا کرنے میں اسے بے انتہا سکون اور روحانی قوت حاصل ہوتی، لیکن ایسے بھی موقعے پیش آتے جب اس کے ضبط اور سکون کے پاؤں ڈگمگا جاتے۔۔۔۔۔۔۔۔۔

بھابی پکا رہی تھی اور وہ نیچی نظر کئے رسوئی میں کھانا کھا رہا تھا کہ بات چل پڑی، روکھی سوکھی روٹیوں اور پراٹھوں کے متعلق، اور تب بھابی نے اسے بتایا کہ بھائی صاحب کے ساتھ ہمیشہ اَن چپڑی روٹیاں کھانے کی وجہ سے اب تو اسے یہ ہضم ہی نہیں ہوتے۔ لیکن پراٹھے کھانے کی وہ بڑی شوقین تھی، وہ روکھی سوکھی روٹی کھا ہی نہ سکتی تھی، وہ اپنے پتا کی اکلوتی لڑکی تھی اس کے والد ایگزکٹو انجینئر تھے، اور پھر آنکھیں بھر کر اس نے شنکر کو بتایا تھا کہ کس طرح اس کے والد کی موت کے بعد چچا نے جو ان کے خرچ پر ہی ولایت پڑھ کر آئے تھے، ان کی بہت سی جائداد سنبھال لی اور کس طرح دادی نے بھی چچا کی امداد کی، اور کس طرح اس کی ماں کو تنگ کیا گیا اور کس طرح اسے پہلی دفعہ فٹ آیا تھا۔۔۔۔۔!

شنکر نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تھا، بھابی دوپٹے سے آنسو پونچھ رہی تھی، اس کے دل میں رحم کا ایک ہلکا سا جذبہ بیدار ہو گیا تھا۔۔۔ اس کے دوپٹہ ہٹانے سے پہلے اس نے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں۔۔۔!

پھر ایک دن بھابی نے اسے بتایا کہ وہ یوں گم سم رہنے والی بھی نہ تھی کھیلنے کودنے، ہنسنے ہنسانے والی لڑکی تھی، وہ اس زور سے قہقہہ لگایا کرتی تھی کہ اس کی ماں کو بارہا اسے جھڑکنا پڑتا تھا۔ ۔۔۔۔"اس طرح قہقہے لگائیگی تو سسرال والے تجھے گھر سے نکال دیں گے"۔۔۔۔! اسے کیا معلوم تھا کہ سسرال جا کر اس کے قہقہوں کا سرچشمہ ہی سوکھ جائے گا۔۔۔ اور ایک غمگین مسکراہٹ سے بھابی کے ہونٹ پھیل گئے۔

شنکر آنکھیں اٹھائے بغیر رہ سکا تھا، لیکن بھابی اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی، اس لئے اس نے اپنی نگاہیں حسب سابق اس کے پاؤں میں جما دیں۔۔۔!

بھائی صاحب کی سرگرمیوں، ان کی اس قربانی، ایثار، زندگی کے اس گہرے فلسفے سے بھابی کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔۔۔ "لوگوں کی بلا اپنے سر لیتے ہیں" اس نے ایک دن شنکر سے کہا تھا اور پوچھا تھا کہ خواہ

خواہ مخواہ مصیبت مول لینا اچھی بات ہے کیا؟" اور پھر بتایا تھا کہ کس طرح جب وُہ ہوشیار پور کے ایک نیشنل سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اور وہاں کی کانگرس کمیٹی کے سیکرٹری تھے، انہوں نے ایک لڑکی کی مدد کی تھی، اور خواہ مخواہ بدنامی مول لی تھی۔

اس لڑکی کے ماں باپ مر گئے تھے، بھائی آوارہ تھے، اور ماموں اُسے ایک بوڑھے کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتے تھے۔ اُن کے پڑوس ہی میں وُہ رہتی تھی، ایک دن گھر سے بھاگ کر وُہ انکی پناہ میں آگئی، انہوں نے اس کی شادی نہ ہونے دی، اسے تعلیم دے کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنایا، لیکن لوگ طرح طرح کی باتیں بنانے لگے، ان کے چال چلن پر شک کرنے لگے ___ زہر خندہ سے بھابی کے ہونٹ پھیل گئے ___ "اتنی دیر ہوگئی" اس نے کہا "مُنّی کے جنم کے بعد جو مجھے ہی بہن کی طرح سمجھتے ہیں، ان پر وہ لڑکی ہی کیا جادو کر دیتی؟" ___ اور مُنّی ان کی دوسری لڑکی تھی، اور آٹھ برس کی تھی۔

شنکر نے دبی ہوئی نگاہ سے بھابی کی طرف دیکھا تھا، وُہ اس کی قمیص میں بٹن ٹانک رہی تھی، اس کے خوبصورت چہرے پر بے اطمینانی کا ایک ہلکا سا سایہ تھا، آنکھیں تھکی تھکی تھیں اور دوپہر کی تمازت سے کملائے پتوں کی طرح اس کے ہونٹ خشک اور مرجھائے ہوئے تھے، شنکر کے دل میں رحم کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا، اور اس کا دل دھک دھک کر اُٹھا۔

××× ××× ××× ×××

دوسرے دن بھائی صاحب نے اسے بتایا کہ اگرچہ ان لوگوں کے لئے جو روح کی مکمل آزادی چاہتے ہیں، دولت اور عورت کی خواہش کو بالکل ترک کر دینا از بس ضروری ہے لیکن دنیا داروں کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ دولت اور عورت کے درمیان رہتے ہوئے بھی اپنی لَو پرماتما سے لگائے رکھیں، اس شادی شدہ شخص کے لئے جو اپنی روح کو آزاد دیکھنا چاہتا ہے، یہ ضروری ہے کہ جب ایک دو بچے پیدا ہو جائیں تو اپنی بیوی کے ساتھ بھائی کی طرح رہے......

شنکر کچھ کہنے لگا تھا، لیکن کچھ...

بھائی صاحب بولے، "میں جانتا ہوں جو تم پوچھنا چاہتے ہو، ایسا کرنا مشکل ہے لیکن میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں، میں یہ نہیں کہتا کہ میں نے اپنے جذبات پر پورا پورا قابو حاصل کر لیا ہے لیکن میں نے ان ہدایات پر لفظ بہ لفظ عمل کرنے کی کوشش کی ہے اور مجھے کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے، اس ضبط کو حاصل کرنے کے لئے مشق کی ضرورت ہے، انسان کو چاہیئے کہ وہ ہفتہ میں دو ایک دن ضرور دولت اور عورت کی دنیا سے دور رہ کر تنہائی میں بسر کرے روحانی قوت حاصل کرے اور خدا سے دعا کرے کہ وہ شوہر اور بیوی دونوں کو روحانی زندگی بسر کرنے کی طاقت بخشے۔

اور بھائی صاحب اب بھی دو تین دن تنہائی میں، گزارتے تھے۔

لیکن بھابی کو ضرور ہی ان دنوں میں کوئی نہ کوئی تکلیف ہو جاتی۔ دل دھڑکنے لگتا، یا سر درد! شنکر کو ایک دو بار اس کا سر دبانا پڑا تھا، کنپٹیوں پر تیل لگانا پڑا تھا اور ایک دن کنپٹی سہلاتے سہلاتے اس کا ہاتھ بھابی کے نرم گرم گال تک چلا گیا تھا ___ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا تھا اور وہ اسی وقت سر دبانا بیچ میں ہی چھوڑ کر اُٹھ آیا تھا، اس نے اپنے آپ کو لعنت ملامت کی تھی، اور فیصلہ کیا تھا کہ وہ اب کبھی بھابی کا سر نہ دبائیگا۔ لیکن ایک دن اُسے فِٹ آگیا اور بھائی صاحب حسبِ دستور نیچے وادی میں ایک خوبصورت، فرحت افزا جگہ سارا دن گزارنے کے لئے گئے ہوئے تھے۔

بھابی کو فِٹ پہلے بھی آتے، ماں کے دُکھ کی باتیں کرتے کرتے، چچا کی بے وفائی کا ذکر چل پڑنے پر، یا پھر منوہر ___ اپنے سسر کے بڑے بھائی کے مرحوم چھوٹے لڑکے کی یاد آ جانے پر، اسکی ہنسی، اس کے مذاق، اس کی باتوں، بھابی کی فرمائشوں کو پورا کرنے کے لئے اس کے اشتیاق، اس کی ہر ادا کا ذکر کرتے ہوئے بھابی رو پڑتی، اور اُسے فِٹ آ جاتا۔

لیکن ان دَوروں، سر دردوں یا دل کی بیماری کے اِن

مُڑ رہتے، اور کبھی جب ان کی موجودگی میں کوئی ایسی ویسی بات ہو جانے پر بھابی کی بیماری عود کر آتی تو وہ کبھی نہ گھبراتے، جیسے یہ بھی ان کی ریاضت کا ایک حصہ تھا۔ ہاں رات کا پڑھنا، اور صبح کا چرخہ کاتنا وہ چھوڑ دیتے اور بھابی کے سرہانے آ بیٹھتے، اس ٹھنڈی تیمارداری سے بھابی کو سچ مچ کوئی فائدہ پہنچتا ہو۔ یہ تو شنکر نہیں جان سکا، لیکن بھابی جلد ہی بستر چھوڑ دیتی۔ اور بھائی صاحب خود کھانا بنانے سے بچ جاتے۔

لیکن اس دن جب بھابی کو فٹ آیا تو شنکر حیران رہ گیا تھا، شام ہو گئی تھی، اور بھائی صاحب آئے نہ تھے۔ شاید اِدھر اُدھر کسی مریض کو دیکھنے چلے گئے تھے، اور وہ اندر کمرے میں دیا سلائی لینے گیا تھا، کہ اس نے تاریکی میں سسکنے کی آواز سنی۔

پہلے تو کمرے میں اندھیرا دیکھ کر اس نے سمجھا تھا کہ بھابی اندر نہیں ہے، اور وہ طاق سے دیا سلائی کی ڈبیا اٹھانے لگا تھا لیکن اسی وقت اس نے سنا جیسے بستر پر لیٹا ہوا کوئی سسک رہا ہے،

"بھابی"

سسکیاں اور بھی تیز ہو گئیں۔

"بھابی..... بھابی!"

"ہائے میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے!" اور وہ اونچے اونچے چیخنے لگی۔

"بھابی!"....... اور وہ بستر کے قریب چلا گیا۔

"ہائے میرا دل ڈوب رہا ہے ---!" اور بھابی تڑپ رہی تھی ---!

شنکر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، اس نے جلدی سے لیمپ جلانے کی کوشش کی لیکن تین دیا سلائیاں جلانے کے بعد وہ کہیں لیمپ روشن کر سکا۔

لیمپ جلا کر وہ بھابی کے پاس آیا۔ وہ اسی طرح دل پر ہاتھ رکھے اونچے اونچے چیخ رہی تھی، اِدھر سے اُدھر، اور اُدھر سے ... تھی

ایسا سخت دورہ شنکر کی موجودگی میں بھابی کو پہلے کبھی نہ پڑا تھا۔ ایک دفعہ پہلے جب اسے دل کی تکلیف ہوئی تھی، تو بھائی صاحب نے اُسے سپرٹ امونیا پلائی تھی، وہ بھاگ کر بھائی صاحب کے کمرے سے دوائی کی شیشی اٹھا لایا۔ اور اس نے ایک چمچہ بھرا۔

"ہائے یہ مجھے اچھی نہیں لگتی۔" بھابی چیخی اور اس نے دانت بند کر لئے۔

اور سب کی سب دوائی اس کے گال پر سے ہوتی ہوئی گردن پر بہہ گئی۔

"نہ پیئیں گی تو آرام کیسے آئے گا؟" اس نے چڑ کر کہا اور پھر چمچہ بھرا۔

لیکن بھابی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور وہ بدستور چیختی رہی۔

اس بار شنکر نے لحاف اس کے گلے تک کر دیا۔ چارپائی پر بیٹھ کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور انہیں اس کی چھاتی پر رکھ کر ان پر اپنا گھٹنا رکھ دیا۔ چمچہ بھر کر ایک ہاتھ سے اس کا منہ کھول کر دوائی پلا دی۔ پھر سنبھل کر نیچے اُتر آیا۔ لیکن اتنے ہی سے اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا تھا۔ اور اس کا دل دھڑکنے لگا تھا۔

بھابی نے لحاف کو ہاتھ سے پرے کر دیا، دوائی کی کڑواہٹ سے ایک دو بار کھانسی، اور پھر ہاتھ سے سینے کو دبا کر اسی طرح چیخنے لگی۔

"ابھی آرام آ جائے گا، دوائی کو اندر تو جانے دیں" شنکر نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"ہائے میرے دل کو دباؤ، میرا دل ڈوب رہا ہے۔"

شنکر نے پھر لحاف کو اوپر کر کے، بھابی کے سینہ کو ہاتھ سے دبایا، دھک دھک بھابی کا دل دھڑک رہا تھا۔

"اور دباؤ" اسے جیسے تسکین مل رہی تھی،

شنکر چارپائی کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس نے دونوں ہاتھ بھابی کے دل پر رکھ دیئے۔ دباتے دباتے وہ اتنا

جھک گیا کہ اس کا اپنا سینہ ——— دھک دھک کرتا ہوا سینہ — بھابی کے سینے پر بچھ سا گیا۔

بھابی کو تسکین محسوس ہونے لگی، اس کی چیخیں گھٹ گئیں اب وُہ صرف سسک رہی تھی ....

لیکن شنکر کے اعصاب تن رہے تھے اور اس کا جسم گرم ہو رہا تھا، اس کا دل اور بھی زور سے دھڑک رہا تھا کہ اسی وقت بھائی صاحب آ گئے، اس کی جگہ انہوں نے سنبھال لی اور دوائی کے اثر یا ان کی آمد کی وجہ سے بھابی کو بھی آرام آ گیا۔

× × × × × × × × × × × ×

شنکر اس رات سو نہ سکا تھا، ردِّ عمل طوفان کی طرح اس کے سینے میں اُٹھ رہا تھا۔ بھائی صاحب کی صورت اس کے سامنے بار بار آ رہی تھی، ——— اس شخص نے اتنے بڑے سکھ کو تلانجلی دی ہے تب ہی روحانیت کے آسمان میں پرواز کر سکا ہے، تب ہی روح کو آزاد کر سکا ہے۔ اور وُہ خود ذرا سا ٹکڑا آگے پا کر لپک اُٹھا۔

...... لیکن جسم کی بھوک ....

اور دوسرے دن اس نے بھائی صاحب کے سامنے اپنے تمام شکوک رکھ دیئے، جنسی ضرورتوں کا ذکر کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔ کہ دوسرے کے جسم کو سامنے پا کر بھی ضبط رکھنا کس طرح ممکن ہے۔

بھائی صاحب ہنسے ——"جسم کی ضرورتیں بھی" انہوں نے کہا تھا "دوسری ضرورتوں کی طرح ہی ہیں، جس طرح ہم اپنی دوسری ضرورتوں کو اپنے بس میں کر لیتے ہیں، اسی طرح ان کو بھی بس میں کیا جا سکتا ہے، ہم اپنی خواہشات اور ضروریات کو جتنا بڑھا لیتے ہیں، اتنا ہی وُہ بڑھ جاتی ہیں اور جتنا گھٹا لیتے ہیں اتنا ہی گھٹ جاتی ہیں، خواہشات اور ضروریات کی دنیا میں ہنتا ہوا بھی انسان ضبط اور ریاضت سے ان پر قابو پا سکتا ہے، اُسے دراصل چٹان بن جانا چاہیئے ——— ایسی چٹان، جو بارش اور دھوپ دونوں کو سہہ سکے، ضروریات کی زیادتی یا کمی، کوئی بھی

'چٹان' اور 'سکون' دو الفاظ شنکر کے دماغ میں گھومتے رہے تھے، اور اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ چٹان بن جائیگا ——— چٹان جیسا ہی غیر متزلزل سکون حاصل کریگا ——— اپنی خواہشات پر قابو پائے گا ——— ایک بار اُن کے آگے ہتھیار ڈالے اگر انسان ان کی دلدل میں دھنسا، نہیں وُہ ان کے اوپر اڑے گا ——— آزاد اور وسیع آسمان کی بلندیوں میں۔

× × × × × × × × ×

لیکن بھابی جو وہاں تھی ——— بے اطمینانی کی سلگتی ہوئی چنگاری!

× × × × × × × × ×

ایک رات بھائی صاحب ساتھ کے گاؤں میں مریض کو دیکھنے گئے ہوئے تھے، شنکر اپنے کمرے میں دیوار سے پیٹھ لگائے کھونٹی سے ٹنگی ہوئی لیمپ کے نیچے بیٹھا مطالعہ میں مصروف تھا کہ بھابی وہیں آ گئی۔ اور پھر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ شنکر خاموشی سے کتاب پڑھتا رہا، بھابی بیٹھی رہی ——— وہ پڑھتا رہا۔ پھر ایک انگڑائی سی لے کر وہ وہیں چٹائی پر اس کے پاس لیٹ گئی،

شنکر نے کنکھیوں سے ایک بار اس کی طرف دیکھا ——— ساڑھی کا دامن سر سے کھسک گیا تھا، بلاؤز کا بٹن کھل گیا تھا۔ سینہ قدرے ننگا ہو گیا تھا، .... شنکر نے آنکھیں ہٹا لیں، لیکن الفاظ اس کی آنکھوں کے آگے تیرنے لگے۔ اور پھر اسے صرف سیاہ لکیروں کے سوا کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ اور پھر اس کے سامنے کتاب بھی نہ رہی ——— رہی صرف پاس لیٹی ہوئی عورت کے سینہ کی گہری سی اندھیری سی لکیر، جو ——— دو کوہستانوں کے درمیان کسی وادی کی طرح دور اندھیرے میں گم ہو جاتی تھی،

شنکر نے پھر ایک بار دیکھا ——— کنکھیوں سے ——— وہیں دو پہاڑیوں کے درمیان اندھیری سی وادی کی طرف۔

اور اس کا سینہ دھک دھک کرنے لگا ... [illegible]

وادی پر پھسلتی ہوئیں بھابی کے چہرے پر جا لگیں۔ بھابی بے حس و حرکت بیہوش سی پڑی تھی، اس کے ہونٹ سوکھے ہوئے تھے، اور اُن کی پپڑیوں میں عمودی سی لکیریں پڑی ہوئی تھیں — وہاں شنکر کی نگاہیں جم گئیں اور اس نے چاہا کہ ان پیاسے خشک ہونٹوں کو چوم لے —— اس زور سے چوم لے کہ ان لکیروں میں خون سمٹ آئے، اور وہ جھکا۔

اس وقت بھابی نے آنکھیں کھول دیں، وہی پیاسی پیاسی، اداس، اداس تشنہ آنکھیں، انہی آنکھوں میں دیکھتا ہوا وہ اور جھکا ....

لیکن وہ رُک گیا، وہ لکیریں اس کے سامنے سُرخ خون میں کیلیں سی بن گئیں، اور اس نے دیکھا کہ وہ کیلیں چٹان میں سوراخ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں .... وہ رُک گیا۔ رُکا اور اُٹھا، بھابی کے اوپر سے گزرتا ہوا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا—— تیز تیز چلنے لگا۔ اور پھر قریب قریب بھاگنے لگا—— گویا وہ کسی بھیڑیے سے بچکر بھاگ رہا ہو، ننگے پاؤں، ننگے سر، رات کی سائیں سائیں کو توڑتا ہوا—— مٹ میلی چاندنی کو چیرتا ہوا ......

خنکی کافی تھی—— اور ہوا چیل کے درختوں سے ٹکرا کر چیخ رہی تھی،

××× ××× ××× ×××

صبح نے شنکر کو ایک سنگلاخ چٹان پر بیٹھے ہوئے پایا اس کے گھٹنوں تک مٹی چڑھ گئی تھی، تلووں میں چھالے پڑ گئے تھے، ایک پاؤں پر ٹھوکر لگ جانے سے ناخن تھوڑا سا اڑ گیا تھا۔ اور شاید وہ تھک ہار کر اسی چٹان پر بیٹھ گیا تھا۔ اور شاید اونگھ بھی گیا تھا،

شنکر نے آنکھیں کھولیں —— دُور، حدِ نظر کے آخری نقطہ پر پہاڑیاں چھوٹی ہوتی ہوتی، میدان سے مل گئی تھیں، اور وہاں "سواں" چمک رہی تھی، جو ان پہاڑیوں کے پانی کی نذر سمندر کے حضور میں لے جاتی تھی، اور پس منظر میں ہوشیار پور کے مکانوں کی دھندلی سی چھتیں ہرے بھرے درختوں میں نظر آ رہی تھیں اس نے دایاں ہاتھ اپنے خشک بکھرے ہوئے بالوں پر پھیرا اور ٹانگ پسار لی۔ اس کا گھٹنا درد کرنے لگا۔ اور انگوٹھے کی ٹیس بھی جاگ اٹھی۔ ایک حیرت زدہ سی نگاہ اس نے چاروں طرف ڈالی، جیسے وہ ان پہاڑیوں کو چیل کے درختوں سے بھری ہوئی ان پہاڑیوں کو نئے سرے سے دیکھ رہا ہو۔

اس نے بایاں ہاتھ پسارا، ایک ننھا سا پودہ اس کے ہاتھ کے نیچے مسلا مسلا سا رہ گیا، شنکر نے دیکھا، سنگلاخ چٹان کی ایک سلوٹ پر اوپر سے کچھ مٹی آ گری تھی، ہوا میں اڑتا ہوا کوئی بیج آ پڑا تھا، بارش کی نمی سے یہ ننھا سا پودہ بھی پھوٹ پڑا۔ لیکن چٹان تو چٹان تھی—— پتھر۔ اس کی جڑوں کو پھیلنے کے لئے ذرا سی جگہ بھی نہ دینا چاہتی تھی، —— اور وہ پودہ مرجھا رہا تھا۔ —— اور اس کے پتے زرد ہو کر کمہلا رہے تھے۔

شنکر اُٹھا اور حیران نگاہوں سے دونوں کو دیکھنے لگا—— اور پھر وہیں کھڑے کھڑے اس چٹان پر اسے ایک اور چٹان کا خاکہ بنتا دکھائی دیا—— اور اس پودے کی جگہ ایک اور روز بروز مرجھاتا، کمہلاتا پودہ اسکی آنکھوں میں پھر گیا۔

عجائباتِ ہندوستان

از خانصاحب احمد حسین صاحب

ہندوستان کی دیرینہ و سابقہ مشہورِ عالم عمارات پرانے کھنڈرات جو چند سال پیشتر معلوم ہوئے عجیب و غریب پل اور خانقاہیں کے دلآویز حالات جو آجتک کسی نے لکھے تھے فاضل مصنف نے نہایت جانفشانی سے جمع کر کے ایک عمدہ مجلد کتاب کی صورت میں پیش کئے ہیں۔ قیمت مجلد عہ

مشاہیر عالم

اس کتاب میں سولہ مشاہیر عالم کے حالاتِ زندگی درج ہیں۔ جو وہ زمانہ کے سب مشاہیر ایسے ہیں جن کے نام سے دنیا کا بچہ بچہ واقف ہے جنکی ذاتیں ادنیٰ اعلیٰ، جاہل اور تعلیم یافتہ ہر ایک دلچسپی رکھتا ہے اور جن کے صحیح اور مستند حالات سے متعارف ہونیکا ہر دل میں شوق ہے۔ ہم نے اس کتاب کو نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ قیمت عہ

اختر انصاری

لو ایک قصّہ سُنو!

"میں بھاموں میں نہیں رہ سکتا۔ ہندوستان واپس آرہا ہوں"
چھوٹے بھائی کے متعدد خطوط جو اس مضمون پر مشتمل تھے۔ برابر آچکے تھے میری کاہلی جواب لکھنے کی اجازت ہی نہ دیتی تھی۔ روز ارادہ کرتا تھا اور روز یہ ارادہ ملتوی ہو جاتا تھا۔ جب نصف درجن خطوط جمع ہو گئے اور یوں بھی اپنی خیریت کا خط لکھے بغیر کم و بیش دو مہینے گزر چکے، تو ایک دن غیر معمولی عزم سے کام لیکر کاغذ اور قلم دوات لیکر بیٹھا، اور تہیہ کر لیا کہ نہایت مفصل خط لکھوں گا اور انتہائی چرب زبانی اور دلائل آفرینی سے کام لونگا۔ تاکہ ننّن میاں ہندوستان واپس آنے کے خیال سے تائب ہو کر بھاموں میں اپنا قیام جاری رکھنے پر مجبور ہو جائیں۔

ننّن میاں! خدا تمہیں خوش رکھے! تم خدا کو سرمایہ داروں کے دماغ کی پیداوار سمجھتے ہو لیکن میں اُس خدا پر ایمان رکھتا ہوں جس کا وجود سرمایہ داروں کے وجود سے بہت پرانا ہے۔ اس لئے بھائی! میں تو اپنا خط اسی دعا سے شروع کروں گا کہ خدا تمہیں خوش رکھے، نیک اعمال کی توفیق دے اور ایمان کی روشنی عطا فرمائے! آمین! لو، ایک قصہ سنو! "ایمان کی روشنی" پر یاد آگیا:۔

بہت دنوں کی بات ہے۔ میں برسات کا لطف اُٹھانے کے لئے مہرولی میں یوسف کے ہاں مقیم تھا۔ ایک دن قطب مینار کی سیر کو گئے ہم لوگ ہانپتے کانپتے سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے۔ ہمارے پیچھے پیچھے نوجوانوں کی ایک ٹولی تھی، اور کہیں اُن کے قریب ہی کچھ برقع پوش عورتیں تھیں عورتیں برقع پوش ضرور تھیں۔ مگر اُن کے چہرے بے نقاب تھے۔ اور وہ آزادی کے ساتھ ہنستی بولتی، قہقہے لگاتی اور "اوئی اللہ" اور "ربّ ہے" کی و لفریب چیخیں بلند کرتی ہوئی غیر مردوں کے دوش بدوش سیڑھیاں طے کر رہی تھیں۔ ماحول کی تبدیلی بھی کیسی عجیب چیز ہوتی ہے

ننّن میاں! ذرا غور کرنے کی بات ہے۔ یہی عورتیں جو شہری زندگی اور معاشری زندگی کی حدود میں رہتے ہوئے ہمیں اپنی جھلک بھی دکھانا گوارا نہ کرتیں، اب اس زندگی سے دُور ——— بلکہ بلند ——— ہو کر اپنے آپ کو کسی قدر آزاد محسوس کر رہی تھیں! خیر تو نوجوانوں کی اُس ٹولی میں ایک بگڑے دل بھی موجود تھے۔ دو چار گوری چٹی صورتیں جو دیکھیں تو اُتر آئے شرارت پر۔ اپنے کسی ساتھی سے بولے "ہاں یار، روشنی تو یہاں بہت ہے، پھر لالٹینوں کی کیا ضرورت ہے؟" اُن عورتوں کے ساتھ ایک بوڑھی عورت تھی۔ اُس نے پٹ سے جواب دیا "میاں صاحبزادے! ایمان کی روشنی چاہیئے۔ یہ لالٹینیں تو بہت جلدی بجھ جائیں گی" نہ پوچھ کیا حال ہوا سُننے والوں کا۔ جتنے تھے سب پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ کیا منہ توڑ جواب دیا ہے۔ بڑھیا نے! کمال کر دیا۔ سچ مچ افلاطون کی نانی تھی کم بخت!

تو غرض یہ ہے ننّن میاں! کہ ایمان کی روشنی بڑی چیز ہے۔

اب تک جو کچھ لکھا گیا وہ تمہید کے طور پر تھا۔ اب کام کی باتیں سنو ماموں جان کے خطوط سے اور خود تمہاری تحریروں سے یہ معلوم ہوا کہ بھاموں میں تمہارا جی نہیں لگتا، اور تم وہاں رہنا فضول سمجھتے ہو۔ میں نے اپنے پچھلے خط میں یہ لکھا تھا کہ تم اپنے آپ کو مطالعے میں مصروف کر دو۔ اس سے اُن فائدوں کے علاوہ جو مطالعے سے حاصل ہوتے ہیں، ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ تم اپنا وقت آسانی کے ساتھ کاٹ سکو گے۔ لیکن تم نے میرے اس خیال کو مہمل سمجھا۔ بات بھی ٹھیک ہے پڑھنے سے تمہیں دلچسپی تھی ہی کب جو اب ہو گی۔ جب طالب علمی کے زمانے میں نہیں پڑھا تو اب کیا خاک پڑھو گے تم کو پڑھنے کا مشورہ دینا واقعی ایک فضول اور مہمل سی بات ہے۔ مگر ننّن میاں! تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ میں چونکہ بھاموں جیسے وحشت خیز مقام پر نہیں رہا ہوں، گھر سے نکل کر کہیں گیا ہوں تو انگلستان گیا ہوں، اس لئے تمہاری پریشانی اور بے لطفی کا اندازہ

نہیں کر سکتا۔ یقین مانو میں تمہاری دماغی حالت اور قلبی کیفیت سے اتنا واقف ہوں جتنے تم خود بھی نہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں کوئی صاحبِ کرامات بزرگ ہوں اور غیب کا حال جانتا ہوں، بلکہ صرف یہ کہ میں بھی ان حالات سے دوچار ہو چکا ہوں اور یہ آفت مجھ پر بھی بیت چکی ہے۔ تم نے میرے لندن جانے کا ذکر ناحق کیا۔ میں اس کی شکایت نہیں کرتا کہ تم نے میرے اوپر ایک ہلکی سی چوٹ کی اور لطیف طنز سے کام لیا بلکہ صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم نے اپنی موافقت میں کوئی بات نہیں کہی۔ جو کچھ کیا میری موافقت میں کہا سوچ سمجھ کے بات کیا کرو۔ بتن میاں! کیا تم نہیں جانتے کہ جس دن میں لندن پہنچا اس کے دوسرے دن لندن سے متنفر ہو گیا اور وطن کی یاد میں آنسو بہانے لگا؟ تہذیبِ جدید کا یہ عظیم الشان مرکز اپنی گوناگوں رعنائیوں، دلچسپیوں اور مصروفیتوں کے باوجود میری توجہ کو جذب نہ کر سکا۔ چنانچہ چند ماہ نہایت بدمزگی کے ساتھ گزارے اور ہندوستان واپس آ گیا۔ میری زندگی کے اس افسوسناک واقعے سے تم کیا نتیجہ نکالو گے؟ یہی ناکہ پردیس میں جی کا لگنا، پردیس کی رنگینی یا بے رنگی پر منحصر نہیں۔ اگر آپ بھاٹو میں رہ کر وطن کے لئے بیقرار رہتے ہیں تو لندن میں بھی آپ کا یہی حال ہو سکتا ہے۔

بات یہ ہے بتن میاں! کہ انسان جب اپنے وطن اور اہلِ وطن سے جدا ہو کر کسی اجنبی ملک میں جاتا ہے تو اکثر و بیشتر "ہوم سِک" ہو جاتا ہے، ہوم سِک نس، ایک عام مرض ہے اور بہت سے غریب الوطن اس بیماری کا شکار ہوتے ہیں۔ اس میں بچوں، بوڑھوں، مردوں اور عورتوں کی تخصیص نہیں۔ بھاٹو اور لندن یا مسقط اور پیرس کی تخصیص سے کیا۔ ایک قصہ سنو!

میں جس زمانے میں لندن میں تھا اس زمانے میں وہاں ایک ہندوستانی ریستوراں "کوہِ نور ریستوراں" کے نام سے جاری تھا۔ یہ ٹیٹنہم کورٹ روڈ یعنی لندن کے عین مرکزی علاقے میں واقع تھا۔ دو بھائی جو ہماری اپنی دہلی کے ایک کائستھ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اس کو چلا رہے تھے۔ میں تو لندن پہنچ کر دہلی کے لذیذ اور چٹپٹے کھانوں کو ترس ہی گیا تھا۔ یہ حالت تھی کہ بریانی، شامی کباب، روغن جوش اور ٹیا محل کی نہاری کے مزے یاد آتے تو سچ مچ منہ میں پانی بھر آتا۔ چنانچہ "کوہِ نور" کا کھانا میرے لئے حقیقتاً نعمتِ غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں ہر دوسرے تیسرے دن کئی میل کا سفر کر کے وہاں پہنچتا اور اُن کا ڈھائی شلنگ کا ڈنر کھاتا۔ کسی اور دن جاؤں یا نہ جاؤں، اتوار کو ضرور جاتا تھا، کیونکہ اس دن جلیبیاں بھی ڈنر کا ایک جزو ہوتی تھیں۔ تو بتن میاں قصہ یہ ہے کہ ایک اتوار کی شام کو میں وہاں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ اس وقت میرے سوا وہاں کوئی اور نہ تھا۔ کیونکہ اصل میں ابھی ڈنر کا وقت نہیں ہوا تھا۔ اور میں جلیبیوں کے لالچ میں ذرا وقت سے پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ میں نہایت اطمینان کے ساتھ کھانا کھانے میں مشغول تھا کہ ایک صاحب تشریف لائے۔ میں نے ایک نظر میں صرف اتنا دیکھا کہ وہ ہندوستانی ہیں۔ اس سے زیادہ دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ مغرب کے بڑے بڑے شہروں میں لوگ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ دوسروں کو بے سبب گھورنا یا اُن کے کاموں میں دخل دینا وہاں بد تہذیبی خیال کی جاتی ہے۔ اور اصل یہ ہے کہ ان فضول باتوں کے لئے اُن کے پاس وقت بھی نہیں ہوتا۔ یہ صاحب آئے اور مجھ سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھ گئے۔ میں اپنے کھانے میں مشغول رہا اور ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ ایک آدھ اُچٹتی ہوئی نظر اُن کے چہرے پر پڑ گئی ہو تو اُس کی مجھے خبر نہیں۔ تھوڑی دیر میں ویٹر آیا اور یہ پوچھنے کے لئے کہ آپ کے واسطے کیا چیز حاضر کی جائے۔ اُن کے پاس گیا۔ جونہی اُن کے منہ سے پہلا لفظ نکلا میں چونک پڑا۔ میں اُن کی آواز پہچانتا تھا! آواز کو یاد رکھنے میں میرا حافظہ بہت اچھا کام کرتا ہے۔ لو، ایک قصہ سنو!

یہ کوئی بارہ سال پہلے کی بات ہے۔ میں دہلی سے بریلی بڑے ابا کے ہاں جا رہا تھا۔ علیگڑھ سے جو گاڑی ملی اُس میں بہت بھیڑ تھی۔ ناک تک کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے تھرڈ میں جگہ ملی۔ ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئے۔ اتنی بھی گنجائش نہ تھی کہ آزادی کے ساتھ اِدھر اُدھر مڑ کر دیکھ سکیں۔ بس جہاں بیٹھے ہو وہیں بُت بنے بے حس و حرکت بیٹھے رہو۔ خیر بیٹھ گئے اور گاڑی چل پڑی۔ علیگڑھ کے اسٹیشن سے نکلے ہی تھے کہ ڈبے میں ایک سحر آفریں نغمہ بلند ہوا۔ کیا خبر تھی کہ مسافروں کی اس بھیڑ میں ایک جادو نوا مغنی بھی ہے۔ یہ شخص مجھ سے بہت دور بیٹھا تھا، اور چونکہ میری پُشت اُس کی طرف تھی۔ میں اُس کو دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ دیکھنے کی میں نے کوشش بھی

نہیں کی۔ اُس کے گانے کو "سرودِ خانۂ ہمسایہ" سمجھ کر سننے لگا۔ کیا بتاؤں اُس کی بھاری آواز میں کتنا درد اور کتنی گھلاوٹ تھی۔ طبیعت پر نشہ سا چھا گیا۔ سفر کی ساری کلفت دور ہو گئی۔ علیگڑھ اور دہلی کے درمیان یہ شخص وقتاً فوقتاً گاتا رہا اور اُس کے گانے کی وجہ سے سفر خاصا دلچسپ رہا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اتنے لمبے سفر کے دوران میں، مَیں نے اُس کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی۔ بریلی پہنچنے کے تین چار دن بعد شام کے وقت ہم سب، کوئی سات آٹھ آدمی مکان کے سامنے چبوترے پر موڑھے اور کرسیاں ڈالے بیٹھا تھے۔ ایک صاحب جو اپنی وضع قطع سے ایک قلندرانہ شان کے بزرگ معلوم ہوتے تھے تشریف لائے۔ گٹھا ہوا جسم، گھنی داڑھی، آنکھوں میں سرمہ، کالا تہمد اور گہرے کتھئی رنگ کا گھٹنوں سے نیچا کرتا ——— وہ یقیناً کوئی صُوفی تھے۔ آتے ہی بڑے ابا سے بغل گیر ہوئے اور بلند آواز سے باتیں کرنے لگے۔ میں اُن کی آواز سُن کر اچھل پڑا۔ میں نے کہا، "حضرت! میرا خیال ہے آپ تین چار دن ہوئے دوپہر کی گاڑی سے بریلی تشریف لائے تھے۔" کہنے لگے "جی ہاں، آپ کو کیسے معلوم؟ آپ بھی شاید اُسی گاڑی سے آئے ہوں گے؟" میں نے کہا "آیا تو میں بھی اُسی گاڑی سے تھا۔ لیکن میں نے آپ کو دیکھا نہیں۔" "پھر آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں اُس گاڑی سے بریلی آیا؟" انہوں نے حیرت کے ساتھ سوال کیا۔ غرضیکہ اُن کے ساتھ بڑی دلچسپ گفتگو رہی، اور آخر میں جب مَیں نے اُنہیں بتایا کہ میں نے آپ کو آپ کی آواز سے پہچانا تو وہ بہت متحیر ہوئے۔ اُس کے بعد بڑی دیر تک ہم نے اُن کا گانا بھی سُنا۔

تو ننّھن میاں! بات یہ ہے کہ میں آدمی کو اُس کی آواز سے پہچان لیتا ہوں۔ "کوہِ نور" میں بھی یہی ہوا۔ جونہی وہ صاحب بولے میں اُن کو پہچان گیا۔ وہ ڈاکٹر نصیر تھے جو کئی سال دہلی کے سول ہسپتال میں ہاؤس سرجن رہ چکے تھے۔ اُنہوں نے مجھے اپنی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پایا تو وہ بھی مجھے پہچان گئے۔ فوراً بولے "آپ دہلی سے تشریف لائے ہیں؟" مَیں نے کہا "جی ہاں۔ معاف کیجئے گا ڈاکٹر صاحب! میں نے اب تک آپ کو پہچانا نہیں تھا۔" بولے، "ہاں میں بھی آپ کو نہیں پہچان سکا تھا۔" پھر مَیں نے کہا۔ بہت کافی تبدیلی ہو گئی آپ میں دو تین مہینے کے اندر۔ انہوں نے لندن پہنچ کر نہ صرف داڑھی منڈا دی تھی بلکہ مونچھیں بھی صاف کر دی تھیں، اور میرا اشارہ اسی تبدیلی کی طرف تھا۔ وہ ہنسنے لگے۔ "اور آپ پہلے کی نسبت کچھ دُبلے بھی معلوم ہوتے ہیں۔" میں نے اپنے تبصرے کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ کہنے لگے، "جی ہاں، میری صحت یہاں آکر کچھ اچھی نہیں رہی۔ شروع میں دو تین مہینے تو "ہوم سِک" رہا۔ اور اب اکثر قبض کی شکایت رہنے لگی . . . . . "ہوم سِک"! سُنتے ہو ننّھن میاں! ڈاکٹر نصیر لندن پہنچ کر "ہوم سِک" ہو گئے! اور دو تین مہینے تک "ہوم سِک" رہے، اس قدر "ہوم سِک" کہ اُن کی صحت پر بُرا اثر پڑا اور صورت پہچاننی مشکل ہو گئی!

مطلب یہ ہے کہ جب ایک شخص اپنے گھر سے دُور پردیس میں جا کر رہے گا تو وہ پردیس خواہ باغِ ارم ہو خواہ ویرانہ، اُس کا "ہوم سِک" ہو جانا تقریباً لازمی ہے۔ جو لوگ تعلیم کیلئے یا کسی اور غرض سے یورپ جاتے ہیں اُن میں سے اکثر و بیشتر اس دماغی بیماری میں کم از کم کچھ دنوں کے لئے ضرور مبتلا ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ یورپ کے وہ مقامات جہاں یہ لوگ جا کر ٹھیرتے ہیں، رونق، چہل پہل، اور گہما گہمی میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ بیماری عام طور پر دو ڈھائی مہینے رہتی ہے، اُس کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص جلد سے جلد اس کے اثر سے نجات پانا چاہے تو اُس کی یہی صورت ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی نہ کسی کام میں مصروف کرے اور کسی نہ کسی چیز میں دلچسپی لینا شروع کر دے۔ مصروفیت اور دلچسپی! مصروفیت اور دلچسپی! مصروفیت اور دلچسپی! یہی دو چیزیں ہیں جو تمہاری بے دلی کا علاج کر سکتی ہیں۔ اور تمہاری بدمزگی کو دور کر سکتی ہیں اور اسی بنا پر میں نے تمہیں لکھا تھا کہ تم اپنے آپ کو مطالعے میں مصروف کرو۔

یوں بھی مطالعہ ایک اچھی اور ضروری چیز ہے۔ اگر تم مطالعے کو اپنے مشاغل کا ایک اہم جزو نہ بناؤ گے تو کیا دیس اور کیا پردیس، ہر جگہ تمہاری زندگی اجیرن ہو سکتی ہے۔ یار دوستوں کے ساتھ ہوحق کرنے میں انسان ——— ایک معقول انسان! ——— اپنی ساری زندگی نہیں گزار سکتا۔ ایک وقت آتا ہے جب وہ اس روش سے اُکتا جاتا اور اُس کے فضول اور لغو ہونے کا قائل ہو جاتا ہے۔ لو، ایک قصّہ سُنو!

اصل میں یہ کوئی قصّہ نہیں ہے، بلکہ میں ایک مشہور مصنّف کا قول دہرانا چاہتا ہوں۔ سامرسٹ مام کا نام بھلا تم نے کاہے کو سُنا ہو گا وہ انگریزی زبان کا ایک بلند پایہ ڈرامہ نگار اور افسانہ نویس ہے۔ اُس نے

کسی جگہ لکھا ہے کہ صرف وہی لوگ بے دلی، افسردگی اور اکتاہٹ کا شکار ہوتے ہیں جو اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں اور صرف گاؤدی قسم کے لوگ ہی اپنا دل بہلانے کے لئے خارجی دنیا کے محتاج ہوتے ہیں حقیقت بھی یہی ہے۔ دنیا میں بکثرت لوگ ایسے ہیں جو تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے بھی علمی افلاس اور ذہنی بے مائگی میں مبتلا ہیں۔ وہ حصولِ مسرت کے ذرائع ہمیشہ خارجی دنیا میں تلاش کرتے ہیں، اور اسی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ ان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ ان کی زندگی کے دن، مہینے اور سال گزرتے چلے جاتے ہیں لیکن کبھی اس بات کی نوبت نہیں آتی کہ وہ اپنے دل کو ٹٹولیں، روح کی گہرائیوں کا جائزہ لیں اور اندرونی کیفیات کا تجزیہ کریں۔ میرے نزدیک ایسے لوگوں کی زندگی گدھوں کی زندگی سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتی۔

اس لئے میرا مشورہ ہے ننّن میاں! کہ تم اس بات کا بالکل خیال نہ کرو کہ جہاں ہو ایک ویران پسماندہ اور غیر مہذب مقام ہے۔ اپنے آپ کو مطالعے میں مصروف کرو، اور کتابوں میں دل لگاؤ۔ تمہارے خالی لمحات کو پُر کرنے کے لئے مطالعہ بہترین چیز ثابت ہوگا۔ اور ہاں، ایک بات اور ذہن میں آتی ہے کیا تم سمجھتے ہو کہ دنیا کے ویران، پسماندہ اور غیر مہذب مقامات اپنے اندر کوئی دلکشی نہیں رکھتے؟ کیا جہاں ہو وہاں انسانی زندگی اور انسانی معاشرت نہیں ہے جن کا مطالعہ کیا جاسکے؟ کیا وہاں صبح و شام کے مناظر، بہتے ہوئے دریا، کھلے ہوئے میدان اور گھنے جنگل نہیں ہیں جن میں قدرت کی جلوہ آرائیوں کا مشاہدہ کیا جاسکے؟ مجھے یقین ہے کہ وہاں یہ سب کچھ ہے اور کسی ذی ہوش انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہاں رہ کر ان چیزوں کی طرف سے آنکھیں بند کرلے اور ایک تنگ و تاریک کمرے میں بیٹھ کر دہلی، لکھنؤ اور لاہور کی ہنگامہ پرور صحبتوں کی یاد میں ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرے اور اپنی محرومی پر آنسو بہائے میں اس عقیدے کا انسان ہوں ننّن میاں! کہ آدمی اگر قطب شمالی پر بھی جاکر رہے تو اس کے پاس بیکار اور نکما رہنے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔ وہ وہاں بھی اپنا وقت مفید مشاغل میں گزار سکتا ہے۔ یاد رکھو دنیا میں بہت کم لوگ اتنے خوش قسمت ہوتے ہیں کہ ان کو گھر سے باہر نکلنے اور دنیا دیکھنے کا موقع ملے۔ پھر لائقِ افسوس ہیں وہ لوگ جن کو ایسا موقع ملتا ہے اور وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ مجھے بھی قدرت نے ایک مرتبہ ایسا ہی بیش بہا موقع عطا کیا تھا۔ لیکن میں اس سے مستفید نہیں ہوا، کیونکہ میں اس وقت اتنا ہی نادان تھا جتنے کہ آج تم ہو۔ زندگی کو دیکھنے سمجھنے اور محسوس کرنے کی جو تڑپ آج میرے اندر ہے وہ اس وقت نہ تھی۔ حیاتِ انسانی کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر میرے چاروں طرف پھیلا پڑا رہا۔ لیکن میں نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ اور آج یہ حالت ہے کہ گویا زندگی کے خشک ریتیلے ساحل پر ماہیِ بے آب کی طرح پڑا تڑپتا ہوں۔ افسوس! افسوس! افسوس! مگر اب افسوس کرنے سے بھی کیا حاصل؟ خدا سے دعا ہے ننّن میاں! کہ تمہیں اس طرح کبھی نہ پچھتانا پڑے:

بات میں سے بات نکلتی ہے۔ سیاحت و سفر کا ایک بہت پرانا مزہ یاد آیا۔ جن لوگوں کو اس بات کا موقع ملتا ہے کہ وہ گھر سے باہر نکل کر پردیس میں رہیں اور مختلف مقامات دیکھیں ان میں ایک خود اعتمادی اور ذہن و کردار کی ایک پختگی پیدا ہوجاتی ہے۔ اور یہ خوبیاں ان لوگوں میں بہت کم پائی جاتی ہیں جن کو سیر و سیاحت کے مواقع میسر نہیں آتے۔ وہ ایک قصہ سنو!

ابھی پچھلے دنوں ناصر بھائی نے اپنے ایک عزیز دوست سلمانی صاحب سے میری ملاقات کرائی۔ وہ دریا گنج میں رہتے ہیں۔ ایک دن انہوں نے مجھے اور ناصر بھائی کو مع ہمارے چند دوسرے احباب کے ڈنر پر مدعو کیا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ کوٹ اور شیروانیاں اتار کر بہت دیر تک ان کے خانہ باغ میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ باتیں کرتے کرتے ناصر بھائی نے کہا۔ "کیوں نہ ہم لوگ ذرا ٹہلتے ہوئے فیروز شاہ کے کوٹلے تک ہو آئیں؟" سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور مسٹر سلمانی نے بھی اجازت دیدی۔ رات کے نو بج چکے تھے اور یوں بھی دریا گنج سے فیروز شاہ کا کوٹلہ دور کتنا ہے؟ چنانچہ ہم سب جس طرح بیٹھے تھے اسی طرح چلنے کے لئے کھڑے ہوگئے۔ لیکن سلمانی صاحب نے کہا، "ذرا ٹھہریئے، میں ابھی آتا ہوں" اور کوٹھی کے اندر چلے گئے۔ میں سمجھا کپڑے پہننے گئے ہیں لیکن ناصر بھائی اور مسٹر سلمانی نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور دونوں ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔ ناصر بھائی مجھ سے بولے "جانتے ہو یہ کہاں گئے ہیں؟" میں نے کہا "میں تو نہیں جانتا۔" "اپنی والدہ سے اجازت لینے گئے ہیں"، ناصر بھائی نے کہا۔ "اجازت! کس بات کی اجازت؟" میں نے پوچھا۔ "اجازت اس بات کی

کہ فیروز شاہ کے کوٹلے تک ٹہل آئیں: ناصر بھائی نے ہنستے ہوئے کہا۔ مسز سلمانی بھی ہنسنے لگیں۔ میں اِس مذاق کو خاک نہیں سمجھا۔ بیوقوفوں کی طرح اُن دونوں کا منہ تکنے لگا۔ بالآخر ناصر بھائی نے مجھے بتایا کہ سلمانی صاحب آج تک اپنی والدہ کی اجازت کے بغیر کبھی گھر سے باہر نہیں نکلے۔ وہ کہیں جانے سے پہلے والدہ سے اجازت لینا ہمیشہ اپنا فرض خیال کرتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بچپن سے لیکر اس وقت تک کہ اُن کی عمر چالیس سے متجاوز ہو چکی ہے۔ کبھی دو چار دفعہ سے زیادہ دہلی سے باہر نہیں گئے اور ہمیشہ گھر پر اپنی والدہ کے سایۂ عاطفت میں زندگی بسر کرتے رہے ہیں

کچھ سمجھے ننّن میاں۔ ہر چند کہ سلمانی صاحب کی یہ عادت کہ وہ گھر سے باہر جاتے وقت اپنی والدہ کی اجازت ضرور حاصل کر لیتے ہیں کوئی بُری عادت نہیں ہے۔ مگر پھر بھی میں اس کو اُن کے کردار کی بہت بڑی کمزوری خیال کرتا ہوں میں ابھی اُن سے صرف دو چار ملاقاتیں کر سکا ہوں اگر ان ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا تو میں یقیناً اُنکی اس کمزوری کا اُن کی زندگی پر اس کمزوری کے اثرات کا اچھی طرح مطالعہ کر سکوں گا۔ مگر اس وقت بھی یعنی تفصیلی مطالعے کے بغیر اتنی بات وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سلمانی صاحب خود اعتمادی سے بالکل محروم ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ صرف گھر سے باہر جانے کے لئے نہیں بلکہ زندگی کے ہر اہم اور غیر اہم اقدام کے لئے اپنی والدہ کی اجازت حاصل کرتے ہوں گے اور والدہ کی اجازت کے علاوہ بیوی سے بھی مشورہ کر لیتے ہوں گے۔ ممکن ہے بچوں کی رائے بھی لے لیتے ہوں اور کچھ عجب نہیں جو نوکروں سے بھی صلاح کر لیتے ہوں۔ وہ تنہا اپنی ذمہ داری پر دنیا کا کوئی کام نہیں کر سکتے!

اور اُن کی اِس خوفناک کمزوری کا سبب؟ یہی کہ وہ کبھی کسی قابلِ ذکر مدت کے لئے گھر سے باہر نہیں رہے، اُنہوں نے کبھی کوئی لمبا، دور دراز کا سفر نہیں کیا، اور اُن کو کسی ایک دن بھی یہ محسوس کرنے کا موقع نہیں ملا کہ آج میں اپنے عزیزوں، دوستوں اور غم خواروں سے دُور ہوں اور جو کچھ کر رہا ہوں اُس کا نتیجہ، بُرا یا بھلا مجھی کو بھگتنا پڑے گا۔

اب تم خود سوچ لو ننّن میاں! کہ قدرت نے تمہیں برما کے سفر پر مجبور کر کے تمہارے ساتھ اچھا سلوک کیا یا بُرا۔ اور یہ کہ بھامو میں تمہارا قیام ضروری ہے یا نہیں۔

تم ہندوستان واپس آنے کے لئے بیقرار ہو۔ پوچھئے کیوں تو جواب ملتا ہے کہ بھامو میں نوکری ملنے کی کوئی امید نہیں، اور اگر مل بھی سکتی ہے تو برسوں کے انتظار اور مدتوں کی اُمیدواری کے بعد! ماموں جان کے خطوط سے تمہارے ان خیالات کی تصدیق نہیں ہوتی۔ وہ برابر یہی لکھ رہے ہیں کہ ننّن میاں کیلئے کوشش ہو رہی ہے اور خدا نے چاہا تو جلد کامیابی ہو گی۔ ماموں جان کا خدا بھی وہ خدا نہیں ہے جس کو تم سرمایہ داروں کے دماغ کی پیداوار سمجھتے ہو اس لئے میں بھی اُن کے ساتھ اس امید میں شریک ہوں کہ جلد تمہیں کوئی اچھی ملازمت مل جائے گی۔ لیکن تھوڑی دیر کے لئے میں تمہاری بات مانے لیتا ہوں اور یہ فرض کئے لیتا ہوں کہ جیسا تم کہتے ہو ویسا ہی ہے یعنی یہ کہ بھامو میں نوکری ملنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ تو اب اس کے بعد بھی میرا خیال یہی ہے کہ تمہیں بھامو میں رہنا چاہیئے کیونکہ ہندوستان میں نوکری ملنے کی امید اور بھی کم ہے۔

بات یہ ہے کہ تم ابھی تلاشِ معاش کے مصائب سے صحیح معنوں میں واقف نہیں ہو۔ دنیا میں لاتعداد نوجوان ایسے ہیں جو روزگار کی جستجو میں اِدھر سے اُدھر پھر رہے ہیں اور جانتے ہیں کہ اگر جلد سے جلد بلکہ فوراً کوئی ملازمت نہ ملی تو بھوک اور فاقے سے مفر نہ ہو گا۔ جستجو اور تلاش تو اُس کی ہے جو اس ہولناک احساس کے ساتھ اور اس بھیانک خوف کو دل میں لیکر نوکری ڈھونڈے کہ اگر کل تک مجھے نوکری نہ ملی تو بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ لو، ایک قصہ سنو!

معین الدین میرا ایک بہت پرانا دوست ہے۔ جس زمانے میں ہم پنڈت کے کوچے میں رہتے تھے وہ بھی وہیں رہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ بھی عربک اسکول میں پڑھتا تھا اور میں بھی۔ چنانچہ وہ اکثر ابّا جان مرحوم سے انگریزی پڑھنے ہمارے گھر آیا کرتا تھا۔ تم اُس کو نہیں جانتے کیونکہ تمہارے ہوش سنبھالنے سے پہلے وہ انٹرنس کا امتحان پاس کر کے علیگڑھ جا چکا تھا۔ اُس نے پانچ چھ برس میں علیگڑھ سے بی اے کیا۔ اُس کے بعد ڈپٹی کلکٹری کے لئے مقابلے کے امتحان میں بیٹھا۔ جب نتیجہ شائع ہوا تو اُس کا نام چوتھے نمبر پر تھا۔ اُس سال چار آدمی لئے جانے والے تھے۔ بس پھر کیا تھا۔ معین صاحب کے ٹھاٹھ ہو گئے۔ فیسیں معاف کرا کرا کے تعلیم حاصل کی تھی، لیکن بی اے کرتے ہی ڈپٹی کلکٹری ملی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں انگلستان سے واپس آ چکا تھا اور

گھر بیٹھے پڑے پڑے "بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے" گایا کرتا تھا۔ یہ گویا نشے کے اُتار کی حالت تھی، اور طبیعت کی بے کیفی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ معین کی کامیابی کی خبر سُنی تو اپنی ناکامی کو دیکھتے ہوئے دل کچھ زیادہ خوش نہ ہوا۔ مجھے چاہیئے تھا کہ کم از کم ایک دفعہ جا کر اُس کو مبارکباد تو دے آتا۔ لیکن جی نہ چاہا۔ معلوم نہیں یہ رشک و حسد کا نتیجہ تھا یا یہ کہ مجھے ایک ایسے شخص سے ملتے ہوئے شرم آتی تھی جو زندگی کی دوڑ میں مجھ سے بہت آگے نکل گیا تھا۔ کچھ بھی ہو، میں اُس سے ملنے نہیں گیا۔ اور میاں! ابھی یہ خبر تازہ ہی تھی کہ یکایک دوسری خبر ملی۔ وہ یہ کہ معین صاحب ڈپٹی کلکٹری میں نہیں لئے گئے۔ ارے بھئی کیوں؟ یہ کیسے ہوا؟ پتہ لگا کہ فرقہ وارانہ تناسب کو قائم رکھنے کے لئے ایک عیسائی امیدوار کو لے لیا گیا جو بیسویں نمبر پر تھا، اور معین صاحب کو رد کر دیا گیا۔ یہ لیجئے، بنا بنایا محل گر پڑا۔ وہ پہلی خبر سُن کر مجھے خوشی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، لیکن یہ دوسری خبر سُن کر یقیناً رنج ہوا۔ خیر اُس کے بعد بہت دنوں تک میں معین کے حالات سے بے خبر رہا۔ بس اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ نائب تحصیلداری، ایکسائز انسپکٹری، اور اس قسم کی دوسری چیزوں کے لئے مقابلے کے امتحانات میں شریک ہوا، مگر کسی میں کامیابی نہ ہوئی۔ جب میں تین سال کانپور میں رہ کر دہلی واپس آیا تو ایک دن سرِ راہ اُس سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اُن دنوں ڈی۔ اے۔ جی۔ پی۔ ٹی کے دفتر میں چالیس روپے پر کام کر رہا تھا۔ مجھے یہ سُن کر بہت افسوس ہوا۔ کہاں ڈپٹی کلکٹری اور کہاں چالیس روپے کی کلرکی، اور وہ بھی عارضی! خیر۔ اب پچھلے ہفتے ایک مدت کے بعد اُس سے پھر ملاقات ہوئی۔ آج کل اجمیری دروازے سے باہر ایک عظیم الشان نمائش ہو رہی ہے اور وہاں بڑی رونق اور چہل پہل رہتی ہے۔ میں کسی شام ٹہلنے نکلتا ہوں تو اکثر و بیشتر قدم خود بخود اُسی طرف کو اُٹھ جاتے ہیں۔ ایک دن رات کے آٹھ ساڑھے آٹھ بجے میں ایک ریستوران میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ یکایک میری نظر معین پر پڑی جو ریستوران کے دفتر میں ایک کرسی پر مالکانہ اقتدار کے ساتھ بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ "کمال کرتا ہے یہ شخص بھی!" میں نے اپنے دل میں کہا۔ "اب کلرکی کرتے کرتے ریستوران کھول بیٹھا۔" چائے ختم کر کے میں سیدھا اُس کے پاس گیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اُچھل پڑا اور بوکھلا سا گیا۔ "کہو بھئی معین!" میں نے کہا۔ "کیا حال چال ہیں؟ یہ ریستوران کب کھولا؟" میرا سوال یکسر مہمل تھا کیونکہ میں نے اُس کو وہاں بیٹھا دیکھ کر جو نتیجہ نکالا تھا وہ صحیح نہیں تھا۔ وہ ریستوران کا مالک نہیں بلکہ ایک ادنیٰ ملازم تھا، اور صبح سے شام تک وہاں بیٹھ کر بل بنانے کی خدمت اُس کے سپرد تھی۔ یہ معلوم کر کے میرے دل کو ایک دھکا سا لگا اور مجھے اُس کی حالت پر بہت زیادہ رحم آیا۔ لیکن میں نے کوشش کر کے اپنے جذبات کو ظاہر نہیں ہونے دیا اور اپنے قدرتی انداز میں اطمینان کے ساتھ باتیں کرتا رہا، تاکہ وہ یہ سمجھے کہ میرے نزدیک اُس کا ریستوران میں ملازم ہونا کوئی افسوس ناک اور رحم انگیز بات نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جو خفت اِس اچانک ملاقات سے اُس کو ہوئی ہے اُس میں مزید اضافہ کر دوں۔ مگر اُس نے خود ہی اپنے روزگار کے متعلق گفتگو شروع کر دی۔ اُس کی ناکامیوں اور مصیبتوں کی داستان سُن کر میرا تو دل ہل گیا۔ تقدیر کا کھیل دیکھئے کہ وہ شخص جو شاید ایک اعلیٰ سرکاری عہدے دار ہوتا برسوں سے اس کوشش میں ہے کہ دو وقت کی روٹی کا اطمینان ہو جائے مگر کامیابی نہیں ہوتی۔ اُس کو اپنا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ آج اُسے اس بات کا بالکل غم نہیں ہے کہ وہ ڈپٹی کلکٹر ہونے کی بجائے ایک عارضی ریستوران میں دو وقت کے کھانے پر ملازم ہے۔ غم ہے تو یہ کہ پندرہ بیس دن بعد جب نمائش ختم ہو جائے گی اور ریستوران نہ رہے گا تو یہ دو وقت کا کھانا کہاں سے آئے گا! عبرت! عبرت! عبرت!

ننّن میاں! سچ پوچھو تو تم ابھی تلاشِ معاش کی تلخی سے دوچار ہی نہیں ہوئے اور خدا نہ کرے کہ کبھی ایسا وقت آئے! تمہارے روزگار کا مسئلہ کوئی بہت نازک اور پریشان کن مسئلہ نہیں ہے۔ زندگی کی ابتدائی ضروریات یعنی کھانا کپڑا وغیرہ حسبِ دلخواہ پوری ہوتی رہتی ہیں، اور آئندہ بھی اُن کے پورا ہوتے رہنے کا امکان ہے۔ چنانچہ تم نہایت اطمینان اور سکونِ قلب کے ساتھ روزگار کی تلاش اور مستقبل کی فکر کر سکتے ہو۔ میرا مطلب ہے کہ تمہیں اس آرام اور عافیت کی قدر کرنی چاہیئے۔ بر آ گئے ہو تو اب یہاں رہ کر کچھ کام بھی کرو۔ اگر اس وقت اپرنٹس ہو سکتے ہو تو ضرور ہو جاؤ، چاہے آئندہ مستقل ملازمت ملنے کی امید بالکل نہ ہو، معاوضہ نہ ملے تو اس کا بھی غم نہ کرو۔ کچھ نہیں تو تجربہ ہی حاصل ہوگا۔ دفتری کاموں کی نوعیت سے واقفیت پیدا ہوگی، معلومات میں اضافہ ہوگا، قابلیت بڑھے گی۔ اور کچھ نہیں تو رخصت ہوتے وقت ایک آدھ سرٹیفکیٹ ہی لے لوگے۔ غرض یہ کہ اگر بلا معاوضہ نوکری بھی ملتی ہے تو تمہیں اس کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے

اور جناب نے یہ کیا فرمایا کہ ہندوستان کو جنگِ آزادی کے لئے سپاہیوں کی ضرورت ہے اور میں یہاں بیکار پڑا سڑ رہا ہوں؟ واہ واہ وا! کیا کہنے ہیں ننّن میاں تمہارے! قربان جائیے اس بلند خیالی کے! مگر اتنی بڑی بات کہنے سے پہلے ذرا اپنے حالات پر تو نظر ڈال لی ہوتی۔ باوا مر چکے، گھر میں جو تھوڑی بہت پونجی تھی وہ ختم ہو چکی، بیوہ ماں اس انتظار میں جی رہی ہے کہ دیکھئے وہ دن کب آتا ہے جب صاحبزادے اپنے پیروں پر کھڑے ہوں اور دو وقت کی روٹی کمانے کے قابل بنیں۔ یہ تو جناب کے حالات ہیں اور بات وہ کہی ہے جو صرف گاندھی اور جواہر لال ہی کے منہ سے نکلتی ہوئی اچھی معلوم ہو سکتی ہے۔ جنگِ آزادی کا سپاہی بننا آسان کام نہیں ہے ننّن میاں! اس کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اُن میں دولت سب سے اہم ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس سے تم یکسر محروم ہو۔ ایک مفلس اور قلاش نوجوان کو تو ادھر کا رُخ بھی نہیں کرنا چاہئیے۔ لو، ایک قصہ سنو!

ہندو کالج میں میرے ساتھ ایک لڑکا بھگوان داس پڑھتا تھا۔ اس کے سیاسی خیالات کچھ تمہارے ہی جیسے تھے۔ لیکن تم نے تو (معاف کرنا ننّن میاں!) دو چار باتیں ادھر اُدھر سے سُن لی ہیں جن کو تم وقتاً فوقتاً دہراتے رہتے ہو۔ اس کے برعکس بھگوان داس نے سیاسی لٹریچر کثرت کے ساتھ اور محنت کے ساتھ پڑھا تھا۔ اس کی زبان سے جو نکلتی تھی وہ ایک وسیع مطالعے اور عمیق فکر کا نتیجہ ہوتی تھی۔ ابتدا میں اُس کو فارسی سے بڑی دلچسپی تھی اور سعدی و حافظ کے سینکڑوں اشعار یاد تھے۔ اُردو سے بھی بہت شغف رکھتا تھا اور یہی وہ چیز تھی جس نے مجھ کو اُس سے قریب تر کر دیا تھا۔ لیکن اُس کا یہ شوق جلد ہی ختم ہو گیا، کیونکہ سیاسیات سے اُس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد بی۔ اے میں اُس نے فارسی نہیں لی، بلکہ انگریزی کے علاوہ تاریخ اور اقتصادیات لیکر مضامین کی مثلث کو پورا کیا۔ اب اس کے خیالات میں ایک حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہونی شروع ہوئی۔ اُردو فارسی ادب سے وہ بیزار ہو گیا ——— جس ادب کا کبھی دیوانہ وار عاشق تھا اب اس کو حقارت کے ساتھ "مڈل کلاس لٹریچر" کہنے لگا۔ یہی نہیں، اور بھی بہت سی چیزیں اب اُس کے نزدیک سرمایہ داروں اور دوسرے خوش حال طبقوں کی پیدا کی ہوئی اور بنائی ہوئی تھیں، مثلاً مذہب، مروجہ اخلاق، معاشری رسوم، مختلف سیاسی ادارے، فنونِ لطیفہ کے شاہکار، اور ان سب کو وہ قابلِ نفرت خیال کرتا۔ "پرائیویٹ پراپرٹی" (ذاتی ملکیت) کو وہ دنیا کی سب سے بڑی لعنت اور زندگی اور سماج کی ساری برائیوں کا سرچشمہ تصور کرتا۔ جنگ، غلامی، غریبی، جہالت، ہر چیز اُس کے نزدیک "پرائیویٹ پراپرٹی" کی پیداوار تھی۔ فرانسیسی مفکر و مدبّر پرودھن کا مشہور جملہ "پراپرٹی از تھیفٹ" (ملکیت سرقہ ہے) ہر وقت اُس کی زبان پر رہتا۔ مجھ سے ملنے آتا تو دیوار پر کہیں نہ کہیں یہ جملہ ضرور لکھ دیتا۔ ایک دن مجھ سے بولا "تم تاج محل کو کیا سمجھتے ہو؟" میں نے کہا، "میں تاج محل کو ایک ایسی عمارت سمجھتا ہوں جو سنگِ مرمر سے بنائی گئی ہے۔" کہنے لگا، "میرا یہ مطلب نہیں۔ میں یہ پوچھتا ہوں کہ تاج محل کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔" میں نے کہا، "تاج محل کے متعلق میرا یہ خیال ہے کہ وہ دنیا کی سب سے خوبصورت عمارت ہے۔" "تو گویا وہ تمہارے نزدیک ایک لائقِ صد تحسین چیز ہے؟" اُس نے سوال کیا۔ میں نے کہا "بیشک فنِ تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے اور لائقِ صد تحسین ہے۔" "مگر میں اس کو قابلِ نفرت سمجھتا ہوں۔" اُس نے کہا۔ "ضرور سمجھو" میں نے جواب دیا۔ "آجکل اچھی چیزوں کو بُرا کہنا بھی فیشن میں داخل ہے۔ ایک صاحب نے نگار میں ایک مضمون لکھا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غالب جسکو اُردو کا سب سے بڑا شاعر خیال کیا جاتا ہے دوسروں کے خیالات چرایا کرتا تھا اور اس لحاظ سے ایک نہایت معمولی درجے کا شاعر تھا۔" اُس نے میری بات کو غور سے نہیں سُنا اور اپنی کہے گیا: "میں تاج محل کو قابلِ نفرت سمجھتا ہوں۔ وہ اُس زمانے کی یادگار ہے جب بڑے بڑے جاگیردار، راجہ اور مہاراجہ کسانوں کو بے دردی کے ساتھ لوٹتے تھے اور اُن کے خون سے اپنی محلوں کو رنگین بناتے تھے ———" "تمہارا خیال صحیح ہے،" میں بیچ میں بول اُٹھا، "لیکن ایک بات بھول رہے ہو بھگوان داس! تم اس وقت اسٹیج پر نہیں ہو بلکہ اپنے ایک دوست کے کمرے میں بیٹھے ہو۔ تم اپنے ماحول سے بڑی جلدی بے خبر ہو جاتے ہو۔ یہ تمہارے اندر بڑا عیب ہے۔" اس نے جواب دیا، "تاج محل ایک ایسے سیاسی و معاشی نظام کی پیداوار ہے جو "امورل" تھا ——— بنیادوں سے لیکر چوٹی تک "امورل"! اس لئے تاج محل بھی ایک "امورل" چیز ہے۔" میں نے کہا، "اگر "امورل" ہے تو ہوا کرے۔ خوبصورت تو ہے۔ اور یہی اصلی چیز ہے۔ ایک طوائف بھی "امورل" ہوتی ہے لیکن بعض اوقات وہ حسین بھی ہوتی ہے، اور اُس کا "امورل" ہونا اُس کے حسین ہونے میں حارج نہیں ہوتا۔" اس پر وہ طوائف کا مسئلہ

لے بیٹھ۔ کہنے لگا "طوائف اہم مسئلہ نہیں ہوتی۔ طوائف کو اہم مسئلہ کہنا قطعی جہالت ہے۔ طوائف "پرائیویٹ پراپرٹی" کی پیداوار ہے.... "

میرے نزدیک اُس کی گفتگو ہمیشہ ایک ہزلیہ نظم ہوتی تھی اور "پرائیویٹ پراپرٹی" ٹیپ کا بند۔ جب وہ اس ٹیپ کے بند پر پہنچا تو میں اپنی ہنسی کو ضبط نہ کر سکا اور ایک زور کا قہقہہ لگایا۔ لیکن اُس نے اپنے کلام کا سلسلہ جاری رکھا "طوائف "پرائیویٹ پراپرٹی" کی پیداوار ہے ......" میں نے کہا، "بھگوان داس! آج تمہارا بخار بہت تیز ہے۔ تھوڑی دیر خاموش لیٹ کر آرام کرو۔" وہ اُٹھا اور مجھے جاہل، کوڑھ مغز اور نہ جانے کیا کیا کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ جلدی میں وہ پنسل بھی چھوڑ گیا جس سے اُس نے میز پر پڑے ہوئے تقریباً تمام کاغذات پر "پراپرٹی" اور "گورنمنٹ" کی مہر ثبت کر دی تھی۔

یہ تھا میرا دوست بھگوان داس اور یہ تھے وہ خیالات جو بھوت بن کر یکایک اُس کے سر پر سوار ہو گئے تھے۔ بہت جلد بھگوان داس جی اپنے مرکزِ ثقل سے اس حد تک ہٹے کہ اُنہوں نے اپنی تعلیم کو خیرباد کہہ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے کہا، "دیکھو بھگوان داس! اب تک جو بکواس تم وقتاً فوقتاً کرتے رہے ہو اُس کو میں نے کبھی قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ لیکن یہ حرکت جو تم اب کرنے والے ہو ایسی نہیں ہے کہ میں خاموش رہوں۔ اگر تم نے اس وقت اپنی تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا تو یاد رکھو زندگی بھر پچھتاؤ گے۔ یہ عمر پھر لوٹ کر نہیں آنے کی۔ نہ یہ مواقع جو آج تمہیں حاصل ہیں پھر میسر آئیں گے۔" اس پر وہ بولا۔ "مجھے بی۔ اے یا ایم۔ اے کر کے کیا لینا ہے؟ حکومت کی نوکری تو کرنی نہیں ہے جو اپنی عمر اس طرح ضائع کروں۔" میں نے کہا، "چلو یونہی سہی تمہیں حکومت کی نوکری نہیں کرنی ہے۔ مگر تحصیلِ علم بذاتِ خود بھی تو کوئی چیز ہے۔ علم کی اہمیت اور ضرورت سے تو تم انکار نہیں کر سکتے۔" "علم کی اہمیت موجودہ حالات میں کچھ بھی نہیں ہے۔" اُس نے کہا۔ "بس اتنا ہی بہت کافی ہے کہ ہم اُردو اور انگریزی لکھ پڑھ لیتے ہیں۔ اس سے زیادہ محض عیاشی ہے۔" "سبحان اللہ! کیا زریں خیالات ہیں!" میں نے کہا۔ "تمہارے دماغ میں خناس سما گیا ہے بھگوان داس اور کوئی بات نہیں ہے۔" لیکن اُس نے نہ کبھی میرے غصے کی پروا کی تھی۔ نہ طنز و ملامت کی چنانچہ حسبِ معمول اپنی کہے گیا: "کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھنا ایک عیاشی ہے جو سرمایہ داروں کیلئے ہے۔ نہ کہ اُن لوگوں کے لئے جو دنیا میں آزادی اور انصاف کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔" میں نے سمجھ لیا کہ اِس کا مرض حد سے گزر چکا ہے، اور اس کو کوئی سنجیدہ مشورہ دینا بالکل فضول ہے۔

اس نے کالج سے نام کٹا لیا اور بمبئی جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ اپنی اُردو اور فارسی کی کل کتابیں مجھے بخش دیں۔ ماں کو لکھا کہ میں مزید تعلیم حاصل کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں اور بمبئی جا رہا ہوں تاکہ مزدوروں میں رہ کر کوئی مفید کام کر سکوں۔ ماں بے چاری بے پڑھی لکھی دیہاتی عورت۔ وہ بیٹے کی اس عظیم الشان سیاسی بیداری کو کیا خاک سمجھتی اور کیا خاک اُس کی قدر کرتی۔ اُسے تو اپنی زندگی بھر کی آرزوئیں ہی پامال ہوتی ہوئی نظر آئیں۔ وہ ضلع رہتک کے کسی گاؤں میں ایک چھوٹی سی زمینداری سنبھالے بیٹھی تھی۔ مرحوم شوہر کی یاد اور اکلوتے بیٹے کے مستقبل کا تصور یہی دو چیزیں اُس کی زندگی کا سہارا تھیں۔ اب جو بیٹے کے خوفناک ارادے کی خبر پائی تو بلبلا اُٹھی۔ خط پر خط لکھنے شروع کئے بھگوان داس کو سمجھایا بھی اور دھمکیاں بھی دیں، اپنے غصے کے نتائج سے بھی آگاہ کیا اور اپنی محبت کا واسطہ بھی دلایا۔ مگر اُس اللہ کے بندے پر کسی بات کا اثر نہ ہوا۔ اُس نے ہر خط کے جواب میں یہی لکھا: "والدین اور اولاد کی محبت سرمایہ دارانہ زندگی کا ایک عیاشانہ پہلو ہے۔ میرے دل میں دنیا کے عوام کی محبت ہے اور میں اس محبت کے مقابلے میں ماں کی محبت کو ایک قطعی غیر اہم چیز سمجھتا ہوں۔" آخر میں تنگ آ کر ماں نے لکھ بھیجا: "اگر تم تعلیم ترک کر کے بمبئی گئے تو میں بھی اپنے دل پر پتھر رکھ لوں گی اور خرچ بھیجنا بند کر دوں گی۔" مگر یہ حضرت اپنے نئے خیالات کی ترنگ میں تھے۔ اُن پر مجاہدانہ سرفروشی کا جذبہ طاری تھا۔ انہوں نے ماں کی اس دھمکی کی ذرا بھی پروا نہ کی اور بمبئی روانہ ہو گئے۔

اس بات کو مشکل سے چار مہینے گزرے ہوں گے کہ ایک دن صبح ہی صبح کیا دیکھتا ہوں کہ بھگوان داس جی تشریف لئے چلے آ رہے ہیں۔ قریب آئے تو دیکھا کہ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں، آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے ہیں، جسم پر ایک پھٹی ہوئی قمیص ہے اور ایک میلا کچیلا نکر۔ آئیے تشریف! میں نے کہا۔ "آپ کا نام بھگوان داس ہے نا؟" مگر وہ کسی چہل کے لئے تیار نہ تھا۔ بے جان ہو کر کرسی پر گر پڑا اور بولا: "میں بیمار ہوں اور بہت بھوکا ہوں۔ جلدی سے گرم دودھ منگواؤ۔"

ناشتے کے بعد جب میں اُس کی داستان سُننے میں مصروف تھا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ اکیلا ہی نہیں آیا ہے بلکہ اپنے ساتھ کچھ خفیہ پولیس

کے آدمی بھی لایا ہے۔ میں نے دل میں کہا "یہ کم بخت کہیں میرے سر کوئی آفت نہ لائے۔ ایسے خطرناک آدمی سے دور رہنا بہتر ہے۔ دوستی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم بیٹھے بٹھائے اپنے آپ کو مصیبت میں پھنسائیں اور بیگناہ مارے جائیں" میں نے جلد سے جلد اس سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی۔ اور تیسرے دن ٹکٹ دلوا کر بمبئی روانہ کر دیا۔

اب قدرتی طور پر تم یہ جاننا چاہو گے کہ بھگوان داس پر بمبئی میں کیا بیتی اور وہ کیوں وہاں سے اس قدر جلد واپس آ گیا۔ لیکن یہ ایک طویل داستان ہے جس کو اگر میں بیان کرنے بیٹھوں تو تبن میاں! میرا یہ خط خط نہ رہے گا بلکہ ایک اچھا خاصہ ناول بن جائے گا۔ نہایت مختصر طور پر صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ بمبئی پہنچ کر بھگوان داس کو ایسی ذہنی و جسمانی تکالیف کا مقابلہ کرنا پڑا۔ جو اس کے لئے بالکل نئی تھیں۔ بھلا کہاں ایک نازوں کا پالا نوجوان اور کہاں سیاسی زندگی کے مصائب! ماں نے انتہائی خوشامد کے باوجود روپیہ نہ بھیجا۔ اور اس سے اُن مصائب میں چند در چند اضافہ ہو گیا۔ غرضیکہ "دنیا کے عوام کی محبت" نے اچھی طرح اپنا اثر دکھایا اور بھگوان داس جی کو ایسے ایسے سخت جھٹکے دئے کہ دن میں تارے نظر آنے لگے۔ "آزادی اور انصاف کی حکومت" قائم کرنے کا خیال ترک کر دیا۔ ماں کو لکھا، "روپیہ بھیجو، ہم دہلی واپس جا کر دوبارہ کالج میں داخل ہو جائیں گے"۔

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

یہ نہ سمجھنا تبن میاں! کہ بھگوان داس کی مصیبتیں یہاں ختم ہو گئیں یہ تو اُس کی بربادی کی محض ابتدا تھی تعلیمی زندگی کا ایک سال ضائع کرنے کے بعد جب دوبارہ کالج میں داخل ہونے کے لئے آیا تو پرنسپل نے لینے سے صاف انکار کر دیا۔ غریب نے بہتیرا سر ٹپکا مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوا۔ مجبوراً لاہور پہنچا۔ وہاں جس کالج میں بھی گیا یہی جواب ملا کہ تھرڈ ایر میں داخل کریں گے۔ اس نے فورتھ ایر سے پڑھنا چھوڑا تھا۔ اس لئے خیال تھا کہ فورتھ ایر ہی میں داخلہ مل جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ایک سال کی بجائے دو سال ضائع ہوتے ہوئے نظر آئے طبیعت تعلیم سے پہلے ہی بیزار ہو چکی تھی، ان نامساعد حالات سے دل اور بھی کھٹا ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مزید تعلیم کا خیال ہی چھوڑ دیا اور ملازمت کرنے کی جی میں ٹھانی۔ مگر ایسے شخص کے لئے ملازمت کہاں! خفیہ پولیس نے اب تک پیچھا نہیں چھوڑا تھا، ملازمت بھلا کون دیتا! دو تین سال کی دوڑ دھوپ کے بعد مناسب روش یہی معلوم ہوئی کہ خاموشی کے ساتھ اپنے وطن چلے جائیں اور بیوہ ماں کی خدمت میں زندگی بسر کریں۔

چنانچہ اُس وقت سے برابر ہمارے دوست شری بھگوان داس جی مستقل طور پر اپنے گاؤں میں رہتے ہیں۔ سال میں دو تین پھیرے دہلی کے کرتے ہیں اور ہر پھیرے میں چند کتابیں سیاسیات کی یا "مڈل کلاس لٹریچر" کی خرید کر لے جاتے ہیں۔ مطالعہ سے جو وقت بچتا ہے، وہ خطوط لکھنے میں اور حقہ پینے میں صرف ہوتا ہے۔

اُن کا وہ پرائیویٹ پراپرٹی والا فلسفہ مدت ہوئی کہ دھواں بن کے اُڑ گیا۔ اب اُن کے خیالات کا انداز کچھ اور ہے۔ دوسرے تیسرے مہینے مجھے خط لکھتے رہتے ہیں جس سے میں اُن کی ذہنی قلابازیوں کا اندازہ لگاتا رہتا ہوں۔ اِس سلسلے میں اُن کا سب سے آخری خط جو مجھے دو ماہ قبل وصول ہوا تھا خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ اُس میں وہ لکھتے ہیں :- "میں تم سے ایک بات نہایت سنجیدگی کے ساتھ پوچھتا ہوں کیا زندگی کا مقصد حصولِ مسرت کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے؟ فرض کیجئے آپ نے دنیا میں رہ کر بڑے بڑے کام کئے۔ عزت بھی ملی اور نام آوری بھی ہوئی۔ ایک دن آپ دنیا سے چل بسے۔ اب دنیا والے آپ کے نام کی مالا جپیں یا آپ کو غیر فانی بنانے کی کوشش میں مختلف مقامات پر آپ کے مجسمے نصب کریں۔ آپ کو کسی بات سے کچھ سروکار نہیں۔ آپ تو چپکے سے کون جانے کہاں چل دئے۔ مرنے کے بعد معلوم نہیں آپ کا کیا ہوا۔ پھر بتائیے کہ آپ کی وہ عمر بھر کی جد و جہد اتنگ و دو، در جاں فشانی کس کام آئی۔ ہاں ایک چیز ہے جو کچھ معنی رکھتی ہے اور وہ ہر مینائے حیات کا بادۂ عشرت سے سرشار ہونا۔ یعنی دل کھول کر پیٹ بھر کے، پوری طرح ڈوب کر زندگی گزارنا۔ لیکن یہ مسرت جسم یا ذہن کو اذیت اور کوفت میں مبتلا کر کے ہی کیوں حاصل کی جائے؟ کسی شاہدِ رعنا کے آغوش میں کیا یہ چیز میسر نہیں آ سکتی؟ میں شعراء میں خیام کے سوا کسی کو نہیں مانتا۔ باقی سب مہمل بکتے ہیں۔ زندگی کا راز اگر کسی نے پایا تو وہ یہی دیوانۂ فرزانہ تھا .... میں اپنے چاروں طرف گلعذار نچے،

زہرہ جبیں لڑکیاں، اور حسین و رعنا لڑکوں کو دیکھتا ہوں۔ کل یہ نازک پھول کملا جائیں گے۔ یہ دوشیزائیں پوپلے منہ والی کھوسٹ بڑھیاں بن جائیں گی میرا ایک عزیز ہے کیسا بانکا اور سجیلا جوان تھا وہ کبھی! آج دق میں مبتلا ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ موت کا بھیانک چنگل اس کی شہ رگ کے قریب آپہنچا ہے یہ ہے زندگی کی حقیقت حسن کا ضیاع، مسرت کا اختصار ——— یہ فطرت کے وہ قانون ہیں جن کی علتِ غائی آج تک کسی کی سمجھ میں نہ آسکی۔ دنیا ایک ماتم خانہ ہے! زندگی جنازہ بردوش ہے: میں تو تمہارے زندگی کا سب سے عمیق مفکر خیال کرتا ہوں .... فکرِ فردا اور غمِ دوش سے کچھ حاصل نہیں۔ کھاؤ، پیو اور مزے اُڑاؤ! جب موت آئے تو اطمینان کے ساتھ جان دے دو اس اطمینان کے ساتھ کہ ہم نے اپنی زندگی کے لمحاتِ گراں کو بد ذوقی اور بد توفیقی کی نذر کر کے برباد نہیں کیا.......... دنیا کے غریب؛ لیکن آپ کو اُن سے کیا؛ ہمدردی! آپ کو اُن سے ہمدردی ہے! خوب! مگر اُن کو آپکی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔ وہ جب چاہیں گے غاصبوں سے اپنا چھینا ہوا مال واپس لے لیں گے۔ ہمدردی منافقت کا دوسرا نام ہے! اخلاق! اچھا، یہ اخلاق، اور اس کی ذریات کا تقاضا ہے؛ ہوگا! مگر میں اس فرسودہ اصطلاح سے بیزار ہوں۔ کس قدر پوچ اور سوقیانہ تخیل ہے! ......"

تم نے دیکھا ابن میاں! یہ وہی شخص ہے جو کبھی تاج محل کو "ام مورل" کہا کرتا تھا، اور دنیا کی ہر اچھی بُری چیز کو سرمایہ داروں کی عیاشی کہکر قابلِ نفرت ٹھیراتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی کے متعلق بہت سے مختلف نظریے ہوسکتے ہیں، اور ایک سوچنے سمجھنے والے انسان کے لئے نہایت دشوار ہے کہ وہ کسی ایک نظریئے کا ہو جائے اور تازیست اُسی کا ہو کر رہے۔ پھر تمہیں بتاؤ کہ کسی مخصوص فلسفے کو زندگی کا صحیح ترین فلسفہ سمجھ کر اُس کی خاطر اپنے مستقبل بلکہ اپنی ساری زندگی کو خطرے میں ڈال دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ بھگوانداس کے حالات سے تم یہ بھی معلوم کر سکتے ہو کہ سیاسی کام ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جن میں اقتصادی خوش حالی اور معاشی اطمینان سب سے زیادہ اہم ہے۔ اگر تمہارے پاس یہ چیز نہیں ہے تو تم کبھی جنگِ آزادی کے سپاہی نہیں بن سکتے۔ اور میاں! سپاہی وپاہی بننے کی نوبت ہی کہاں آتی ہے۔ جس دن بھی ذرا سی بے عنوانی کا اظہار تمہاری طرف سے ہوگا اُسی دن جیل میں ٹھونس دیئے جاؤ گے۔ اب سال چھ مہینے تک پڑے سڑا کرو۔ بے اختیار یہی کہو گے کہ اس سے تو بھاڑ میں پڑے سڑتے رہتے تو بہتر ہوتا۔ اور یہ نہ سمجھنا کہ جیل میں آرام کے ساتھ گزرتی ہے اور کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ یہ محض کہنے کی باتیں ہیں کہ سیاسی قیدیوں کو بہت سی مراعات حاصل ہوتی ہیں۔ اور وہ ترجیحی سلوک کے مستحق سمجھے جاتے ہیں۔ اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ جو سلوک معمولی قیدیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے وہی سیاسی قیدیوں کے ساتھ بھی کیا جاتا ہے۔ گاندھی اور جواہرلال کی بات دوسری ہے۔ تم جیسے آزادی کے سپاہیوں کو تو وہ ہتھکڑی پہنانے سے بھی نہیں چوکتے۔ لو، ایک قصہ سنو!

کانپور میں میں جن صاحب کے مکان میں رہتا تھا وہ چمڑے کی تجارت کرتے تھے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بہت زیادہ مالدار تھے۔ مالدار ہونے کے علاوہ وہ اور بھی بہت سی خوبیوں کے مالک تھے لیکن اُن کا لڑکا نہایت پاجی تھا۔ مطیع اللہ نام۔ مگر اطاعت سے کوسوں دور۔ انتہائی کوششوں کے باوجود کم بخت نے کچھ پڑھ کے نہیں دیا۔ باپ نے روپیہ پانی کی طرح بہایا، اور جس اسکول میں وہ پڑھتا تھا اُس میں ہزاروں روپیہ بطور امداد کے دے ڈالا۔ مگر وہ کسی طرح ہائی اسکول کے امتحان میں پاس نہ ہوا۔ جب عمر بہت زیادہ ہوگئی تو مجبوراً تعلیم ترک کرا دی گئی۔ اب اُسے لیڈری کا شوق چرایا۔ معلوم نہیں اُس کے دماغ میں سیاسی بیداری کے جراثیم کہاں سے آگئے۔ غرضیکہ قومی و ملکی کاموں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ایک کپڑے کے مل میں اسٹرائک ہوئی تو آپ ماشاء اللہ اُن لوگوں میں تھے جو اپنے جھوٹے سچے دعووں اور اشتعال انگیز تقریروں سے مزدوروں کو بہکاتے اور ورغلاتے ہیں اور اُن کو غلط راستے پر ڈال کر اُن کی مظلومیت میں مزید اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ نتیجہ جو ہونا تھا وہ ہوا۔ مع اپنے ساتھیوں کے دھر لئے گئے۔ پولیس نے بے تامل ہتکڑیاں ڈال دیں۔ اُنہوں نے بہت ہچر مچر کی۔ مگر وہاں بھلا کون سنتا تھا۔ چاروناچار سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ سب کو لاری میں ٹھونس دیا گیا اور لاری چل پڑی۔ لاری میں بیٹھتے ہی مطیع اللہ کو حاجت محسوس ہوئی اُس نے پولیس افسر کو اپنی خواہش اور ارادے سے مطلع کیا۔ پولیس افسر نے اُس کی خواہش اور ارادے کو کمزور سمجھ کر کچھ اہمیت نہ دی، اور ڈانٹ کر کہا،

"ابھی نہیں، بیٹھے رہو!" چند منٹ مطیع اللہ نے صبر کیا۔ مگر خواہش بہت قوی اور ارادہ نہایت مضبوط تھا۔ اس لئے زیادہ دیر تک صبر نہ کیا جا سکا اُس نے پھر پولیس افسر کو یاد دہانی کرائی۔ وہ کمبخت نہایت ہی شقی القلب تھا پھر ٹال گیا۔ مطیع اللہ نے کچھ دیر اور صبر کیا۔ لیکن اب خواہش کی قوت اور ارادے کی مضبوطی اس قدر شدید ہو گئی کہ دونوں میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز کرنا ناممکن معلوم ہوا۔ اُس نے تنگ آ کر پولیس افسر کو ایک ایسی دھمکی دی کہ وہ لاری روکنے پر مجبور ہو گیا۔ لاری جس جگہ رُکی وہ ایک غیر آباد سا مقام تھا۔ سڑک کے ایک طرف کچھ کچے پکے مکانات تھے اور دوسری طرف ایک وسیع میدان دُور تک چلا گیا تھا۔ مطیع اللہ لاری سے اُتر کر ایک پولیس مین کو اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا میدان کی جانب بھاگا۔ جب دونوں ایک محفوظ مقام پر پہنچ گئے تو مطیع اللہ نے کہا "ہتکڑی کھول لو — جلدی!" "ہتکڑی تو میں نہیں کھول سکتا" پولیس مین نے کہا، "تمہارے پتلون کے بٹن کھولے دیتا ہوں"۔ . . . . . .

میں نے یہاں تک لکھا کہ تبن میاں کا ساتواں خط ملا۔ "ہندوستان میں ستیہ گرہ شروع ہو چکی ہے اور میں تقریباً اس خط کے ساتھ ساتھ یہاں سے روانہ ہو رہا ہوں . . . . . ."

اب میں اس کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں کہ تبن میاں پر خاک ڈالوں اور تمام اُردو دان طبقے کو اپنا مخاطب بنا کر کہوں:-

لو ایک قصہ سُنو!

شکیلہ اختر

سڑک پر

پنگ پنگ پینگ ۔ کی مخصوص آواز کے ساتھ گرلز کالج کی لاری تیزی سے جا رہی تھی ۔ میں نے عینک کو اپنی جگہ پر ٹھیک طرح سے جاتے ہوئے لاری کے نیلے پردے کو تھوڑا سا سرکا دیا ۔ موٹر ہسپتال کے احاطے کے قریب سے گزر رہی تھی ۔ تیزی سے چلتی ہوئی گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ ایک کوٹھی کے سامنے ٹھہر گئی ۔ سینٹ کی تیز لہک اور ریشمی کپڑوں کی لطیف سرسراہٹوں کے ساتھ موٹر چل دی ۔ بلند عمارتیں بجلی کی طرح نگاہوں میں کوند رہی تھیں ۔ اور دوپہری سے ہر روز بس ایک طرح کے ٹوٹے پھوٹے شکستہ حال مکانوں کے اندرونی اور بیرونی نظاروں سے طبیعت اکتا گئی تھی ۔ وہی بے ہنگم سے ٹاٹ کے رلو دے پردے اور چھپروں پر گندے کپڑوں کے ڈھیر۔

میں نے پردہ برابر کر لیا ۔ لاری کی سیٹیں بھری جا رہی تھیں ۔ طرح طرح کی صورتیں کوئی تازہ پھول کی طرح شگفتہ، کوئی پژمردہ ۔ کئی نگاہیں تیکھی اور مغرور تھیں، کئی محجوب اور شرمندہ ۔ میں نے ہینڈل سنبھالا اور اپنے میز پوش کی نامکمل پتیوں کو بنانے لگی ۔ موٹر پینگ کی ایک آواز کے ساتھ رک گئی ۔ سیاہ ٹوٹے ہوئے جھلملی والے بوسیدہ کواڑوں کو پیچھے دھکیلتی ہوئی ایک لڑکی اپنے ننگے پاؤں کو بدرنگ ساڑھی کے اڑسے ہوئے کناروں سے بمشکل چھپاتی شرماتی ہوئی آ کر بیٹھ گئی ۔ ڈرائیور روز کی طرح پان چباتا ہوا آگے بیٹھا اس طرح جلے بازیاں کر رہا تھا جیسے اس کے دامن حسین پھولوں سے بھرے پڑے ہیں ۔ اور اسے سڑکوں پر لمبے گھونگھٹ والیوں کی زیادہ پروا نہیں ٹم ٹم اور بگھی والوں کی چیخ اکڑتے ہوئے ڈرائیور کی گھڑگھڑاتی ہوئی لاریاں اور بوجھ سے لدے ہوئے رکشا والوں کے تھرتھراتے محلوں کے درمیان لاری آہستہ آہستہ چل رہی تھی جھلملاتی ہوئی دکانوں سے للچائی نظریں نیلے پردے سے ٹکرا رہی تھیں، پان صابن اور پنساری کی دکانوں، دکانوں کے چھجوں اور سڑک پر کھڑے ہوئے چند لوگ اپنے جبڑوں تک دانت کھولے ہوئے گھناؤنی ہنسی ہنس رہے تھے ۔ گندے ٹوکروں اور ٹوٹی ہوئی خوانچوں میں بدرنگ سوکھے اور سکڑے ہوئے کیلوں اور مالٹوں کو لیے میلی عورتیں لاری کو دیکھتی ہوئی بار بار اپنا سر کھجلا رہی تھیں، اور نالے سے لگے ہوئے دکانوں سے چپک چپک کر چلتے ہوئے کچھ سوکھے لوبلے اور زرد ہاتھ طرح طرح کی صداؤں کے ساتھ پھیلے ہوئے تھے ۔ میں نے نیڈل کو تیزی سے چلاتے ہوئے دوسرے ہاتھ کا پردہ چھوڑ دیا ۔ روز روز بس ایک ہی منظر دیکھتے دیکھتے طبیعت چڑچڑا رہی تھی ۔ مگر پردے کے اندر ۔ ؟ وہاں بھی تو ہمیشہ کی طرح وہی صورتیں تھیں اور وہی باتیں ۔

زاہدہ نے پیچھے کا پردہ بالکل اٹھا دیا ۔ قریب ہی چھوٹی سی چمچماتی ہوئی کار سے دو شوخ نگاہیں ہمدائی نظروں سے ٹکرا کر مسکراتی ہوئی گزر گئیں تین سائیکلیں لاری کے پیچھے پیچھے سرگوشی کرتی ہوئی تیزی سے چکر لگا رہی تھیں ۔ میں اپنی جگہ پہ سمٹ کر بیٹھ گئی ۔ شیاما نے منہ پھیر لیا ۔ یاسمین شرما کر بکھرے ہوئے بالوں کو اپنی انگلیوں سے برابر کرنے لگی ۔ اور زاہدہ نے بڑبڑاتے ہوئے ایک جھٹکے سے لاری کا پردہ گرا لیا ۔ اڑتے ہوئے پردے سے کچھ دور تک سائیکلوں کے پہیے نظر آتے رہے اور قہقہوں کی کھسیانی آواز سن کر بوڑھی دائی لڑکیوں کو تاؤ دینا گھو ۔ نے لگی ۔ لون کا چکر کاٹتی ہوئی موٹر قدم کنواں کی طرف جا رہی تھی ۔ گاڑی اب شہر کے فیشن ایبل حصے سے گزر رہی تھی ۔ پردے آزاد چھوڑ

دیئے گئے تھے۔ نئی نئی طرح کی عمارتیں، جھلملاتے ہوئے شیشے اور رنگ برنگ کے لہراتے ہوئے پردے "سینٹ پیٹرز" کی خوشبو "سیزن فلاورز" کی حسین رنگینیاں" اور لہلہاتے ہوئے بیلوں کی لپٹیں روز کی طرح دعوتِ نظر دے رہی تھیں۔

ساری سیٹیں بھر چکی تھیں۔ بس ایک جگہ بلقیس کی باقی رہ گئی تھی۔ اور بلقیس کا آ کر خاموشی سے بیٹھ جانا کوئی اتنا آسان نہ تھا۔ جب تک انہیں کوئے کی جگہ نہیں ملتی۔ وہ منہ لٹکائے لاری کے چھتے کو پکڑے ہوئے جھومتی رہتی۔ اور اس کے چھتے کتوں کی وجہ سے لاری کو خواہ مخواہ کی دقت پیش آتی رہتی تھی۔ پھر سب سے بڑھ کر ان کے مکان کا وہ ڈھلوان کتنا خطرناک تھا ——؟ ایک روز تو میری عینک ٹوٹتے ٹوٹتے بچی۔ لیکن کر ہی کیا سکتی تھی؟ گرلز کالج کے بڑے بڑے چندہ دینے والوں میں یہ مکان بھی تو تھا —— ! بادامی رنگ کی وسیع چمکیلی عمارت پر سیاہ بوڈر خوبصورت چوڑے چوڑے سفید موٹے شیشوں والے دریچے اور نازک سے چکر کھاتے ہوئے زینے، بلقیس دور تک اپنا مکان مڑ مڑ کر دیکھتی رہتی۔ اور اس کے کتے اپنے سلسلے بچوں سمیت لمبے لمبے بالوں کے درمیان چھوٹا چھوٹا منہ کھولے کچھ دور تک بھونکتے جاتے تھے۔ پھاٹک کے خوبصورت جنگلے سے لٹکے ہوئے نرم نرم روئی کے گالے کی طرح چھوٹے چھوٹے پلوں کے کھیل سے ڈرائیور ہمیشہ پریشان رہتا تھا۔ لاری کا کسی مکان پر تھوڑی دیر تک بھی ٹھہر جانا بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے جب تک موٹر کھڑی رہتی میں بڑی دلچسپی سے سڑک کی ڈھلوان پر بلقیس کی کوٹھی کے احاطے کے قریب ایک چھوٹی سی پان کی دکان کو دیکھتی رہتی، جو کاٹھ کے چار سیاہ کھمبوں کو گاڑ کر ان پر ٹین کی چھت ڈال کر بنائی گئی تھی اور کھمبوں کے بیچ میں دیوار کے تختوں کو جوڑ کر ایک تخت کی صورت دے دی گئی تھی۔ اور پھر اس تخت کے نیچے کھمبوں کے نچلے حصے کو تین طرف سے تختوں اور کاٹھوں سے گھیر کر زمین میں ایک کوٹھڑی سی بنا دی گئی تھی۔ موٹر کے رکاؤ کے ٹھیک سامنے اس ننھی سی کوٹھڑی کا کھلا ہوا در تھا جس میں کواڑ کی جگہ ایک پھٹا ہوا کپڑا رسی سے لٹکا دیا گیا تھا۔ اور وہ کپڑا ہمیشہ اس طرح سرکایا ہوا رہتا۔ جیسے سچ مچ کے پردے جھول رہے ہوں۔ ایک چھوٹی سی پلنگڑی ایسی ٹھونس کر اس میں بچھائی گئی تھی۔ کہ اسے دیکھتے ہی گلے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ میں اکثر اسے دیکھتی ہوئی سوچتی کہ اس کوٹھڑی کی بلندی میں کیا کبھی کسی کو کھڑے ہونے کا اتفاق ہی نہ ہوگا؟ کوٹھڑی کے آگے اسی ڈھلوان پر تین چھوٹے چھوٹے بانس پر چٹائی رکھ کر شامیانہ بنایا گیا تھا، جس کے نیچے ایک چولہا تھا۔ ایک ٹوٹی ہوئی بالٹی، دو تین چھوٹی چھوٹی مٹی کی ہانڈیاں تھیں۔ ایک گردن ٹوٹی ہوئی صراحی۔ ایک چھوٹا سا لوٹا پھوٹا ہوا پتھر کا تین کونہ سِل اور اسی طرح کا ایک بے ڈھنگا سا بٹہ بھی تھا —— صبح کو آتے ہوئے ہمیشہ ایک بیمار سی عورت کو چولہے پر کبھی مولی اور شلغم کے پتوں کا ساگ بھونتے ہوئے دیکھتی، جس کے کندھوں سے اکثر پیٹ سے اونچا، میلا، گریبان کھلا ہوا کرتہ پہنے اور کبھی ننگے بدن اور سوکھی ہوئی کمر میں نظر نہ لگنے کا میل سے چکٹ ڈنڈا پڑا ہوا بچہ چمٹا رہتا کتنی عجیب سی مر رہی تھی یہ زندگی؟ —— درختوں کے نیچے فیول کے سائے میں کتنی زندگیوں کو رینگتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر یہ سڑک کے ڈھلوان پہ ایسی نامکمل سی مگر چلتی ہوئی زندگی —— !

بس ایک طرح سے ہینڈل گھماتے گھماتے جی گھبرا گیا تھا۔ دو دن سے انتہائی کوشش کر رہی تھی۔ کہ کسی طرح یہ جلد ختم ہو لے تو اپنے میز پر بچھاؤں۔ بچارا میرا میز ننگا پڑا ہوا کتنا برا معلوم ہوتا ہے۔ میز اور ننگا؟ —— اسی لئے تو میں نے اپنا کمرہ ہی بند کر رکھا تھا۔ کہ کوئی دیکھ نہ لے کہیں!

سڑک پر اونچے نیچے قد کے پیٹ پھولے پھولے بچے اپنی ناکوں کو سڑ سڑاتے زور زور سے تالی بجاتے ہوئے چیخ رہے تھے: "ہوا گاڑی" —— "ہوا گاڑی" —— پھٹن پھون والی ہوا گاڑی —— کسم نے منہ بناتے ہوئے کہا: "ان کمبختوں کو سردی بھی نہیں لگتی کبھی —— ؟ جو ایسے چیخ رہے ہیں

اللہ یہاں شال اور سوئیٹر کے ہوتے ہوئے بھی ٹھنڈ سے آواز نہیں نکلتی۔ بھاگوتی نے اُونی چادر میں ہاتھ لپیٹتے ہوئے کہا۔

"پھر یہ تو دیکھو وہ ننگے بدن ایسے بے پروا اچھل رہے ہیں جیسے انہیں کپڑوں کی ضرورت ہی نہیں۔ توبہ! ماں باپ بھی کتنے ظالم ہیں۔ جو اس کڑاکے کی سردی میں گھروں سے انہیں نکلنے دیتے ہیں لیکن جو اس طرح نمونیا و مونیا ہو جائے تو بس روتے پھریں گے"۔

راجکماری کی باتیں سُن کر میں نے ایک تیز نظر سامنے والی کوٹھڑی پر ڈالی ——— گھر ——— ؟ جس کا گھر ہی سڑک اور سڑک کا ڈھلوان ہو وہ کیا کرے! ——— ؟

موٹر تیزی سے چلدی۔ بلقیس کی گود میں ایک خوبصورت پلّا کلبلا رہا تھا۔ یاسمین نے اس کے لمبے لمبے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "کسے دوگی بلقیس"؟ ——— "یہ ہیڈ مسٹرس کے لئے ہے۔ پرنسپل صاحبہ کے واسطے تو ابھی بچے نبلہ ہو رہے ہیں اسی لئے تو ان کی اتنی حفاظت ہوتی ہے۔ یہاں کسی کے پاس ایسے کُتے ہیں ہی نہیں۔ یہ کُتے اِس طرف آئیں گے بھی کہاں سے ؟ خاص کر ابّا جان نے اس کُتے کا جوڑا ہندوستان سے باہر سے منگوایا ہے۔ اور اِتنی دُور سے منگانا کچھ آسان تھوڑا ہی ہے"۔ بلقیس کی باتوں سے جل کر راجکماری گردن پھیر کر باہر دیکھنے لگی۔ اب کالج کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ قسم قسم کے لڑکے لاری کو مُڑ مُڑ کر تکتے، اشارے اور جملہ بازیاں کرتے ہوئے فٹ پاتھ پر چل رہے تھے۔ سڑک ختم ہو رہی تھی۔ اپنا کالج قریب تھا میز پوش رکھ کر میں اپنی کتابیں دوہرانے لگی۔ حساب کے خیال ہی سے دماغ پھر اُلجھنے لگا۔ اور آج چھ سے سات بجے تک نرسنگ کا لیکچر بھی تو تھا ———!

پانی زور زور سے برس کر ختم ہو چکا تھا۔ سرد ہواؤں کیساتھ تھوڑی تھوڑی بوندیں بھی پردے سے اندر آ رہی تھیں۔ اپنا مفلر گردن پر لپیٹتے ہوئے میں نے دونوں طرف کا پردہ ہلا کر زور سے پکڑ لیا۔ لاری رُک رُک کر لڑکیوں کو اتار کر تیزی سے بھاگی جا رہی تھی۔ موٹر میں اب پھیل کر بیٹھنے کی جگہ نکل آئی تھی۔ بلقیس کے مکان کا چھجہ دُور سے نظر آیا۔ وہ اپنی کتابوں کو سمیٹنے لگی۔ موٹر اندھے سکول کے پاس سے مڑ کر سڑک کے جمع ہوئے پانی کو اُچھالتی ہوئی جانے لگی۔ بلقیس کے یہاں شاندار پھاٹک کی بلندی پر ٹوٹے شیشے کے بلب میں تیز روشنی ہو رہی تھی۔ اور اس کے قریب ہی اس محبوس سی کوٹھڑی کے بھیگے ہوئے پردے کی شگافوں سے کبھی کبھی مدھم سی شعاع دکھائی دے رہی تھی۔ موٹر سڑک سے ڈھلوان پر اُترتے ہی تیزی سے ہنگ ہنگ کرتی پیچھے ہٹی۔ سامنے بجلی کی روشنی میں کُتے کے بھیگے ہوئے پلّے ایک دوسرے پر اچھل کود کرتے ہوئے کھیل رہے تھے۔ ڈرائیور کی انگلیاں سردی سے شاید ٹھٹھری جا رہی تھیں۔ اس نے زور زور سے ہارن دیا۔ مگر وہ پلّے اس آواز سے مانوس ہو چکے تھے۔ موٹر ہنگ ہنگ کرتی ہوئی کچھ آگے بڑھی۔ پلّے ڈر کر قیں قیں کرتے ہوئے چیخ پڑے۔ اور اندر سے بھوں بھوں کرتے ہوئے کُتے موٹر پر سامنے سے لپک پڑے ڈرائیور نے کُتے اور پلّوں کو بچاتے ہوئے لاری کو اس طرف موڑا۔ پیچھے سے "بس بس" "روک کے۔ روک کے" کی آواز اور ایک دو زور کی چیخیں بلند ہوئیں مگر لاری ڈھلوان پر ریت کے گھروندے کی طرح بانس کاٹھ ٹین اور چٹائی کو ایک چرچراہٹ کے ساتھ روندتی ہوئی کچھ دُور تک تیزی سے لڑھکتی چلی گئی۔ بلقیس رو رہی تھی۔ نوکروں کی اس بے احتیاطی سے کہیں بچارے پلّے مر جاتے تب! ——— ڈرائیور چیخ چیخ کر گالیاں دے رہا تھا "اندھے کہیں کے ایسے بھی راہ چلتے ہوئے سڑکوں پر قلعے بنائے جاتے ہیں۔ اور کوئی اسپرنگ یا شیشہ جو ٹوٹ جاتا تو کون دیتا؟" موٹر زور سے ایک جھٹکے کیساتھ واپسی کے لئے مُڑی۔ لاری کے پردے اُٹھے ہوئے تھے۔ گول بلب کی روشنی کے سہارے بچارا پان والا کچھ ڈھونڈھ رہا تھا۔ اور وہ بیمار سی عورت اپنے بھیگے ہوئے آنچل سے بچے کو چھپائے بانس اور کاٹھ کے چھوٹے سے ڈھیر کے پاس بے سروسامان کھڑی چاروں طرف تک رہی تھی۔

علی عباس حسینی

تار بابو

بابوجی کو اس اسٹیشن پر آئے ہوئے کئی مہینے گزر گئے تھے۔ وہی اسٹیشن ماسٹر تھے، وہی اسسٹنٹ، وہی ٹکٹ بابو تھے اور وہی تار بابو۔ اسٹیشن بھی ویسا ہی تھا۔ مال گاڑی کے دو ڈبے کھڑے کر دیئے گئے تھے، ایک اسٹیشن کا دفتر، دوسرا بابوجی کا کوارٹر۔ دن رات ملا کر دو گاڑیاں ادھر سے گزرتی تھیں اور صرف دو ہی بار اسٹیشن کھلتا تھا۔ آنے جانے والے مسافروں کی تعداد بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ کل ملا کر پانچ سات تک نمبر پہنچتا تھا۔ اسلئے کام تو بہت تھوڑا ہی تھا، مگر بابوجی کے لئے اس کالی کوٹھری میں بند رہنا یا روشنی جلانے والے مہراج سے باتیں کرنے کے سوا اور کوئی ذریعہ وقت کاٹنے کا تھا ہی نہیں۔ ان کی عمر کے بیس سال، الہ آباد سے شہر میں گزرے تھے جہاں اسکول کالج، یونیورسٹی کے علاوہ بائسکوپ بھی تھے، ناچ گھر بھی اور کھیل کے میدان بھی۔ جہاں آئے دن میلے ہوا کرتے تھے اور گنگا کے گھاٹ پر صبح و شام پجاریوں ہی کا ہجوم نہ رہتا تھا بلکہ تماشائیوں کا بھی۔ اس طرح کی زندگی کے بعد اکیسویں سال میں بودھ پور اسٹیشن کے مال گاڑی کے ڈبے میں دن رات بند رہنا قید تنہائی سے کسی طرح کم نہ تھا لیکن بوڑھی ماں اور چھوٹی بہن کے لئے یہ مصیبت جھیلنا پڑ رہی تھی۔ آخر پیٹ بھرنے کو کھانا اور تن ڈھکنے کو کپڑا تو ضروری تھا۔ اسلئے تیس روپیہ ماہوار پر یونیورسٹی کی تعلیم چھوڑی، ہاکی اور فٹ بال کے میدان چھوڑے۔ گنگا کنارے کے جلوے چھوڑے، اور اس پنجرے میں بند ہونا منظور کیا۔

اب وہ تھے اور یہ کال کوٹھری، کوسوں نہ آدم نہ آدم زاد۔ سب سے قریب گاؤں تین میل پر تھا۔ یہاں مہراج کا مکان تھا۔ وہ اسلئے تو دونوں گاڑیاں دیکھکر، اور شام کو اپنی لالٹین جلا کر گھر بھاگ جاتا اور کبھی بارہ بجے، کبھی ایک بجے کبھی صبح ہوتے اسٹیشن پلٹتا تھا۔ اور وہ بیچارے صحرائے افریقہ سا دن، اکیلے ہی طے کرنے اور ہمالیہ کی سی راتیں تنہا ہی کاٹتے۔ اس تنہائی نے ان کے دل میں ساتھی کی خواہش اس قدر پیدا کر دی تھی کہ وہ بعض وقت یہ دعا کرنے لگتے تھے کہ درختوں کے بھی زبان ہو جائے اور چڑیاں اور چوپائے بھی ان سے باتیں کرنے لگیں۔

اُنہوں نے دو جاندار پال رکھے تھے۔ ایک تو ان کے کوارٹر کے پیچھے ایک سوراخ میں چیونٹیوں کی ایک فوج تھی۔ انہوں نے ان کا نام "سیوک دل" رکھا تھا۔ وہ صبح و شام دونوں وقت تھوڑا سا آٹا، چاول یا شکر ان کے بل کے قریب ڈال دیتے تھے۔ پھر ان چیونٹیوں کی سرگرمی دیکھنے لگتے تھے۔ وہ بیتابی سے ان چیزوں کی طرف دوڑتیں، ایک ایک دانے پر تین تین چار چار لپٹ جاتیں، پھر ان کو ریلتی ٹھیلتی، ڈھکیلتی، اٹھاتی، اپنے بل میں لے جاتیں۔ انکی حرکتوں کو وہ بغور دیکھتے رہتے تھے۔ ان میں سے ایک بھی خود ان چیزوں کے کھا ڈالنے کی کوشش نہ کرتی تھی۔ وہ اس نظارے کو دیکھتے دیکھتے سوچنے لگتے تھے کہ "اگر انسان بھی اسی طرح مل جل کر کام کریں، ہر فرد اپنی ذات پر جمہور کے فائدے کو ترجیح دے۔ ذرائع معاش اکٹھا کرکے ضرورت کے مطابق ہر ایک کو پہنچاتے جائیں تو کتنا ہی اچھا ہو نہ لڑائی ہو نہ جھگڑا، نہ چوری نہ ڈاکہ! ---- مگر جمہور کے لئے ہر فرد کی جدوجہد اور وہ بھی اس قدر مسرت، مستعدی اور خلوص کے ساتھ، شاید بے عقل چیونٹیوں ہی کا حصہ ہے۔ عقلمند انسان تو خود غرضی و نفس پرستی ہی میں مسرت ڈھونڈتا ہے!"

دوسرا جاندار جو تار بابو کے پالتو ہونے کا فخر رکھتا تھا۔ وہ ایک مکڑی تھی۔ نہ جانے ہوا کا کونسا جھونکا اس زہریلے عیار کیڑے کو تار بابو کی مال گاڑی تک اُڑا لایا تھا۔ ایک دن جب صبح کی سنہری کرنوں نے ان کو گدگدا کے جگایا تو انہوں نے حسب معمول اپنی کال کوٹھری کی دیواروں پر نظر کی۔ انہیں چھت سے ملے ہوئے ایک کونے میں کوئی چیز چمکتی سی دکھائی دی۔ انہوں نے دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ کالی دیوار میں چمک کی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ گھبرا کے پلنگ سے اُٹھے اور اس کونے کی طرف بڑھے

دیکھا تو ایک چھوٹی سی مکڑی نے جالا تنا ہے۔ ان کا ہاتھ بے سوچے سمجھے جھاڑو کی طرف بڑھ گیا کہ جالے کو صاف کر دیں اور مکڑی کو مار گرائیں مگر جھاڑو اٹھاتے اٹھاتے مکڑی پر نظر پڑ گئی، کالا سا جسم پر پتلی پتلی کالی لکیریں بھلی معلوم ہوئیں۔ ان کی صورت دیکھ کر خوف سے سمٹ کر جالے کے بیچ میں بیٹھ گئی اور اس طرح بے حس بنی تھی کہ جان پڑتا کہ بالکل بے جان ہے۔ تار بابو آپ ہی مسکرا دیئے۔ سر ہلا کر بولے: "اچھا تو آج سے میری مہمان ہے! میں تجھے نہ ماروں گا، بلکہ کھانے کو دوں گا!" پھر سر کھجا کر کہنے لگے، "مگر تیرا کوئی نام تو ہونا چاہیئے آخر میں تجھے کس نام سے پکاروں گا!" پھر تھوڑی دیر تک مکڑی کی طرف دیکھتے رہے۔ اسے بھی اب کچھ جان بچنے کی امید ہو چکی تھی، جھاڑو اب ہاتھ میں نہ تھی۔ بابو جی اس کی طرف دیکھ دیکھ کر طرح طرح کا منہ بنا رہے تھے اور بڑبڑا رہے تھے۔ شاید خوش ہونے والے تھے! اس نے اپنے ننھے ننھے پاؤں پیٹ سے نکالے۔ ذرا مٹکتی ہوئی جال پر چلی۔ بابو جی ہنسنے لگے۔

"ہا جی! ناچتی، مٹکتی ہے، میرے سامنے کولھے مٹکا کر چلتی ہے، جانتی ہے نا کہ میں بن بیاہا ہوں، مجھ کو پھنسانا چاہتی ہے، بڑی شریر ہے تو! اچھا میں نے تیرا نام آج سے رکھا: راج رانی!"

کئی دن تو انہوں نے چیونٹیوں کی طرح "راج رانی" کی خاطر تواضع میں روٹی اور چاول کے باریک باریک ٹکڑے جال میں اسلئے ڈالے کہ وہ بھی ان کے کھانے میں شریک ہو جائے، مگر انہوں نے دیکھا تو اس نے ان کی چیزوں کی طرف توجہ تک نہ کی، وہ اپنا شکار خود ڈھونڈتی تھی، کوئی اڑتا ہوا کیڑا، مکھی، مچھر، ہر روز اس کے جال میں پھنسا دکھائی دیتا تھا، اسلئے انہوں نے بھی مہمانداری کے فرائض ترک کر دیئے۔ ہاں اب یہ ضرور روزمرہ میں داخل ہو گیا کہ جہاں وہ تنہا ہوئے اور راج رانی سے باتیں کرنے لگے۔ وہ خاموشی سے انکی ساری باتیں سن لیتی تھی۔ ان کے طعنے بھی، انکی پھبتیاں بھی۔ ان کا درد دل بھی، اور انکے طنزیہ فقرے بھی!

وہ کہتے: "تیری حالت، راج رانی، عجیب ہے، تجھے سوائے اپنے کسی سے کوئی مطلب نہیں، تو بڑی عیار ہے، اور اتنی ہی خودغرض، تو بالکل شخصی راج کرتی ہے، شخصی! چیونٹیاں غریب ایک دوسرے کے لئے جان دیتی ہیں، کبھی کوئی چیز اکیلی نہیں کھاتیں، مگر تو بالکل ان کے برعکس ہے، میں تو تجھے اتنا ہی نفس پرست و خودغرض پاتا ہوں جتنا کہ آجکل کا انسان! تجھے بس اپنے ہی حلوے مانڈے سے غرض ہے! ——— مگر تجھ میں ایک شئے کی خوبی ہے۔ تجھ کو اپنے ہی کام سے کام ہے، تو پرائے پھٹے میں پاؤں نہیں ڈالتی! ——— اور اس حیثیت سے تو انسانوں سے کہیں بہتر ہے!"

بابو جی کی ساتھی کے لئے خواہش تمنا، بھوک اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ اتفاق سے انہیں ایک تار ملا۔ یہ تار ان کے نام نہ تھا۔ بلکہ بودھ پور سے تین کوس کے فاصلے پر ایک بڑے زمیندار رہتے تھے۔ ان کے نام تھا: تار میں لکھا تھا "رادھا اتوار کو شام کی گاڑی سے پہنچے گی۔ سواری کا انتظام کر دینا منوہر۔" یہ تار مجھے ہفتہ کے دن پانچ بجے شام کو ملا۔ بابو جی نے تار نسپل سے لکھا اور اسے ایک پیلے لفافے میں بند کر دیا۔ مہاراج کو پکارا۔ اتفاق سے وہ اس وقت وہاں موجود نہ تھا۔ ایک ٹھنڈی سانس لی اور دفتر والی مال گاڑی میں قفل ڈالتے ہوئے کوارٹر والی مال گاڑی میں چلے گئے ———

وہاں "راج رانی" اور "سیوک" دل سے اس طرح باتوں میں مشغول ہوئے کہ تار کا بالکل خیال ہی نہیں رہا۔ جب شام کی ٹرین آئی اور چلی گئی۔ اور مہاراج بھی اپنا ڈنڈا سنبھال کے گھر چلتا بنا۔ تو ان کو تار یاد آیا۔ مگر اب کیا کرتے۔ اب دل میں چور آیا۔ کیوں نہ اسے کل دن میں بھی چند گھنٹے روک لیا جائے، رادھا آرہی ہے، بظاہر اکیلی ہی ہوگی، ایک رات اس کالی کوٹھڑی میں رہ سکتی ہے چھ مہینے سے عورت کی صورت نہیں دیکھی۔ اس سے چند گھنٹے باتوں کا بہانا تو ہاتھ آئے گا۔ لیکن اگر کہیں بجز گنوار ہوئی تو؟ کیسے ہو سکتی ہے، ایسے گھروں میں جہاں تار کے ذریعہ آمدورفت کی اطلاع دی جاتی ہو عورتیں گنوار نہیں ہوتیں۔ ان کو باتیں کرنے کا سلیقہ ہوتا ہے لیکن اگر جوان نہ ہوئی، بوڑھی کھوسٹ ہوئی؟ ذرا اس پر جھنجھلائے، تحت الشعور میں دوشیزہ پری جمال کی جو بلائی خواہش تھی۔ اسے بہت سختی سے دبایا۔ بوڑھی ہوگی تو ماں برابر ہے۔ اور اگر جوان ہوئی تو بہن! ———

خیالات نے پھر پٹڑی بدلی تار کا منزل مقصود تک پہنچانا فرائض میں داخل ہے۔ اس کا روک لینا جرم ہے، مگر دلیے نے

اس کے لئے کوئی ہرکارہ نہیں دیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ڈاکیہ کے ہاتھ بھیجا جاسکتا ہے، اسکی باری کب ہے؟ کل ہی تو! پھر کیوں نہ خاموشی اختیار کی جائے؟ مگر مہاراج تو اپنے گاؤں سے تار لے جانے والے آدمی کا بندوبست کر سکتا ہے؟ آخر کیوں اس کے؟ بیچے تار نہ بھیجا جائے۔ لیکن اگر تار مل گیا تو سواری کا انتظام ہو جائیگا اور کال کوٹھری میں چند گھنٹے باتیں کرنے کو بھی رادھا نکالی نہ جاسکے گی ——— رادھا نام بھی تو پیارا ہے، ایسا کہ جس نے سری کرشن بھگوان کا بھی دل موہ لیا تھا، اس نام کی عورت خوبصورت ضرور ہوگی۔ وہ کالی اور بدصورت ہو ہی نہیں سکتی، اس کا جوان ہونا بھی ضروری ہے جس کا رادھا نام ہو وہ بوڑھی نہیں ہوسکتی، وہ تو ہمیشہ بانسری کی امر تان سنا کرتی ہے، وہ کیسے بوڑھی ہوسکتی ہے۔ دفعتہ "راج رانی" کی طرف پلٹے "کیوں راج رانی تمہاری کیا رائے ہے؟ گوپیوں کی سرتاج بھی کہیں بوڑھی ہوسکتی ہے؟ وہ بھی کیا سیتا ساونتری ہے؟ ان بیچاریوں کو البتہ اتنے دکھ بھرنا پڑے کہ اگر ایک ہی رات میں ان کے سیاہ بال سفید ہو گئے ہوں اور وہ جوان سے بوڑھی ہوگئی ہوں تو کوئی تعجب نہیں، مگر رادھا جو کرشن پرستی کی مدرا پیکر سدا مدہوش رہی، جو ہمیشہ اپنے کنول سے پاؤں پر ناچتی، گاتی، چہکتی دوڑتی پھری، وہ پری بھلا کیسے بوڑھی ہوسکتی ہے؟ وہ چاہے جتنے روپ بھرے، وہ ہمیشہ جوان ہی رہے گی!"

آٹے کی لوئی جو ہاتھ میں توے پر روٹی ڈالنے کے لئے ہوئے تھے وہ تھالی میں رکھ دی، دونوں ہاتھ مل کر ہاتھوں سے آٹا گرا دیا۔ پھر "رادھے شیام، رادھے شیام، رادھے شیام!" کہہ کر آنکھیں بند کر کے جھومنے لگے۔ پھر ایکبارگی چپ ہو کر ٹھنڈی سانس لی اور بولے "کہاں ایسے بھاگ!" انہوں نے جلدی جلدی پھنکنی کے ذریعے آگ کو پھونک پھونک کر بھڑکایا اور روٹیاں تیار کر ڈالیں۔ پھر تھالی میں ترکاری، دال اور روٹیاں رکھیں، اور لوٹا اور لگر لیکر کنویں پر پہنچے۔ وہاں اشنان کیا اور جگت پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔

پلٹتے وقت گرمیوں کی چاندنی خوب چھٹکی ہوتی تھی، معلوم ہوتا ہر چیز دودھ میں نہائی کھڑی ہے، ایسا آنند آیا کہ تھالی مال گاڑی میں جلدی سے رکھ کر باہر کھاٹ پر آ کر لیٹ رہے اور چاند سے آنکھیں لڑاتے لڑاتے سو گئے، اور رات بھر رادھا اور کرشن کی لیلا کے خواب دیکھتے رہے۔

صبح کو اٹھ کر جب اسٹیشن والی مال گاڑی میں گئے تو پیلا لفافہ نظر پڑا گویا دنیا کے سہاروں سے بے آس کوئی چینی انہیں حسرت بھری نظر سے دیکھ رہا ہے، پھر ان کے ہاں دل اور ضمیر کی لڑائی شروع ہوگئی۔ اور اس کشتی میں ان کی وہی گت بنی جو دو پہلوانوں کی لڑائی میں اکھاڑے کی نرم مٹی کی بنتی ہے، پسینے سے بھیگ گئے۔ گھبرا کر مہاراج کو آواز دی۔ اسکے اس نے سن لیا۔ آتے ہی بولا۔

"کیا ہے بابو جی؟"

"کل شام سے ایک تار آیا ہے موہنی پور جانا ہے!"

"تو کل تو ڈاک بھی آئیگی، ڈاکیہ کو دیدیجئے گا۔"

"نہیں خاص آدمی سے جانا چاہیئے۔"

"تو گاڑی دیکھ لوں، تو گاؤں میں جا کر کوئی آدمی ڈھونڈ دوں۔"

گاڑی آئی، چلی گئی اور مہاراج بھی تار لیکر گاؤں سدھارے۔ مگر وہ اسٹیشن ہی والے ڈبے میں بیٹھے رہے، ضمیر کی فتح کا بدلا اب دل لے رہا تھا۔ ایسا سنہری موقع، ایک عورت کا ایک رات کے لئے میزبان بننے کا موقع اپنی بیوقوفی سے کھو دیا۔ اب "راج رانی" سے جا کر کیا کہیں گے اور "سیوک دل" کو کیا منہ دکھائیں گے ——— صبح سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا۔ مگر رسوئی کرنے کو جی ہی نہ چاہتا تھا بیٹھے رہے، بیٹھے رہے، مگر کب تک؟ کوئی بارہ بجے گھبرا کر اٹھے، دفتر کا دروازہ بند کیا، اور کوارٹر کی طرف بڑھے، ہوا کے ایک گرم جھونکے نے وہ طمانچہ رسید کیا کہ منہ لال ہوگیا۔ انہوں نے چونک کر ادھر ادھر نظر کی چٹیل میدان سے معلوم ہوتا تھا ہلکا ہلکا سا دھواں اٹھ رہا ہے۔ درختوں کی پتیاں سوکھ سوکھ کر گر جاتی تھیں۔ ان کی کھڑکھڑاہٹ سے اس طرح کی آواز پیدا ہورہی تھی جیسی چتا میں جلتی ہوئی لکڑیوں سے۔ بگولے اٹھتے اور میلوں دوڑتے ہوئے نکل جاتے تھے جیسے وہ اپنے چکر میں دنیا کو لیکر چکی کے پاٹ کی طرح پیس ڈالیں گے!

وہ اپنے کوارٹر کا دروازہ کھول کر جلدی سے اندر گھس گئے۔ لوہے کا ڈبا اور وہ بھی بند بالکل تنور کی طرح گرم تھا، انہوں نے بھڑبھڑے ہوئے دروازے کھول دیئے۔ گرم گرم ہوا آنے لگی معلوم ہوتا تھا کہیں قریب ہی آگ لگی ہے اور شعلے لپک لپک کر ان کو بھی جلا ڈالتے ہیں۔ ہوا کے رُخ والا دروازہ

دکیا۔ اب ذرا آرام ملا۔ لیکن دھوپ کی چمک سے پائے نگاہ میں آبلے سے پڑنے لگے۔ آنکھیں بند کرکے پلنگ پر لیٹے جان پڑا لپکتے ہوئے کوئلوں پر لیٹ گئے ہیں۔ بستر اُلٹ دیا، کھرے پلنگ پر لیٹے۔ مگر چین نہ آتا تھا، جس کروٹ لیٹتے اُدھر والا پہلو جلنے لگتا۔ سر میں بھی دھمک شروع ہو گئی۔ گھڑے کو دیکھا، اس میں پانی تو ضرور رہتا مگر کھولتا ہوا۔ اسی کھولتے ہوئے پانی میں تولیہ بھگایا اور سر اور شانوں میں اسے لپیٹ لیا، ذرا تسکین ہوئی، آنکھیں بند ہونے لگیں، کہ ایک بار پیاس نے شدت کی۔ صبح سویرے صراحی بھر کر رکھدی جاتی تھی۔ آج ضمیر و دل کی کشمکش میں وہ بھی انہیں کی طرح لب خشک رہی۔ اسلئے سوال آب پر اُدھر سے بھی سوکھا ہی جواب ملا۔ اسی گرم پانی سے دو تین کلیاں کر لیں۔

غرض بھوک اور پیاس گرمی اور لو سے خوب خوب تڑپے، بیچین ہوئے کرب میں رہے لیکن فرزند آدم ہونے کی وجہ سے کئی گھنٹے جھیل گئے۔ خدا خدا کرکے پانچ بجے اور درختوں کے سائے لمبے ہونے لگے کنوئیں کی جگت والا پکڑ کا پیڑ خاص طور سے جائے پناہ نظر آیا۔ اپنی کال کوٹھڑی سے بھاگے۔ اور پانی کھینچ کر گڑ کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈال کر خوب غٹ غٹا کے لوٹا بھر پانی پی گئے۔ تھوڑی دیر دم لیا۔ ایک آدھ چیز ہی جو گیا اور ہونٹوں میں گنگنائیں۔ پھر گڑے پر گڑا کھینچا اور جی بھر کر نہایا۔ اتنا نہایا کہ سردی سے جسم کانپنے لگا اور ایسا کچھ محسوس ہوا کہ دل کا بوجھ ڈھل گیا۔

اتنے میں مہراج بھی آ گئے۔ تار بھیجنے کے بارے میں انہوں نے اطلاع دی کہ دوپہر تک کوئی آدمی نہ ملا۔ پھر لو کی وجہ سے کسی کی ہمت نہ پڑی، اب گیا ہے، گاڑی آتے آتے وہاں پہنچ ہی جائیگا۔ تار بابو کے دل میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ چلو اچھا ہی ہوا۔ اب اگر وہاں سے لوگ آئیں گے بھی تو دس گیارہ بجے تک، اس وقت تک تو رادھا سے ملنے اور گفتگو کا موقع مل ہی جائے گا ——

مگر یہ خوشی مہراج پر ظاہر نہ ہونے دی، اس کو تو ایسے ہی چہرے سے دیکھا جیسے بہت خفا ہیں کہ کیوں کسی طرح دھوپ اور لو کا خیال کئے بغیر ہی کسی آدمی کو تار لیکر نہ بھیجدیا۔ مہراج تجربہ کار تھا۔ سامنے سے ٹل گیا اور لالٹینوں کی صفائی میں منہمک ہو گیا۔

شام کو گاڑی آئی، بابو جی نے لین کلیر گارڈ کو نہ دیا بلکہ اسے ہاتھ میں دبائے تیسرے درجے کے زنانے ڈبے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہاں سے تو کوئی نہ اُترا لیکن سیکنڈ کلاس سے ایک عورت نے "قلی! قلی!" پکارنا شروع کیا۔

بابو جی نے پلٹ کر دیکھا اور گھبرا کر پوچھا: "کیا آپ رادھا ہیں!"

اس نے ان کو تعجب سے دیکھا اور سر ہلا دیا۔ انہوں نے لپک کر ڈبے کے کواڑ کھولے اور کہا "اُتر بیٹھئے" ساتھ ہی اُوپر چڑھ کر جلدی جلدی سامان اسباب اُتار دیا —— ابھی یہ کچھ اور کہا ہی چاہتے تھے کہ اینگلو انڈین گارڈ لپکتا ہوا آیا اُس نے جلدی سے ان کے ہاتھ سے لین کلیر لیا اور "یو فول" کہتا ہوا سیٹی بجاتا آگے بڑھ گیا۔

گاڑی نے ایک پھریری لی، کھنکھجورے کی طرح رینگی۔ اور پھر گھڑگھڑاتی ہوئی نکل گئی۔ اب وہ تھے۔ ان کے مال گاڑی والے دونوں ڈبے تھے، بوکھلائے ہوئے مہراج تھا، گھبرائی ہوئی رادھا تھی، اور اُداس لٹا ہوا اسٹیشن تھا۔

اُنہوں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا: "آپ کے ہاں تار تو بھیج دیا گیا ہے۔"

رادھا نے گھبرا کر پوچھا "کیا مجھے روکنے کے لئے؟"

تار بابو اور سٹ پٹائے۔ "جی! جی! نہیں تو۔ میرا مطلب ہے کہ زمیندار صاحب کے ہاں تار بھیجدیا گیا ہے!" ——

اس نے لبوں کا غنچہ بنایا اور کہا "اوہ! میں سمجھی! مگر میں ان لوگوں کے آنے تک کیا کروں؟ اس اسٹیشن پر تو کوئی ویٹنگ روم بھی نہیں!"

"جی یہ تو اسٹیشن بھی نہیں! مگر آپ میرے کوارٹر میں تشریف رکھ سکتی ہیں؟" "وہ کہاں ہے؟" رادھا نے پوچھا۔

"جی، وہ کیا ہے، اسٹیشن کی بغل میں، دوسری مال گاڑی!"

وہ ان کو کنکھیوں سے دیکھکر ذرا مسکرا دی۔

انہوں نے گھبرا کر مہراج سے کہا: "مہراج دیکھو ان کا اسباب اُٹھا کر کوارٹر کے پاس رکھو۔"

دس قدم میں وہاں پہنچے، جہاں اسٹیشن اور کوارٹر کی دونوں لالٹینیں اپنی اپنی روشنی میں ڈبوں کی اندرونی حالت "اکس رے" کی طرح پیش

کر رہی تھیں۔ بابو جی نے اسٹیشن کے گتے والے زینے پر چڑھ کر دونوں کاٹھ والی کرسیاں کھینچیں اور انہیں کوارٹر کے سامنے رکھ کر بولے "بیٹھئے!"

اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "آخر وہ لوگ ابھی کیوں نہ آئے؟"

"انہوں نے کہا۔ "تار بھیجنے میں دیر ہوئی۔ آپ کو تکلیف تو ضرور ہوئی۔ مگر مجھے بڑا آج آنند ملا!"

اس نے انکو ذرا تعجب سے دیکھا۔

انہوں نے چہرے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا: "جی پانچ مہینے سے اس جنگل میں اکیلا رہتا ہوں بس کچھ گھنٹوں کے لئے مہراج کا ساتھ ہوتا ہے، اس کے بعد......"

وہ ان کو غور سے دیکھ رہی تھی، بولی: "میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے"

انہوں نے کہا "میری خوش قسمتی!"

اس کے چہرے پر ایک ہلکا سا رنگ دوڑ گیا۔ اس نے کہا۔ "آپ الٰہ آباد میں تو کسی کالج میں نہ پڑھتے تھے؟"

انہوں نے کہا: "جی ہاں وہیں کالیستھ پاٹ شالا سے انٹرمیجیٹ پاس کیا ہے"

اس نے ایک خاص انداز سے کہا: "اور میں بلکے ودیالا میں ہائی اسکول میں پڑھتی ہوں"

"تو پھر آپ نے پارسال مجھے اپنے ہاں کے سالانہ مباحثہ میں دیکھا ہوگا، میں ہی نے تو تقریر میں اوّل انعام پایا تھا"

اس نے کچھ جھینپتے ہوئے پوچھا: "آپ کا نام؟"

"شیام موہن"

اس نے گردن جھکا کر ہلکا سا گھونگھٹ نکال لیا۔

بابو جی بھی کچھ شرمائے پھر کچھ سوچ اور خوش ہو کر بولے۔ "ارے آپ بابو منوہر لعل کی لڑکی نہیں؟"

اس نے اور بھی گردن جھکا کر سر ہلایا۔

وہ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

چاندنی اچھی طرح چھٹک چکی تھی گیدڑوں نے بولنا شروع کر دیا تھا کبھی کبھی سانپوں کی "تی، تی" بھی سنائی دیتی تھی، ذرا رک رک کر جھینگر بھی موٹر کی رٹ لگا رہے تھے۔ تپتی ہوئی زمین ٹھنڈی ہو چکی تھی اور چلتی ہوئی ہوا بھیگ چلی تھی۔ فضا میں ایک ہلکی سی خوشبو پھیل رہی تھی۔

مہراج نے پاس آ کر کہا: "بابو جی میں گاؤں میں جا کر دیکھوں تاکہ دیوی جی کے لئے سواری کہاری کچھ آ رہی ہے کہ نہیں!"

انہوں نے کہا: "ہاں، ہاں جاؤ" مگر اس کے جاتے ہی اپنے کو رادھا کے ساتھ اکیلا دیکھ کر اور گھبرا گئے۔ اس کی طرف دیکھا تو وہ کرسی پر اس طرح سمٹی بیٹھی تھی۔ جیسے حد سے زیادہ خوفزدہ ہے۔

انہوں نے کہا: "کوئی ایسی ڈرنے کی بات نہیں　- میں ہی تو ہوں"

اس نے ان کو ایک نظر دیکھا۔ پھر نگاہیں نیچی کر لیں۔ وہ بولی "مجھے آپ پر بھروسا ہے!"

انہوں نے کوارٹر کے زینے کی طرف بڑھ کر کہا۔ "چلئے کنوئیں پر چلیں، میں پانی کھینچ دوں آپ اشنان کر لیں"

"اشنان تو میں گھر ہی جا کر کرونگی"

"تو پھر منہ ہاتھ تو دھو ڈالئے"

یہہ کہتے کہتے وہ رسی گگرا اور لوٹا نکال لائے، اور کنوئیں کی طرف بڑھے۔ رادھا بھی ساتھ ہو لی۔ انہوں نے ایک گگرا پانی کا کھینچا۔ تھوڑا لوٹے میں ڈالکر اسے مانجنا چاہا۔ رادھا نے لوٹے پر ہاتھ رکھ دیا "آپ تکلیف نہ کریں میں مانجونگی"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے آپ مہمان ہیں"

"نہیں" اس نے کچھ خاص انداز سے انکی طرف دیکھ کر کہا۔

"نہیں" انہوں نے گردن جھکا کر کہا۔ اس نے پھر ایک تیز نیم کش مارا۔ انہوں نے گھبرا کر کہا۔

"اچھا آپ ہی مانجئے"

رادھا نے لوٹا مانجا، انہوں نے پانی ڈالا، دھو کر رکھ دیا گیا انہوں نے جلدی سے گگرے میں ہاتھ ڈالکر اسے مانج دیا اور اسے وضو دھا جب تک میں سے کھینچ کر نکال لیا۔ پھر کہا۔

"نہا ڈالئے نا۔ بڑا آنند ملے گا ساری تھکن دور ہو جائے گی"

"نہیں"

"ارے میں یہاں سے چلا جاتا ہوں"

"دھوتی تو بکس میں ہے"

"میں ابھی بکس لایا"

"نہیں، میں آپ ہی بکس میں سے نکالے لاتی ہوں"

"میں بھی ساتھ چلتا ہوں، جب تک آپ اشنان کریں گی میں اسٹوو جلا کر پوری ترکاری آپ کے لئے تیار کر دونگا"

"کیوں تکلیف کیجئے، میرے ساتھ بہت سی مٹھائی، پوریاں، پکوڑیاں اور پھل ہیں"

"اچھا تو پھر اپنے ہی لئے پکاؤں گا۔ آج تو دن بھر نہیں کھایا ہے"

"تو میرے ساتھ کی چیزیں کھانے میں کیا کوئی پاپ ہے؟"

"نہیں میں اپنے ہی ہاتھ کی پکائی ہوئی چیزیں کھاتا ہوں"

اس نے مڑ کر لوٹے اور گلڑے کا پانی پھینک دیا، پھر وہ بولی۔

"تو میں اپنے ہی ہاتھ کے کھینچے ہوئے پانی سے اشنان کرتی ہوں"

وہ مسکرا دئے: "آپ خفا نہ ہوں میں آپ ہی کے ہاں کی چیزیں کھاؤں گا"

اس نے حکم دینے والے لہجے میں کہا: "اچھا تو آپ منہ ہاتھ دھو ڈالئے اور میرے لئے پانی کھینچ دیجئے، میں ساری لیکر آتی ہوں"

جب وہ ساری لیکر پلٹی تو تارا بابو اپنے کوارٹر میں چلے گئے۔ وہاں پہنچتے ہی انہوں نے اپنے ٹوٹے ہوئے ٹرنک سے تیل نکال کر سر میں ڈالا اور لالٹین کی روشنی میں آئینے میں اپنا منہ دیکھ کر بال بنا ڈالے۔

وہ جب پلٹی تو ایک سادی سپید ساری پہنے ہوئے تھی۔ گورا رنگ دودھ کی دھلی ساری، چاندنی رات معلوم ہوتا تھا عورت نہیں جوہی کا پھول ہے۔

تارا بابو نے لمبی سانس لیکر کہا: "آج سے یہ کوٹھڑی سچ مچ کی کال کوٹھڑی ہو جائے گی"

اس نے پلٹ کر ان کے ڈبے کی طرف دیکھا۔ اس کا ایک حصہ چاندنی کی وجہ سے روشن تھا۔

وہ بولی: "مگر کوٹھڑی میں تو اجالا ہے"

تارا بابو نے کہا: "ہاں، مگر وہ بھی چاندنی کے دم سے ہے، جہاں اس نے ادھر سے منہ پھیرا اور پھر اندھیرا گھپ!"

وہ کچھ شرما سی گئی۔ اس نے جلدی جلدی ناشتہ دان کھولا اور ایک پلیٹ میں ان کے لئے مٹھائی، پوریاں، ترکاری نکالی۔ انہوں نے کہا: "یوں نہیں، اندر سے تھالی اٹھا لائیے۔ اور کھاٹ پر بیٹھ کر کھائیے"

"دیوی جی آپ بھی یہیں بیٹھئے، کرسیوں پر پلیٹ اور تھالی رکھیں گے اور ہم دونوں ایک ساتھ کھائیں گے"

وہ جھینپی تو ضرور مگر بیٹھ گئی۔ پھر کرسیوں پر تھالی اور پلیٹ میں چیزیں نکالی گئیں اور دونوں نے کھانا شروع کیا ——— وہ تو شرمائی سی چگتی ہی رہی۔ لیکن انہوں نے خوب ڈٹ کے کھایا اور پورا لوٹا بھر پانی پھر چڑھا گئے جب کھا پی چکے تو رادھا نے پوچھا: "آپ دن بھر یہاں کس سے باتیں کرتے ہوں گے"

تارا بابو نے کہا: "آئیے دکھاؤں، میرے دو دوست ہیں۔ ایک تو پورا سیوک دل اور دوسری راج رانی!"

اس نے تعجب سے پوچھا: "راج رانی؟"

انہوں نے کہا: "آئیے آپ سے تعارف کرا دوں"

وہ کچھ ہچکچاتی ہوئی ساتھ ہولی۔ پہلے چیونٹیوں کے بل کے پاس لائے وہ ابھی تک ان کی ڈالی شکر کے ریزے ڈھونے میں منہمک تھیں۔ تارا بابو انہیں بڑی محبت سے دیکھنے لگے۔ بولے۔

"دیکھئے، اتنی ننھی سی جان، ہوا کا ایک جھونکا آئے اور اڑا لے جائے یا چینی بھر پانی ہو تو سیکڑوں ڈوب کر مر جائیں، چلنے والا سیکڑوں کو کچلتا پیستا گزر جائے اور خبر بھی نہ ہو، مگر دل دیکھئے تو ہاتھی سے بھی بڑا جان پڑتا ہے اپنے لئے کچھ نہیں، دوسروں کیلئے سب کچھ، اتنا فرض شناس جاندار کہاں ملے گا؟"

وہ آہستہ سے بولی: "تو یہ ہے آپ کا سیوا دل!"

"ہاں"

رادھا نے منہ پھیر کر آنکھوں کا آنسو پی ڈالا۔

"آئیے اب آپ کو راج رانی دکھاؤں"

جب ڈبے کے اندر داخل ہونے لگے تو وہ گتے کے زینے پر ٹھٹکی۔ بابو جی نے کہا: "ڈریئے نہیں، چلی آئیے۔ آپ کو سب کچھ دیکھ لینے کا حق ہے"

جب وہ شرماتی ہوئی اندر آئی۔ تو انہوں نے لالٹین اٹھا کر اپنی کوٹھڑی دکھائی، نہ جانے دوسری عورت کو دیکھ کر، یا آرام میں خلل پڑنے سے اس کی آنکھیں اسوقت بہت چمک رہی تھیں۔ جیسے راج رانی بڑے غصہ میں ہے۔ وہ بولے "ذرا اسکے تیور تو دیکھئے۔ بالکل شاہی مزاج پایا ہے۔ کیسا گھور گھور کے دیکھ رہی ہے۔ بس ہر وقت یا تو آرام خاص میں ہوگی یا نئے جال بچھاتی ہوگی۔ بالکل رانی ہے رانی! اُسے سلطنت بڑھانے کی فکر لگی رہتی ہے، اسے اپنے جال بچھانے کی، اور دونوں کا کام ہے۔ اپنا الّو سیدھا کرنا!"

رادھا مسکرا دی۔ اس نے ب پورے ڈبے پر بھرپور نظر کی۔ ایک بسکھٹ پر ایک دری میں لپٹا ہوا بستر۔ ایک رسی پر دو ایک قمیص اور دھوتیاں، ایک کونے میں چار گموں کا چولھا، اس کے پاس ایک اسٹوو، توا، اور دو تین بٹلوہیاں، بسکھٹ کے نیچے ایک گھڑا دن اور ایک پرانا اسٹیل کا بکس۔ یہ تھی شیام موہن جی کی سلطنت!

دم الجھنے لگا، باہر نکل آئی۔ کرسی پر بیٹھ کر کچھ سوچنے لگی۔

کھاٹ پر وہ آکر بیٹھے۔ پھر بولے۔

"کہیئے آپ نے کیا طے کیا؟"

"کا ہے کے بارے میں؟"

"ماتا جی نے مجھ کو خط میں آپکا نام نہیں لکھا تھا، صرف آپ کے پتا جی کا نام لکھا تھا۔ میں یہاں کی تکلیفوں میں سب کچھ بھول گیا تھا"

وہ شرارت سے آنکھیں چمکا کر بولی "تو آپ تو بھول ہی چکے"

"پر اب بھولنا بہت مشکل ہے"

وہ چپ رہی، پھر بولی "میں نے سُنا تھا، آپ گانا بڑا اچھا گاتے ہیں"

"ہاں گاتا تھا، پر اب تو سوائے برہ رگ اور جوگیا کے کوئی دوسری چیز یاد ہی نہیں آتی"

"دیکھئے آپ پھر بھول چلے"

"ارے میں کان پکڑتا ہوں دیوی، اب بھولنے کا لفظ بھولے سے بھی زبان پر نہ لاؤنگا — اچھا کیا گاؤں؟"

"شیام کلیان!"

"بھگوان کلیان ہی کرے!"

وہ گا ہی رہے تھے۔ کہ کہار فنیس اٹھائے ہوئے اور کئی آدمی لاٹھیاں اور لالٹینیں لئے آتے دکھائی دیئے۔ انہوں نے گانا روک کر کہا

"لیجئے ڈولا آگیا"

وہ کچھ سٹ پٹا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور اس نے اسباب درست کرنا شروع کر دیا۔

انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس نے پیٹ کر دیکھا وہ بولے

"تو ماتا جی کو کیا لکھ دوں، منظور ہے؟"

"میں کیا جانوں کہ آپ کیا لکھیں گے۔"

"اجی آپ اپنا فیصلہ بتائیے۔ یہاں کون نہ چاہیگا۔ کہ چاند ہر وقت کالی کوٹھڑی میں اجالا پھیلاتا رہے!"

"تو پھر اسکو آسمان سے توڑ کر اسی کوٹھڑی میں لٹکانا پڑیگا"

"ہاں، مگر وہاں تک ہاتھ پہنچانا ہی تو مشکل ہے!"

"کوشش کیجئے، دنیا میں سب کچھ ممکن ہے"

یہ کہہ کے وہ فنیس میں سوار ہو گئی۔ جب کہاروں نے ڈولا اٹھایا اور مزدوروں نے اسباب تو اسنے ہاتھ کے اشارے سے انکو قریب بلایا، اور انکے کان میں کہا۔

"آپکو راج رانی کو نکالنا پڑیگا۔ مجھے سوکن نہیں پسند!"

وہ ہنس دیئے۔

کہاروں نے "ہوں، ہوں، بیچا کھالا دیکھ کے" کہنا شروع کیا اور تخت رواں آگے بڑھ گیا۔ انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری، دونوں ہاتھ سے سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

معلوم ہوتا تھا۔ کہ دماغ میں تار لگا ہے "کھٹ ڑا، کھٹ ڑا، ٹمک ٹمک، کھٹ ڑا کھٹ ڑا، ٹمک ٹمک "آپکو راج رانی کو نکالنا پڑیگا مجھے سوکن نہیں پسند ہے!" کھٹ ڑا، کھٹ ڑا، ٹمک ٹمک! مجھے سوکن نہیں پسند!"

وہ ہنسنے لگے، بالکل اس طرح جسطرح انار دانہ چھوٹتا ہے! پھر یکبارگی رُک کر انہوں نے چاند کی طرف دیکھا۔ دونوں ہاتھ جوڑ لئے، اور جھوم کے گانا شروع کیا ہے بھگوان! رادھے شیام! رادھے شیام! رادھے شیام!

شفیق الرحمٰن

شکست

جھیل ڈل کے شفاف و ساکن پانی پر ننھے ننھے نکلے ہوئے سورج کی کرنیں تیر رہی تھیں، کہیں کہیں اکا دکا کنول کا پھول نظر آ جاتا تھا۔ آبی چڑیاں ہوا میں زقندیں بھر رہی تھیں، جھیل کے کنارے سفیدے کے درخت بالکل خاموش کھڑے تھے، ان کے پیچھے جھاڑیاں اور سرخ سرخ پہاڑ جس میں سبزے کے پیوند لگے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب کے سب کسی کے منتظر ہیں۔

ہم لوگ صبح کی سیر سے واپس آ رہے تھے۔ میں شکارے سے جھکی ہوئی اپنا ہاتھ لٹکائے پانی سے کھیل رہی تھی۔ فضا میں ایک ناگوار سا جمود تھا، بالکل میرے دل کی طرح ——! ہمیں کشمیر آئے بمشکل ایک مہینہ گزرا ہوگا، مگر میں اس سکون سے تنگ آ گئی تھی، ہر روز وہی باسی پروگرام —— صبح سیر، شام کو پھر سیر، دوپہر بوٹ ہاؤس میں گزارو: رات کو سو جاؤ، کیا ہوا جو پانچویں چھٹے دن کار پر پہلگام یا گلمرگ چکر لگا آئے۔ ہمارے ساتھ کے ہاؤس بوٹ میں والد صاحب کے کسی دوست کا کنبہ آیا ہوا تھا۔ جس میں سے کوئی حامد صاحب میرے منگیتر بننے کے امیدوار تھے اور غالباً اسی امید پر آئے تھے کہ شاید انہیں کامیابی ہو جائے۔ بیچارے کچھ اتنے برے بھی نہیں تھے، مگر نہ معلوم کیوں مجھے وہ ایک آنکھ بھی نہیں بھاتے تھے۔

میں نے ساکن درختوں کو دیکھا —— صرف ملاحوں کے چپوؤں کی آواز تھی جو اس خاموشی کو توڑ رہی تھی، ورنہ ہر چیز میں سکون تھا مجھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میرے دل کے ساتھ زمین کی گردش بھی ساکن ہو گئی ہو۔

مجھے کسی ایسی چیز —— کسی ایسی ہستی کا انتظار تھا جو اس جمود کو توڑ کر زندگی میں ہل چل سی پیدا کر دے، جس کے وجود سے اس ٹھہرے ہوئے دل میں نئی نئی امنگیں پیدا ہوں۔ اتنے دنوں سے میں اسی نامعلوم ہستی کی منتظر تھی۔

"اُفوہ! ساڑھے نو بج گئے ہیں، جلدی کرو" ابا بولے

—— ملاحوں نے شکارے کی رفتار اور تیز کر دی۔

"ارے! یہ کون؟" ابا پانی میں کھڑے ہوئے ہاؤس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

"کہاں؟" امی چونک پڑیں۔

"وہ رہا ہاؤس کی چھت پر! کہیں اشفاق تو نہیں؟

"اشفاق؟ ہاں لگتا تو کچھ کچھ ویسا ہی ہے مگر اشفاق یہاں کہاں؟"

"ہاں شاید کوئی اور ہو، مگر مجھے تو یہ اشفاق ہی لگتا ہے۔" ابا بولے۔

میں نے ذرا غور سے دیکھا۔ ایک لمبا سا لڑکا ہاؤس کی چھت پر کھڑا ہاتھ تان کر نہایت خوبصورتی سے چھلانگ لگا رہا تھا دوسرے ہاؤس پر کچھ ٹامی نہا رہے تھے، میں بے چین سی ہو گئی، اشفاق؟ —— اتنے دنوں کے بعد ملے گا؟ —— خدا کرے یہ اشفاق ہی ہو، مگر مجھے تو بھول گیا ہوگا۔

"ان ہی میں سے ہوگا کوئی۔" امی دوسرے ہاؤس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔

—— وہ پانی سے نکل کر ہاؤس پر آ گیا۔

"تو آپ کا مطلب ہے یہ ٹامی ہے؟ لاحول ولاقوۃ! بیچارہ بھلا چنگا اشفاق تو ہے —— اے ٹھہرو! ——"

—— شکارہ آہستہ ہوا۔ پھر ٹھہر گیا۔

"اسے بلاؤں؟"

"اور جو یہ کوئی اور ہوا تو؟" امی بولیں

"لانا بھئی ذرا دینا دوربین ——!" میں نے دوربین دیدی۔

"ہو بہو بالکل وہی ہے —— اے اشفاق! ابا نے آواز دی۔

اُدھر کیا تو وُہ چھلانگ لگانے کی تیاری کر رہا تھا اور کیا ایک دم رُک گیا۔

"بھیّا اشفاق!" نعیم چلّایا

— وُہ نہایت تیزی سے تیرتا ہوُا ہماری طرف آرہا تھا۔

یہ اشفاق ہمارا کیا لگتا ہے؟ میں سوچنے لگی — کچھ بھی نہیں۔ اس کے اَور ہمارے کنبوں میں کافی ربط ضبط ہے۔ اور بس ابّا اور امّی سے تو یہ ملتا رہا ہوگا۔ مگر دو سال سے لاہور میں رہتے ہوئے بھی مجھے اس سے ملنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوُا۔

— وُہ بالکل نزدیک آگیا۔

"ارے تم یہاں کہاں؟" ابّا مسرت سے مغلوب ہو کر بولے۔

اُس نے تیرتے ہوئے ہاتھ بلند کرکے سلام کیا۔

"جی بس! یونہی تیرتے آگیا تھا!"

کشمیر کب آئے؟ — کوئی ساتھ بھی ہے؟"

"ابھی کالج میں چھٹیاں ہوئی تھیں، بس اکیلا ہی چلا آیا۔"

"تو دوڑ کر کپڑے لے آؤ، آؤ ہمارے ساتھ،" امّی بولیں

"جی! اس حلیے میں — اگر آپ اجازت دیں تو ذرا ٹھہر کر آجاؤں گا؟"

- میں ابھی وہاں پہنچ کر چھوٹی کشتی لئے آتا ہوں۔ اس میں واپس چلے چلیں گے؟" نعیم بولا۔

— بات طے ہوگئی۔ اُدھر وُہ تیرتا ہوا واپس بانڈ پر چلا گیا۔ اِدھر ہمارا شکارہ چل پڑا۔ ذرا سی دیر میں وہ ہمارے ہوٹ ہاؤس میں پہنچ گیا۔ اب جو امّی اَور ابّا نے سوالوں کی بوچھاڑ کی ہے تو بے چارہ ایک مرتبہ تو گھبرا ہی گیا۔ غالباً بہت دنوں سے انہیں بھی یہاں کوئی آشنا چہرہ نظر نہ آیا تھا — اُس روز اُسے شام تک وہیں بٹھائے رکھا۔

میرا جی چاہتا تھا کہ یہ مجھ سے بھی باتیں کرے۔ چنانچہ میں کئی مرتبہ چھوٹے سے ڈرائینگ روم میں سے گذری۔ میں چاہتی تھی کہ پہلے وہی گفتگو شروع کرے۔

"یہ کون ہیں؟" — اُس نے پوچھا

"ارے نجمہ تو ہے! جانتے نہیں؟"

"خوب! تو یہ نجمہ ہیں، تو یہاں آکر چپ چاپ بیٹھ کیوں نہیں جاتیں۔"

امّی نے مجھے بُلا لیا۔ میں کھسیانی سی ہوگئی۔ اس نے فقط ایک مرتبہ سرسری طور پر مجھے دیکھا۔ اور چپ ہوگیا، حالانکہ میرا دل چاہتا تھا کہ یہ مجھے امتحان میں کامیاب ہونے کی مبارکباد دے۔

امّی نے خود ہی ذکر کیا "یہ نجمہ امتحان میں پاس ہوگئی ہے سیکنڈ ڈویژن آئی، اور اپنے کالج میں پانچواں نمبر آیا ہے۔"

"اچھا، مگر مَیں نے سنا ہے کہ اس سال یونیورسٹی نے تقریباً ساری لڑکیوں کو پاس کر دیا ہے۔ اور پھر سیکنڈ ڈویژن — کوئی خاص کارنامہ تو ہے نہیں، بس محض پاس ہونے کے برابر ہے۔"

مَیں جل ہی تو گئی —!

شام کو وہ واپس چلا گیا، کسی دوست کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا، ابّا نے بہتیری کوشش کی کہ اسے یہاں ہی ٹھہرا لیں، مگر وہ نہ مانا۔ البتہ یہ مان گیا کہ دن میں کم از کم دو مرتبہ یہاں حاضری دیا کرے گا۔ اس طرح اس کا ہمارے ہاں آنا جانا شروع ہوگیا۔ وُہ مجھ سے بہت کم باتیں کرتا تھا، اور باتیں بھی بالکل اُکھڑی اُکھڑی سی، ابّا اور امّی کو اپنی باتوں سے اتنا ہنساتا، کہ وُہ بے حال ہوجاتے، بچوں میں رل کر بالکل بچّہ بن جاتا۔ مگر اِن سب باتوں کے باوجود کیا مجال جو اُس کا غرور ایک لمحے کیلئے بھی کم ہوُا ہو!

چند روز بعد کا ذکر ہے، رات کے کوئی نو بجے ہونگے۔ بڑے زور کا مینہ برس رہا تھا، میں کرسی بچھائے بچوں کے بستروں کے درمیان بیٹھی انہیں پریوں کی کہانیاں سنا رہی تھی، نیند تو مجھے بھی آئی ہوئی تھی مگر میرا خیال تھا کہ اگر بچے میرے سامنے ہی نہ سو گئے تو کسی کو بھی سونے نہیں دیں گے۔ بجلی بڑے زور سے کڑکی اور سب کے سب رضائیوں میں دبک گئے۔ اشفاق ابھی واپس نہیں گیا تھا، دوسرے کمرے میں امی سے باتیں کر رہا تھا

میں ایک شہزادے اور پری کی پہلی ملاقات کا حال بچوں کو سنا رہی تھی کہ یکایک وہ کمرے میں داخل ہوا :۔

" اخاہ ! داستانِ امیر حمزہ ہو رہی ہے۔ ہم بھی تو سنیں"۔

ـــــ میں چپ ہو گئی۔

" آپ رک کیوں گئیں ؛ اچھا لو بھئی بچو : ایک کہانی میں سناتا ہوں "

میں بدستور خاموش تھی۔

" اچھا تو سناؤں کہانی ؟"

" ہاں ہاں سنایئے" ! بچے یک زبان ہو کر بولے !

" ایک تھا لڑکا، وہ پڑھتا تھا ڈاکٹری ـــــ اس کو جب چھٹیاں ہوئیں تو وہ گھر آیا۔ اور اپنے ساتھ مُردے کی ہڈیاں بھی لایا"

" مُردے کی ہڈیاں ـــــ قبر میں سے نکال کر لایا ہوگا !"

ننھا فہیم ڈر کر بولا۔

" نہیں بھئی اس نے خریدی تھیں"۔

" جز رائیل سے خریدی ہونگی"ـــ عفت نے رضائی سے منہ نکال کر کہا۔

" نہ نہ بھئی یہ بات ٹھیک نہیں، تم بولو مت ! ورنہ ہم کہانی نہیں سنائیں گے ـــ ہاں تو ان ہڈیوں میں ایک سفید سی کھوپڑی سی تھی۔ ایک اندھیری رات کو ـــ جب کہ بڑے زوروں سے بارش ہو رہی تھی اور چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ بالکل جیسے آج کی رات ہے ـــ ایسی رات تھی کہ گھر میں ایک عجیب سی آہٹ سنائی دی، کسی نے چپکے سے ٹارچ روشن کی اور دیکھا ـــ کہ وہی کھوپڑی فرش پر چل رہی تھی ـــ"

" چل رہی تھی ـــ سچ مچ !" ننھے نے رضائی میں منہ دبکا لیا۔

" جی ہاں ! چل رہی تھی ـــ خوب چل رہی تھی، کبھی ادھر جاتی تھی کبھی اُدھر، ایک نے دوسرے کو جگایا، دوسرے نے تیسرے کو، بس گھڑی بھر میں گھر کا گھر جاگ اٹھا، کوئی بندوق تلاش کر رہا ہے، کوئی آیت الکرسی پڑھ رہا ہے۔ کوئی کہہ رہا ہے پولیس میں اطلاع دے دو۔ مگر ڈر کے مارے سب کے سب کانپ رہے تھے ـــ ذرا خود ہی سوچو! اگر یہاں کوئی کھوپڑی چلتی ہوئی آجائے تو تم نہ ڈرو گے ؟"

" ہاں ہاں ڈریں گے" سب بچے چیخ کر بولے ۔" پھر کیا ہوا ـــ ؟"

" اتنے میں وہ لڑکا بھی جاگ اٹھا ـــ اور کنبے کی اس گھبراہٹ پر خوب ہنسا۔ اس نے نہایت اطمینان سے اپنا جوتہ اٹھایا اور اس کھوپڑی پر دے مارا ـــ !"

" جوتا مارا ـــ ؟" عفت سہم کر بولی۔

" ہاں فلیکس کا خوبصورت سا جوتا جو اس نے اسی سال نمائش سے خریدا تھا۔ جوتا تک کر مارا ہے تو ـــ !"

" تو کیا ہوا ـــ ؟" نعیمہ چیخ کر بولی۔

" جوتا لگتے ہی کھوپڑی الٹی اور اس میں سے ایک چوہا نکل کر بھاگ گیا۔"

سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ صرف نہیم ہی تھا جو بناوٹی ہنسی ہنسنے لگا۔ ورنہ سب سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔

" مگر چوہا کس طرح اندر آگیا" ؟ فہیم بولا

" دراصل وہ کھوپڑی اوندھی رکھی تھی، اتفاق سے اوپر سے ایک چوہا گرا اور کھوپڑی کے سوراخ میں چلا گیا۔ کھوپڑی سیدھی ہوگئی ـــ گھبرا کر چوہے نے اِدھر اُدھر دوڑنا شروع کیا اور اس کے ساتھ ہی کھوپڑی بھی چلنے لگی"۔

ـــــ کیا تو پریوں کے لطیف قصے ہو رہے تھے اور کیا یہ خطرناک سا واقعہ سنا۔ کمرے میں ایک عجیب ڈراؤنی سی خاموشی طاری ہوگئی۔

" اچھا، اب ایک اور چھوٹی سی کہانی سناتا ہوں۔ جس جگہ لڑکے ڈاکٹری پڑھتے ہیں۔ وہاں کئی کمرے ہوتے ہیں جہاں مُردے ہی مُردے پڑے ہوتے ہیں، انہیں وہ لڑکے خوب چیرتے پھاڑتے ہیں ـ"

" چیرتے ہیں ـــ ! اوئی " نعیمہ کی رضائی سے آواز آئی۔

"ہاں انہیں چیرتے ہیں اور بوٹی بوٹی کر ڈالتے ہیں ——— ایک دن ایک لڑکا علیحدہ ایک کمرے میں مُردہ چیر رہا تھا ——— کہ یکایک مُردے نے جو تھپڑ دیا ہے لڑکے کے منہ پر —— بس مزا ہی آگیا۔ لڑکے کا سر دیوار سے لگا جا کر ——!"

"آپا ذرا میرے پاس آ جاؤ!" ننھی ڈر کر بولی۔ میں اس کے پاس جا بیٹھی۔

"تو کیا سچ مچ تھپڑ مار دیا مردے نے؟" —— نعیم نے دبی آواز سے پوچھا۔

"ہاں سچ مچ! وہ زناٹے دار تھپڑ دیا کہ لڑکے کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ بات دراصل یوں تھی کہ مُردے کے دونوں ہاتھ اکڑے ہوئے تھے اور انہیں زور لگا کر سیدھا کیا گیا تھا اور نیچے ایک تختہ رکھ کر ہاتھوں کو میخوں کے ذریعے تختے میں گاڑ دیا تھا۔ وہ لڑکا مُردے کی بغل میں کچھ چیرا پھاڑی کر رہا تھا، جب وہ آگے جھکتا تھا تو تختہ ذرا سا ہل جاتا تھا اور اس طرح ایک طرف کی میخ ڈھیلی ہوتی جا رہی تھی ——— اس بیوقوف کو پتہ نہیں تھا۔ آخر ایک مرتبہ جو وہ نشتر لے کر بغل پر جھکا ——— تختہ پھر ہلا اور میخ تختے سے نکل گئی۔ مُردے کا ہاتھ بڑے زور سے گھوما اور پڑا لڑکے کے منہ پر ——!"

"تو کیا وہ لڑکا مر گیا —— ؟" نعیمہ نے چپکے سے پوچھا۔

"نہیں، اس میں مرنے کی بات ہی کیا تھی، البتہ اس کا مذاق خوب اُڑا۔ لڑکے اُسے چھیڑا کرتے کہ بھئی یہ وُہی صاحب ہیں جو مُردے سے پٹ گئے تھے۔"

"اِشفاق بھیّا!" نعیم کی آواز آئی "آئیے بارش بند ہو گئی ہے"۔ وُہ بچوں کو پیار کر کے چلا گیا۔

اب میرے لئے آفت آ گئی، سب کے سب بچے سہمے ہوئے میرے گرد بیٹھے ہیں اور کوئی کھوپری کے متعلق پوچھ رہا ہے اور کوئی مُردے کے تھپڑ کے متعلق؛ ساتھ ہی ڈر بھی رہے ہیں، کانپ بھی رہے ہیں، اِدھر میں بہتیرا سمجھاتی ہوں کہ یہ جھوٹ بول رہے تھے ——— مگر کیا مجال جو انہیں ذرا بھی یقین آتا ہو۔ ننھی تو میری گود سے اُترتی ہی نہ تھی ——— نتیجہ یہ نکلا کہ رات کے بارہ بجے تک مجھے جاگنا پڑا جب جا کر کہیں بچے سوئے اور تب بھی رات بھر چونک چونک پڑتے تھے۔ مجھے بھی خواب میں عجیب فضولیات سی دکھائی دیں، کہیں کھوپریاں رینگ رہی ہیں اور کہیں مُردوں سے لڑائی ہو رہی ہے!

اگلے روز شاہی چشمے کا پروگرام تھا، صبح بارش کی وجہ سے نہ جا سکے۔ کوئی چار بجے موسم ایسا ہو گیا کہ ہم کہیں جا سکتے تھے۔ ہمارے پڑوس کا کنبہ بھی ساتھ ہی آ گیا۔ اتنے آدمیوں کے لئے کار ناکافی تھی۔ چنانچہ طے ہوا کہ آدھے ایک دفعہ جائیں اور آدھے دوسری دفعہ۔ بزرگ پارٹی نے بعد میں جانا پسند کیا۔ ہم لوگ کار میں لد گئے نعیم سٹیرنگ کرنے بیٹھ گیا، حامد اس کے ساتھ۔ میں پیچھے بیٹھ گئی تھی۔ اشفاق اِدھر اُدھر پھر رہا تھا ——— شاید کار بھر گئی تھی اس لئے میں نے جلدی سے ننھی کو اُٹھا کر گود میں بٹھا لیا اور اس کے لئے اپنے برابر میں جگہ کر دی۔ اس نے دروازہ کھولا اور دیکھ کر کچھ مسکرایا۔ میں اور بھی سکڑ کر ایک طرف ہو گئی۔ اس نے کھٹ سے دروازہ بند کر دیا اور ہنستے ہوئے بولا "بھئی نعیم چلو تم، یہاں پہلے ہی بھیڑ ہے، میں پھر آ جاؤں گا۔"

میں نے دھم سے ننھی کو اپنے برابر پٹخا۔ نہیں جاتا ہے، تو نہ جائے ——— بدتمیز کہیں کا، جیسے میں چاہتی ہی تو تھی کہ یہ میرے برابر بیٹھ جائے ——— مجھے اس کی پروا ہی کیا ہے ——— اگر بیٹھ بھی جاتا تو کیا شان میں فرق آ جاتا ——— ؟

شاہی چشمے پر خوب سیر کی، ساتھ ہی ایک بڑا سا باغ تھا دو تین چھوٹے چھوٹے گاؤں بھی تھے، سامنے پہاڑ پر پری محل نظر آ رہا تھا ——— کوئی کہتا تھا، یہاں پریاں اُترتی ہیں۔ کوئی کہتا تھا کہ یہاں حضرت سلیمان کا تخت اُترا تھا۔ مگر جو کچھ بھی تھا عجیب ٹوٹا پھوٹا سا تھا۔ کسی نے تجویز پیش کی کہ چلو وہاں چلیں اچھی خاصی چڑھائی تھی اور ویسے شام کا جھٹپٹا سا وقت تھا ——— حامد صاحب نے تو فوراً ہی استعفےٰ پیش کر دیا اور ایک بڑے سے پتھر پر سستانے بیٹھ گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ چڑھائی

کا نام سنتے ہی یکلخت تھک گئے ہیں۔ میں نے محض اسی ضد میں آکر پڑھنے کی ٹھان لی۔ امی نے بہتیرا منع کیا کہ تھک جاؤ گی، مگر وہاں کون سنتا تھا۔ ابا نے کہا کہ جو بھی پہلے وہاں پہنچے گا، اسے وہ ایک ڈبّہ ٹافی کا دیں گے جسے وُہ اپنے ساتھ ہی لائے تھے۔ باقاعدہ مقابلہ شروع ہُوا۔ ذرا سی دُور ہی چڑھ کر تین چار تو بیٹھ گئے نعیم وغیرہ بھی رہ گئے، اب میں اَور اشفاق رہ گئے تھے، وُہ بڑے اطمینان سے سیٹی بجاتا ہُوا چڑھ رہا تھا، ادھر میرا بُری طرح سے سانس چڑھا ہُوا تھا اَور ہانپ رہی تھی۔ بھلا میرا اس کا مقابلہ ہی کیا تھا وہ جان بوجھ کر تیز چل رہا تھا۔ کئی دفعہ میرے جی میں آیا کہ اسے آہستہ چلنے کے لئے کہوں مگر اس میں صاف میری ہار تھی، میری ٹانگیں جواب دے رہی تھیں، پیچھے مڑ کر جو دیکھتی ہوں تو راستے کے ہیر پھیر میں وہ لوگ سب اوجھل ہو چکے تھے، پری محل ابھی خاصی دور تھا ـــــ قریب ہی تھا کہ میں گر پڑوں، اس نے اپنا بازو سہارے کے لئے میری طرف بڑھایا۔ میں نے پہلے تو انکار کر دیا۔ مگر اَور کوئی صورت ہی نہیں تھی مجبوراً اس کا بازو تھام لیا۔ اس نے ایک شوخ جنگ کی۔ میں پہنچی ہوئی تھی میرے ہاتھ میں آگ سی لگ ہوئی تھی۔ اس کے مضبوط بازو کا سہارا لئے ہوئے میں اپنے آپ کو کس قدر محفوظ محسوس کر رہی تھی ـــ مجھے چڑھائی کا پتہ ہی نہیں چلا ـــ مجھ پر ایک غنودگی سی طاری ہو گئی۔ اب اچھی طرح یاد نہیں شاید میرا سر اس کے کندھے سے چھو گیا ہو ـــ میرا جی چاہتا تھا کہ راستہ ختم ہی نہ ہو ـــ بہت جلد ہم پری محل پہنچ گئے ـــ اور سبزے پر ستانے بیٹھ گئے۔ تیسری یا چوتھی کا چاند سامنے چمک رہا تھا، فضا میں خنکی تھی ـــ ہمارے قدموں میں جھیل کا شفاف پانی جھلمل جھلمل کر رہا تھا، ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے میرے بالوں کی لٹیں لہرا رہی تھیں۔ میرا جی چاہتا تھا وہ مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کرے ـــ

" اب چلیں!" وُہ بولا

" ٹھہرئیے ابھی سانس تو ٹھیک ہو جائے۔"

" اچھا تو ذرا جلدی سے سانس ٹھیک کر لیجئے، ورنہ بھیگ جائیں گے، سامنے بارش کے آثار ہیں۔" وُہ اپنے جُوتے کے تسمے کسنے لگا۔ کس قدر بدمذاقی جتا رہا تھا وُہ ـــ

میں تمہید باندھنے لگی ـــ

" یہ پہاڑ کتنے شاندار معلوم ہو رہے ہیں، اور ان کی چوٹیاں ـــ آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔"

" کیسے بیہودہ ٹنڈ منڈ سے پہاڑ ہیں، کوئی ایسے اونچے بھی نہیں ہیں ـــ نہ کوئی درخت نہ پھول، محض گھاس ہی گھاس ہے، وہ بھی کہیں کہیں۔"

" اَور یہ جھیل! اِس پر پھیکی پھیکی چاندنی کیسی کھلی ہوئی ہے ـــ!"

" ابھی چاند تو پرسوں ہی نکلا ہوگا اور آج چاندنی بھی کھل گئی ـــ باقی رہی یہ جھیل، اوپر سے تو خیر جیسی ہے سو ہے ہی مگر اس کے اندر اس قدر جھاڑ پھونس اُگا ہوا ہے کہ خدا کی پناہ انسان غوطہ تو مار سکتا ہی نہیں ـــ ایک روز میرا تو پاؤں ہی الجھ چلا تھا ـــ" میں کھسیانی سی ہو گئی۔

" اور وُہ پیارے پیارے سفیدے کے درخت ـــ کس انداز سے کھڑے ہیں، جیسے ـــ!"

" ہاں جیسے کیا؟ ـــ جیسے کالے کالے بھُوت کھڑے ہوں، لاحول ولا قوۃ۔ اور پھر سفیدے کا درخت بھی کوئی درخت ہے، سَرو کے درخت تو پھر بھی کچھ ہوئے، مجھے تو آم کا درخت کہیں اچھا لگتا ہے اور کچھ نہیں کم از کم آم تو لگتے ہی ہیں اور جامن کا درخت بھی اچھا خاصا ہوتا ہے۔"

میں جھنجھلا اٹھی ـــ گھر بھر میں کسی کی کیا مجال جو میری ہاں میں ہاں نہ ملائے اور یہ تھا کہ ہر بات کاٹ رہا تھا۔

" اچھا چلئے اسی وقت۔" میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس نے ہاتھ پکڑ کر مجھے بٹھا دیا اور شرارت آمیز مسکراہٹ سے بولا:- "اوہو! ناراض ہو گئیں آپ تو سچ مچ ـــ اچھا بھئی! یہ پہاڑ کس قدر وحشت ناک، ہیبت ناک اور خوفناک ہیں، ان کی چوٹیاں کس قدر عظیم الشان ہیں اور قریب قریب

آسمان کو چھو رہی ہیں - اور وہ چاند تو بالکل چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا ہے - جیسے کسی کا چہرہ ہو - جھیل کا پانی ایسے چمک رہا ہے جیسے کسی الف لیلہ کی شہزادی کا آئینہ ---- اور وہ سفیدے کے رومان انگیز درخت ---- کیسے چپ چاپ کھڑے ہیں - یہ چاندنی ---- یہ جھیل ---- یہ فضا ---- آہاہاہا ---- نہ ہوا یہاں عمر خیام ورنہ ضرور کوئی نہ کوئی فساد ہو جاتا۔"

اس نے سگریٹ سلگائی ---- ایک لمبا سا کش لیا اور سارا دھواں میرے چہرے پر چھوڑ دیا --- میں نے ذرا منہ بنایا - وہ مسکرانے لگا --- میں بھی مسکرا دی - ہم آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگے - اس نے پھر مجھے اپنا بازو سہارے کے لئے پیش کیا۔ اترتے وقت کوئی تکان محسوس نہیں ہو رہی تھی ---- پھر بھی میں نے سہارا لے لیا۔

اتوار کی صبح کو ہم نشاط باغ جا رہے تھے - امی کا ارادہ تھا کہ ہم حلمی وغیرہ کو بھی ساتھ لے چلیں، مگر میں نے صاف کہدیا کہ اگر وہ لوگ گئے تو میں نہیں جاؤں گی -

" آخر کیوں ؟" امی حیران ہو کر بولیں۔

مجھے وہ لوگ زہر لگتے ہیں - یونہی خوشامدی سے ہیں۔"

ایک مختصر سی بحث کے بعد یہی طے ہوا کہ انہیں نہ بلایا جائے، مگر امی اس روز متعجب ضرور تھیں۔

تمام بچے شکارے میں روانہ کر دیئے گئے - بزرگ پارٹی ایک دوسرے شکارے میں پہلے ہی جا چکی تھی - میں نعیم اور اشفاق تینوں چھوٹی کشتی میں چلے، اشفاق حسب معمول کشتی چلا رہا تھا۔

" بھئی جب جانیں اُن شکاروں کو پکڑ لو" نعیم بولا - شکارے کافی دور تھے۔

" فرض کیا پکڑ بھی لیں، پھر ---!"

" ویسے ہی اکٹھے چلیں گے ذرا ---!"

" اور اگر اکٹھے بھی چلے --- پھر ---!"

---- مجھے ہنسی آ گئی

نعیم جھینپ گیا، بولا --- "ہوں، کہہ ہی کیوں نہیں دیتے کہ انہیں پکڑنا مشکل ہے ---!"

" اچھا ---- تو یہ لو ---" اس نے پُل اوور اور کوٹ اتار دیئے ---- ذرا دور جا کر جرسی بھی اتار دی، وہ نہایت تیزی سے کشتی چلا رہا تھا۔ سفید بنیان میں اس کا ترشا ہوا خوبصورت جسم کتنا اچھا لگ رہا تھا ---- بالکل جیسے یونان کے دیوتاؤں کے مجسمے ہوتے ہیں ---- چوڑا سینہ ---- گول شانے ---- ابھری ہوئی مچھلیاں ---- میں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہی تھی۔

" آپ میرے بازوؤں کو اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں ؟ --- دیکھئے کہیں نظر نہ لگا دیجئے ---- نعیم : میرا کوٹ تو دو ذرا۔"

نعیم ہنس پڑا ---- میں نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

" اُفوہ ! میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ آپ دیکھنا بالکل ہی بند کر دیں، آپ شوق سے دیکھئے - مگر بس ذرا یہ خیال رہے کہ کہیں نظر نہ لگ جائے - چلیئے میں کوٹ بھی نہیں پہنتا ۔"

میں نے اپنا منہ بدستور موڑے رکھا - ہماری کشتی بڑی تیزی سے جا رہی تھی - کتنا مغرور ہے یہ ؟ ---- میں بڑی دیر تک یہی سوچتی رہی ---- کہیں نظر نہ لگا دینا ---- اونہہ ! مجھے پرواہی کیا ہے اس کی - مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ کسی کے بازوؤں کی طرف دیکھوں۔

ذرا سی دیر میں ہم شکاروں سے جا ملے - مجھے اس پر غصہ ضرور آ رہا تھا - مگر کبھی کبھی اسے کن انکھیوں سے دیکھ بھی لیتی تھی۔

نشاط پہنچ کر عجب دھما چوکڑی مچی - نوکروں نے ایک طرف مختصر سا کچن بنا لیا ---- ساری پارٹی مختلف ٹولیوں میں منقسم ہو گئی - کہیں برج ہو رہا تھا، کہیں گراموفون بج رہے تھے - بچے پھلوں پر ٹوٹے پڑتے تھے - میں ایک فوارے کے پاس اکیلی بیٹھی تھی - اشفاق اور امی دوسرے پلاٹ سے باتیں کرتے ہوئے آ رہے تھے۔

" ارے یہ اکیلی بیٹھی ہیں ---" وہ بولا ---- وہ بھی ہنس کر ساتھ ہی آ بیٹھے۔

" کیا سوچ رہی ہو تم ! امی نے پوچھا۔

"یہاں چاندنی رات میں کیسا لگتا ہوگا، مخمل جیسا سبزہ — پھولوں کے تختے — یہ فوارے — !"

"خاک لگتا ہوگا! دو دو گز کے سانپ پھرتے ہیں یہاں چاندنی رات میں۔" وہ بولا۔

"وہ دیکھئے امی جان، ڈل کی چمکیلی سطح پہ پھیکی سی دھند پھیلی ہوئی ہے۔ اور ہلکے ہلکے بادل اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں — کتنی اچھی فضا ہے۔"

"بس سمجھ لیجئے: اسی فضا میں تو بے تحاشہ مچھر پیدا ہوتے ہیں۔" اس نے امی جان سے کہا۔

"اور امی جان وہ نوکدار چٹان کیسی اُبھری ہوئی ہے جیسے کسی پرندے کی چونچ ہو۔ اس جگہ سے کیسا اچھا نظارہ دکھائی دیتا ہوگا۔"

"اور اگر خدانخواستہ اسی خوبصورت چٹان سے پاؤں پھسل جائے تو پتہ بھی نہ چلے کہ کوئی بدقسمت سیّاح یہاں آیا بھی تھا یا نہیں۔" وہ بدستور امی سے مخاطب تھا۔

میں جھنجلا اٹھی۔

"وہ سامنے کنول کے پھولوں کا تختہ کتنا پیارا ہے۔ کیوں امی؟ گہرے سبز پتوں میں پھول کتنے دلفریب لگ رہے ہیں۔"

"شاید آپ کے لئے یہ باعثِ دلچسپی ہو کہ وہاں محض دلدل ہی دلدل ہے جس میں نہایت پیارے پیارے مگر مچھ پھر رہے ہونگے۔"

— امی ہنس پڑیں اور بولیں "بھئی اگر تمہیں لڑنا ہی ہے تو مجھے کیوں درمیان میں رکھتے ہو۔ آمنے سامنے ہوکر اطمینان سے لڑو۔" یہ کہکر وہ چلدیں۔

اشفاق کچھ دیر بالکل سنجیدہ بنا رہا، پھر سگریٹ سلگائی۔ اور ایک لمبا سا کش لگاکر سارا دھوُاں میرے ماتھے پر چھوڑ دیا

میں نے بُرا بُرا منہ بنایا۔

"بُرا مان گئیں آپ؟ — یہ لیجئے!" اس نے جیب سے ایک بڑا سا چاکلیٹ نکالا اور اس کا کاغذ علیحدہ کرنے لگا

"شکریہ! میرا دل نہیں چاہ رہا۔"

"مگر میرا تو چاہ رہا ہے۔" کیا آپ چاہتی ہیں کہ میں بھی چاکلیٹ نہ کھاؤں؟"

اس کی بناوٹی ہنسی دیکھکر مجھے ہنسی آگئی۔

آخر میں نے آپ کو منا ہی لیا، چلیئے ریکارڈ بجائیں!

ہم دونوں چل پڑے، اس نے سہگل کا ریکارڈ "میں کیا جانوں کیا جادو ہے — اِن دو متوالے نینوں میں!" بجانا شروع کیا۔ میں نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا وہ ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھ رہا تھا، شاید چاہتا تھا کہ میں بھی اس کی طرف دیکھوں، مگر اب میری باری تھی، میں نے منہ پھیر لیا۔

ریکارڈ بج رہا تھا — "جب نین ملے — نینوں نے کہا —"

میں نے جان بوجھ کر نعیم کو آواز دی — "بھئی ذرا وہ سینڈوچز کی ٹوکری یہاں دے جانا، اور وہ تھرموس بھی۔" اُس نے ساؤنڈ بکس اٹھایا اور ریکارڈ شروع سے لگا دیا — !

پھر وُہی الفاظ آئے — "نینوں نے کہا — اب نین بسیں گے نینوں میں۔"

مَیں جلدی سے بولی۔ "دیکھو ننھی اگر تم نے یہ چھلانگیں بند نہ کیں تو تم پٹ جاؤگی۔"

— مَیں نے دونوں مرتبہ ریکارڈ کی آواز سُنی اَن سُنی کر دی۔

اُس نے پھر ساونڈ بکس اٹھاکر شروع ہی میں رکھدیا۔

"نینوں نے کہا — جب نین ملے — !"

مَیں اُٹھ کھڑی ہوئی اور دوڑکر ننھی کو گود میں اٹھالیا۔ میں چاہتی تھی وہ یہ کہے — "آپ یہ ریکارڈ سنتی کیوں نہیں؟"

— مگر اس نے بڑے اطمینان سے گراموفون بند کر دیا۔ اور جیبوں میں ہاتھ ڈال کر سیٹی بجاتا ہوا درختوں کے جھنڈ

کی طرف چلا گیا۔

"میں اسے واپس بلانے ہی لگی تھی، مگر آخر مجھ میں بھی تو خود داری کا مادہ ہے، اسے ہی کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں، آخر اس نے یہ ریکارڈ بجایا ہی کیوں تھا، عجیب معمہ ہے۔ اگر اسے مجھ سے نفرت ہے تو اس قسم کی چھیڑ کی بھلا کیا ضرورت ہے، اور اگر اسے میرا کچھ خیال ہوتا تو یہ بے رُخی!

اس کے بعد شام تک وہ ابا کے ساتھ برج کھیلتا رہا۔ مگر مجھے انتظار ہی رہا کہ وہ کب آتا ہے۔

اگلے روز صبح صبح وہ اور نعیم کشتی لئے سیر کو جا رہے تھے۔ اس نے حامد کو بھی بلا لیا، میں کھڑکی کے پاس بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی، یہ بالکل نیچے تھے ــــ آسمان پر گھٹا تھی۔

"آیئے! آیئے!!" اس نے حامد کا استقبال کیا۔

ــــ حامد دھم سے عجیب بدتمیزی سے کشتی میں بیٹھ گیا اور آسمان کی طرف دیکھ کر بولا :۔

"مطلع کچھ کچھ ابر آلود ہے، یہ اندیشہ میرے دل میں ترقی پاتا جاتا ہے کہ تعجب نہیں جو ان سُرمئی بادلوں سے پانی کے قطرے موتیوں کی طرح بکھر جائیں۔"

"تو پھر کیا ہوا ــــ یہ تو اچھی بات ہے۔" اشفاق بولا۔

"مگر بادِ مخالف بھی جوبن پر ہے اور اغلب ہے کہ ہمارا سفینہ اس جھیل بیکراں یا بالفاظِ دیگر آبِ بے پایاں میں الٹ نہ جائے اور ہم!"

"اور ہم ڈوب نہ جائیں۔ لاحول ولا قوۃ! ارے بھئی تمہیں تو میں بچا لوں گا۔" اشفاق ہنس کر بولا

"اس جھیل کی سرد فضا، اور خنک کہر آمیز بخارات کا اثر جسمِ انسانی پر نمونیہ کی صورت میں تو نہیں ظاہر ہوا کرتا؟" حامد ڈرتے ڈرتے بولا

"جسے نمونیا ہونا ہوتا ہے، اسے کمرے میں انگیٹھی کے پاس بھی ہو جاتا ہے۔" نعیم بولا۔

"تو میرا کوٹ لے لو!" اشفاق نے کوٹ اُتار دیا۔

"کیا آپ وثوق سے فرما سکتے ہیں کہ بندہ کے جسمِ ناتواں کے لئے ایک کوٹ ہی اکتفا کر سکے گا۔"

"تو یہ پُل اوور اور مفلر بھی لے لیجئے!"

"اور آپ؟" حامد حیرت سے بولا

"میرے پاس کافی مسالہ ہے۔" اُس نے اپنے پٹھے اکڑاتے ہوئے کہا۔ "آپ بے فکر رہیں۔"

اُس احمق نے جلدی سے سب کچھ پہن لیا اور دبک کر بیٹھ گیا۔

اشفاق نے صرف ایک آسمانی رنگ کی جرسی پہنی ہوئی تھی۔ جس میں سے اس کے سفید سفید مضبوط بازو چمک رہے تھے حامد بالکل مُرغا بنا بیٹھا تھا۔

میں پڑھنا بھول گئی اور انہیں دیکھنے لگی، حامد اور اشفاق دونوں ایک ہی کشتی میں بیٹھے تھے۔ کتنا فرق تھا دونوں میں! ایک زندہ دلی کا مجسمہ تھا اور دوسرا بالکل چُغد!

اشفاق کشتی چلا رہا تھا ــــ دراز قد ــــ چوڑا چکلا سینہ ورزشی جسم، ہنس مکھ، ــــ ہر وقت ایک ہلکا سا تبسم ہونٹوں پر رہتا تھا ــــ جیسے بھی کپڑے پہن لے وہی سج جاتے ہیں کالے اور نیلے سوٹ تو اتنے سجتے ہیں کہ نظروں میں کھبنے لگتا ہے!

اُدھر حامد ــــ بالکل ہی الٹ، ہر وقت لبسور رہے ہیں، اول نمبر کے ڈرپوک جسم ــــ وہ بھی ڈھیلا اور غیر متناسب چھوٹا سا قد ــــ موٹا اور لمبا ناک ــــ سانولا رنگ ــــ کہیں باہر جانے سے پہلے آدھ آدھ گھنٹے تک میک اپ کریں گے، منہ پر کریمیں مل رہے ہیں، ہر وقت یہی کوشش ہے کہ کسی طرح بال گھنگھریالے بن جائیں ــــ بھلا اگر کسی روز بن بھی گئے تب کون سا فرق پڑ جائے گا، پہلے ہی بالکل زنانہ حلیہ ہے ــــ چل رہے ہونگے تو یہ خیال ہوگا کہ کہیں پاؤں میں موچ نہ آ جائے۔ کھیل کود کے پاس بھی نہیں پھٹکیں گے ــــ اول درجے کے بد دماغ۔ غلط فہمی کے شکار ــــ کر کچھ بھی نہیں سکتے اور ڈینگیں

اس قدر ستاتے ہیں کہ جس کی کوئی حد نہیں ——— پتہ نہیں کیوں مجھے شروع ہی سے اس سے نفرت تھی۔ اگر کوئی سہیلی مجھے اسکے نام پر چھیڑتی تھی تو مجھے بجائے فخر کے شرم آ جاتی تھی، ایسے ویسے ثقیل فقرے بولتے ہیں کہ انہیں سمجھنے کے لئے کم از کم انسان کو منشی فاضل تو ہونا چاہیئے۔

اُدھر اشفاق! ——— جیسے اب تک مجھے اس کا انتظار تھا۔ بالکل میرے خوابوں کی تعبیر: ویسے میں جانتی تو اسے کئی برس سے تھی مگر مجھے یہ اتنا اچھا کبھی نہیں لگا تھا ——— اسے بھی شاید میرا کوئی خیال ہو۔ مگر خیال ہوتا تو ایسی ٹیڑھی ترچھی باتیں کیوں کرتا ——— بڑا بے پروا ہے۔ بے پروائی کی بھی کوئی حد ہوا کرتی ہے ——— میں کافی دیر تک وہیں بیٹھی رہی ——— پھر دوسرے کمرے میں قد آدم شیشے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ میرا ناک ——— کیسا ستواں ہے، آنکھیں بڑی بڑی ہیں جنہیں میری سہیلیاں نشیلی کہا کرتی ہیں ——— قد بھی کتنا اچھا ہے۔ اور رنگ؟ ——— کافی کھلتا ہوا ہے جس میں گلابی آمیزش بھی ہے۔ کئی لڑکیاں اسے چمپئی بھی کہا کرتی ہیں، میرے بال ——— جنکی لٹوں کا چرچا ہر وقت کلاس میں رہتا ہے ——— آخر کیا نہیں ہے مجھ میں، اپنے کالج میں خوبصورت ترین گردانی جاتی ہوں، اور یہ احمق حامد تو میری شکل پر نظمیں لکھا کرتا تھا، پاگل کہیں کا، اپنی طرف سے شاعری کیا کرتا ہے۔ تعریف کرتے کرتے مجھے عرش تک پہنچا دیتا ہے۔

آخر یہ بال، یہ رنگ، یہ آنکھیں ——— یہ سب اشفاق کو کیوں نہیں اچھے لگتے؟ جب ساری دنیا کو اچھے لگتے ہیں۔ تو یہ ہی کونسا نرالا ہے؟ ——— میں جھنجھلا اٹھی ——— ہوں، نشیلی آنکھیں چمپئی رنگ ——— لہراتی ہوئی لٹیں ——— سب غلط! اب تک مجھے غلط فہمی رہی ——— کون کہتا ہے میں خوبصورت ہوں، اگر ہوتی تو اسے نہ لگتی؟ اسے تو میرا ذرا بھی خیال نہیں ہے! ——— مگر اتنی لڑکیاں غلط کہتی تھیں کیا؟ ———

اِدھر حامد سے منگنی ——— والد صاحب نے سب کچھ مجھ پر چھوڑ رکھا تھا۔ میں نے رضامندگی آج تک ظاہر نہیں کی تھی۔ یونہی ٹال مٹول کر جاتی تھی ——— اگر اشفاق مجھ میں ذرا سی بھی دلچسپی ظاہر کرتا تو میں نے کبھی کا والد صاحب سے کہلوا دیا ہوتا کہ وہ حامد کو جواب دے دیں ——— مگر کیا یہ چاہتا ہے کہ میں خود آپ سے دلچسپی ظاہر کروں ——— یہ تو کبھی نہیں ہو سکتا ——— یہ ہو ہی کس طرح سکتا ہے، میں اس پر موت کو ترجیح دونگی ——— اگر اسے اپنے اوپر غرور ہے تو ہوا کرے۔ مجھ میں بھی تو غرور ہے، کیا میں اس سے ہار جاؤں گی؟

x x x x x x x x x

دوپہر کے کھانے کے بعد اشفاق اور حامد دونوں ہمارے مختصر سے ڈرائنگ روم میں باتیں کر رہے تھے، ابا بازار گئے ہوئے تھے، امی شاید سو رہی تھیں، میرے دل میں اشتیاق پیدا ہوا کہ ان دونوں کی باتیں سنوں، آخر کیا باتیں کرتے ہونگے ہیں دبے پاؤں ساتھ کے کمرے میں پہنچی اور ایک کتاب لیکر صوفے پر بیٹھ گئی ——— ن دونوں کی آواز صاف آ رہی تھی:

حامد بولا: "نہ معلوم مجھے فطرتاً کیوں حساس طبیعت ودیعت ہوئی ہے۔ اور جذبات سے لبریز دل۔ جس میں لمحہ لمحہ کے بعد طوفان آتے ہیں، جو خیالات کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتے ہیں، اور دیر تک انتشار سا رہتا ہے۔"

"اور سچ تو یہ ہے کہ انسان کو ہونا بھی چاہیئے حساس ہی، ورنہ آدمی اور جانور میں فرق ہی کیا ہوا؟" اشفاق بولا ———

"میری موقع بے موقع سنجیدگی کی یہی وجوہات ہیں۔ جن کی بنا پر مجھے یہ دنیائے فانی محض تضیع اوقات کے سوا کچھ نہیں لگتی۔" ——— حامد نے کہا۔

"آپ کی شکل کچھ کچھ رڈولف ویلنٹینو مرحوم سے ملتی جلتی ہے۔"

"اور آپ حیران ہونگے کہ یہی الفاظ مجھے کئی حضرات کہہ چکے ہیں" ——— حامد بولا۔

"مگر جب آپ ہنستے ہیں تو بالکل رامن نوویرو لگتے ہیں۔"

"جی ہاں! غالباً آپکا قیاس کسی حد تک صحیح ہے، اگرچہ میں گاہے بگاہے ہنسنے کا شوق کیا کرتا ہوں، تاہم وثوق سے کہہ سکتا

ہوں۔ کہ بعض اوقات مجھے خود بھی یہی محسوس ہوتا ہے"۔
—— مجھے حسرت ہی رہی کہ کبھی اسے بھی ہنستا دیکھوں۔

" اور پرسوں جب آپ نوکر پر ناراض ہو رہے تھے تو بالکل جان گلبرٹ مرحوم دکھائی دے رہے تھے۔" اشفاق بولا

" خیر ایسا ہو سکتا ہے، میں نے ایسے غیر ضروری مسائل پر غور کرنا قابلِ توجہ نہیں گردانا، تاہم میرا شبہ یقین میں تبدیل ہوا چاہتا ہے۔ کہ واقعی ایسا ہی ہوا ہوگا۔ مجھے اوائل عمر سے ہی شوق رہا ہے کہ میں اپنے جذبات کا اظہار ایکٹنگ میں کیا کروں، مگر میں معافی کی گزارش پیشِ خدمت کر کے جسارت کرونگا، اور مجھے اندیشہ کامل ہے کہ شاید یہ اختلاف آپکی طبع نازک کو گراں محسوس ہو —— وہ یہ کہ مجھے جان گلبرٹ مرحوم کبھی حسین و جاذبِ نگاہ محسوس نہیں ہوا اگر میں ایک آرٹ کا شیدائی ہوتے ہوئے ہر ایک آرٹسٹ کی قدر کرنا اپنا فرضِ اولین تصور کرتا ہوں۔"

" بہت خوب: مجھے بھی ایک عرصہ یہی خبط رہا ہے۔ مگر حسرت ہی رہی۔ بُرا ہو اس ملبے قد کا کہ مَیں کچھ بھی نہ کر سکا" — اشفاق بولا۔

" ہاں میرا ذاتی نظریہ بھی اسی قسم کے حقائق کا شاہد ہے۔ کہ دراز قد انسان عموماً فنونِ لطیفہ سے بے بہرہ ہوتا ہے اور اگر خدا نخواستہ بصورتِ دیگر وہ کوشش بھی کرے تب بھی وہ کسی جذبۂ بے اختیار کے ماتحت اس مہم میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔"
—— میں اس فقرے کو بہت دیر کے بعد سمجھ سکی ——

" جی ہاں، اور جب کبھی میں کوشش کرتا بھی ہوں کہ فنونِ لطیفہ میں دلچسپی لوں تو یہ بے تکا قد، یہ لمبوترا چہرہ، اور یہ غیر رومانی حرکتیں سب چیخ چیخ کر کہتے ہیں کہ بھئی تو صبر ہی کرلے تو بہتر رہے گا۔"

" آپکی اس لطیف گفتگو سے جسے میں قصداً جُرأت کرتے ہوئے صرف مزاحیہ کہدینے پر اکتفا کرونگا۔ اس میں نہ صرف کسی قدر سچائی کی جھلک ہے بلکہ اگر میں ذرا آگے چلا جاؤں تو اس میں قدرے کسرِ نفسی کا مادہ بھی پنہاں ہے۔ جسے ہر ذی ہوش انسان انتہائی آسانی کے ساتھ پہچان سکتا ہے۔ اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ غالباً آپ نے اپنی عمر اب تک محبت کے روح پرور اثرات اور دل آویز و دلگداز خیالات سے لاانتہا ہی فاصلے پر رہ کر ضائع کی ہے بلکہ میرے دل میں یہ اندیشہ تخلیق پا گیا ہے کہ شاید آپ اسی قسم کے اثرات کے زیرِ سایہ رہ کر اپنی عمر کے اس بیش قیمت حصے کو نہ صرف ضائع ہی نہ کر دیں گے بلکہ اپنے دل، اپنی روح، اور اپنے دماغ —— سب کو اس لطیف غذا سے محروم کر کے ناکارہ کر دیں گے"۔ حامد نے اپنی گلابی نثر ختم کی۔
—— مجھ سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی ——

" لاحول ولا قوۃ! بھلا کہاں محبت اور کہاں میں! اجی قبلہ ہمیں کیا پتہ محبت ہے کیا چیز؟ آپ کا نظریہ حرف بحرف صحیح ہے —— آپ سچ کہتے ہیں بھلا مجھ جیسے شخص سے کون بدمذاق ہستی محبت کر سکتی ہے؟"

" اس صورت میں جبکہ انسان محبت کا اہل کسی زاویۂ نظر سے بھی قرار نہ دیا جا سکے۔ اور تلخی و ناکامی سایے کی طرح اس کا تعاقب کر رہی ہو، ایسی صورت میں مذکورہ حالات کا اعتراف کر لینا نہ صرف باعثِ سکونِ قلب ہے بلکہ کسی حد تک باعثِ تحسین و آفرین بھی ہے۔ مگر خدائے تعالیٰ جلّ جلالہٗ سے نا امید و مایوس ہونا کفرِ عظیم ہے، اس صورت میں حقیر انسان کا فرضِ منصبی یہی ہے۔ کہ وہ ناکامیابی کی تلخیوں پر فاتحانہ انداز سے تبسم ریز ہوتا ہوا امید کے قلعے میں محصور رہ کر کامیابی کے لئے کوشاں رہے۔"
—— یکایک مجھے امی کی آواز سنائی دی شاید مجھے بلا رہی تھیں۔ مجھے مجبوراً جانا پڑا —— بمشکل پانچ منٹ لگے ہونگے وہاں سے چھٹکارا پاتے ہی میں واپس بھاگی اور اسی کمرے میں جا پہنچی —— کان لگا کر سننے لگی۔ حامد بول رہا تھا۔

" غالباً اس وقت آپ کے مایوس و پژمردہ دل میں ولولہ انگیز جذبات کا ایک ہیجان بپا ہوگا، خدائے پاک کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس ہیچمدان کی مساعی ثمر بار ثابت ہوئیں اور آپ کو سکونِ قلب حاصل ہو گیا۔ آئندہ اسی قسم کا تبادلۂ خیالات میرے لئے باعث

دائمی مسّرت ہوگا۔ کبھی ذی جان کو غم و الم اور افکار کے بارِ عظیم سے نجات دِلا کر میرے دل کو جو روحانی خوشی حاصل ہوئی ہے ـــــ اس کا اندازہ ؟ آہ! کس فانی کی طاقت ہے کہ اس کا صحیح طور پر تخمینہ کر سکے ؟"

"تم کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ آپ نے سچ مچ میرا آدھا دکھ دُور کر دیا۔ آج کل ہندوستان کو آپ جیسے سپوتوں کی ضرورت ہے۔ اور پھر مہاتما گاندھی کی بھی تو یہی پالیسی ہے۔"

ـــــ مَیں نے کواڑ کی درز میں سے اسے دیکھا ـــ اس نے اپنا چہرہ اتنا سنجیدہ بنا رکھا تھا کہ مجھے ہنسی آ گئی، کتنا دلچسپ ہے یہ! ہر رنگ کا بہروپ بھر لیتا ہے۔ حامد کے ایک ایک فقرہ پر میں ہنسی سے دُہری ہوئی جا رہی تھی اور یہ کتنی سنجیدگی سے سُن رہا تھا! ـــــ

اگلے روز کا ذکر ہے ابا فوٹوگرافر سے چند نئے پرنٹ لائے تھے میں بیٹھی انہیں البم میں لگا رہی تھی، نعیم کیمرہ لئے بیٹھا تھا ـــ اشفاق آ گیا ـــ میرے ہاتھوں سے البم کھینچ لی اور لگا دیکھنے جلدی جلدی دیکھ کر بولا "کچھ نہیں، یہ بھی کوئی البم ہے، اوّل تو جس نے تصویریں لگائی ہیں اُسے فوٹوگرافی کے متعلق کچھ پتہ ہی نہیں دوسرے یہ کہ تصویریں آدھی تو دھندلی ہیں اور آدھی سیاہ ہیں سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ کس ملک کی اور کس قسم کے باشندوں کی تصویریں ہیں۔ اگر میرا البم کوئی دیکھے تو دنگ رہ جائے۔"

"تو آپ کا البم یہیں ساتھ ہی ہے کیا؟" نعیم للچا کر بولا

"ہاں ہے تو ساتھ ہی، مگر میں خاص خاص آدمیوں کو دکھایا کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ جانے لگا۔

میں نے نعیم کو اشارہ کیا ـــ اور آہستہ سے اُسے کہا۔ "جب جا نہیں البم لے ہی آؤ؟"

نعیم بھی اس کے ساتھ ہی چلا گیا جب شام کو واپس آیا۔ تو اس کے ہاتھ میں ایک بڑے سائز کا خوبصورت سا البم تھا، ہم دونوں آدھی رات تک تصویریں دیکھتے رہے، واقعی تصویریں بہت ہی اچھی تھیں، آدھا البم تو اس کی اپنی ہی تصویروں سے بھرا ہوا تھا، کوئی کوئی تصویر تو اتنی اچھی تھی کہ جی میں آتا تھا نکال لوں۔

ـــــ البم کو تین چار مرتبہ دیکھ کر نعیم تو سو گیا مگر مَیں جاگتی رہی اس کی ایک تصویر پر میری نظریں جم گئیں ـــــ کچھ بھی ہو اسے تو ضرور ہی نکال لینا چاہیئے ـــــ مگر وُہ اپنے دل میں کیا سوچے گا، بغیر پوچھے تصویر رکھ لی ـــ دوسرے الفاظ میں تصویر چرا لی۔ کافی دیر تک میں اسی کشمکش میں رہی آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور میں نے وہ تصویر نکال ہی لی، دوسرے روز نعیم نے البم واپس کر دیا۔ اس نے کچھ بھی نہ کہا۔ اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

شاید تیسرے روز کا ذکر ہے، ہم سہ پہر کی چائے پی رہے تھے، ابا کسی سے ملنے گئے ہوئے تھے۔ اور نعیم نوکر کے ساتھ بازار گیا تھا۔ اتنے میں اشفاق آ گیا اور چائے میں شریک ہو گیا۔

"آج میں آپ کو ایک دلچسپ واقعہ سنانے لگا ہوں۔"

امّی پہلے ہی سے مسکرا دیں، اور جلدی سے بولیں

"ہاں ہاں سناؤ بھئی!"

"آج کی گفتگو کا موضوع ہے چوری ـــــ چوری کی بہت سی قسمیں ہیں ـــ روپوں کی چوری! ـــ زیورات کی چوری ـــ امرُودوں کی چوری ـــ افسانوں کی چوری وغیرہ وغیرہ مگر آپ نے ایک خاص قسم کی چوری بھی سنی؟"

"وُہ کون سی؟"

"تصویروں کی چوری" ـــــ! وہ مسکرا رہا تھا اور اِدھر میرا دم خشک ہو گیا۔

"اور پھر خود ہی سوچیئے ذرا، کتنا بُرا لگتا ہے کہ کوئی غریب بڑے اہتمام سے بہترین کپڑے پہن کر، بہترین فوٹوگرافر سے ـــ بہترین پوز میں تصویر کھنچوائے ـــــ اور کسی کے دل میں نہ معلوم کس قسم کی گدگدی اٹھے ـ اور وہ تصویر خواہ مخواہ چرا لے۔"

ـــــ میری تو بس جان ہی نکل گئی ـ کیا یہ سب کچھ امی سے کہہ دے گا؟ وہ کیا سوچیں گی دل میں؟

"کیا ہوا، مذاق مذاق میں تصویریں بھی چرا لیتے ہیں۔" امی بولیں ـ

"یہ مذاق کی بھی ایک ہی رہی، کم از کم مجھے تو اس مذاق میں کوئی جاذبیت دکھائی نہیں دیتی، اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ میں اپنی تصویر چوری ہو جانے پر تو اس بات کو ترجیح دوں گا کہ کوئی براہِ راست مجھے ہی چُرا لے۔ دیکھئے نا: یہ میری ایک نہایت ہی اچھی تصویر تھی۔"

"تو کیا وہ کسی نے چُرا لی؟" امّی نے پوچھا

"جی ہاں، بڑے اطمینان سے چرائی اور رسید تک نہ دی پہلے تو مجھے بڑا افسوس ہوا۔ مگر بعد میں —— پتہ ہے، میں نے کیا کیا؟"

"کیا کیا تم نے؟" امی بدستور مسکرا رہی تھیں۔

"آپ ہی فرمایئے مجھے کیا کرنا چاہیئے تھا؟"

"تم بھی اس کا کچھ چُرا لیتے۔"

"جی ہاں! بس میں نے بھی اس کا کچھ چُرا لیا —— میں نے چپکے سے اس کی بہترین تصویر چُرا لی —— ٹھیک کیا نا میں نے؟"

"بڑا اچھا کیا۔ ایسے کو تیسا!" —— امّی نے اس کے سامنے کیک سرکاتے ہوئے کہا۔ "اچھا، اب باتیں بعد میں کریں گے پہلے اس سے نپٹ لو۔"

میں جلدی سے کوئی بہانہ بنا کر اٹھی اور سیدھا اپنے کمرے کا رُخ کیا، جو سوٹ کیس کھول کر دیکھتی ہوں۔ تو بس دھک سے رہ گئی۔ میری تصویر غائب تھی —— پوری کیبنٹ سائز کی تصویر —— خود ابّا نے کھینچی تھی۔ اور تھی بھی بس اکیلی ہی کاپی کئی سہیلیوں کو میں نے محض اسی تصویر پر ناراض کیا تھا۔ وہ کہتی تھیں یہ میری بہترین تصویر ہے —— جہاں مجھے افسوس ہو رہا تھا۔ وہیں دل کے ایک گوشے میں مسرت بھی کروٹیں لے رہی تھی۔

× × × × × × × × ×

دوسرے روز صبح کے وقت بوٹنگ پر جاتے ہوئے وہ کہنے لگا، "میں پرسوں واپس جا رہا ہوں۔"

"ہیں، واپس جا رہے ہو؟" ابّا تعجب سے بولے "اتنی جلدی؟"

"جی ہاں، اگر آپ سب نہ ملتے تو کبھی کا چلا گیا ہوتا۔"

"مگر ابھی تمہاری چھٹیاں تو دو تین ہفتے کی باقی ہیں!"

"ہیں تو سہی، مگر ابھی دو تین جگہ اَور چکر لگانا ہے۔"

"بھئی نمائش دیکھ کر جانا۔ اگلے ہفتہ ہی تو ہے!"

"جی نہیں، اگر نمائش دیکھنے ٹھہر گیا، تو شاید چھٹیاں یہاں ہی گزر جائیں!"

گھر میں سے تقریباً سب نے ٹھہرنے کو کہا۔ مگر وہ نہ مانا —— سیلانی طبیعت نے زور مارا ہو گا کہ کہیں اور پھر یں گے دوپہر کو واپس جاتے وقت بولا۔ "لاحول ولاقوۃ! میں بھول ہی گیا۔"

"کیا بھول گئے؟" امّی بولیں۔

"اجی امی جان نے ان کے لئے کچھ بھیجا تھا!"

"نجمہ کے لئے؟"

"جی ہاں، انہی کے لئے۔"

—— کچھ بھیجا تھا —— میں چونک پڑی۔

"مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ کالج سے سیدھے یہاں آ رہے ہو۔ پھر وہ کچھ کہاں سے لے آئے؟" —— امی مسکرا رہی تھیں

"میں گیا تو تھا وہاں!"

"کہاں؟"

"میرا مطلب ہے، میرا ارادہ تھا کہ وہاں جاؤں —— دیکھئے نا —— انہوں نے خود ہی کسی کے ہاتھ بھجوایا۔ پچھلے مہینے بھیّا لاہور آئے تھے، وہ ساتھ لے آئے۔"

"بس خواہ مخواہ، انکی تو ہمیشہ سے یہی عادت ہے۔ بھلا لگاتار تحفے بھیجنے کی ضرورت ہی کیا تھی، اور پھر نجمہ بھی تو ان کی ہی لڑکی ہے۔"

"ذرا داد دیجئے میرے حافظے کی —— مجھے خیال ہی آج آیا ہے۔"

" وہ کیا چیز ہے بھلا ؟" میں نے پوچھا۔

" مجھے خود پتہ نہیں، البتہ کچھ ہے ضرور !"

—— میرا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔

" وہ چیز کتنی بڑی ہے، کیا آپ کوئی اندازہ لگا سکتے ہیں"

" یونہی معمولی سی ہے، نہ بہت بڑی اور نہ بالکل چھوٹی "

" اس کا رنگ کیسا ہے ؟ —— اور اس کی شکل کیسی ہے"

" اس وقت تو مجھے اچھی طرح پتہ نہیں، ہاں ہے کچھ خوب صورت سی "

" ذرا دماغ پر زور ڈالیئے —— بھلا وہ چیز گول ہے، چوکور ہے یا تکونی —— وہ پتلی ہے یا موٹی —— اور ملائم ہے یا سخت ؟"

امی جان ہنس دیں —— " آخر اس قدر بے صبر ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے ؟ جو کچھ بھیجا ہوگا شام کو آجائے گا۔"

وہ چلا گیا —— میرے دل میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ تحفہ بھیجا ہے ؟ —— مجھے ؟ —— اور پھر اس کے ہاتھ ؟ —— خود بھی تو بھیج سکتی تھیں —— ابھی دو مہینے بھی نہیں ہوئے، انہوں نے ایک سنہری "نیک لیس" میرے لئے بھیجا تھا —— اتنی جلدی دوسرا تحفہ —— واقعی انہیں میں بہت اچھی لگتی ہوں —— وہ ہمیشہ میری تعریفیں کیا کرتی ہیں۔

میرا دل مسرت سے لبریز ہوگیا —— غرور سے میرا سر اونچا ہوگیا۔

شام کو امی اور ابا تو شاپنگ کرنے چلے گئے، نعیم کہیں کشتی لے کر نکل گیا۔ میں اکیلی بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی، کھڑکی سے جھانک جھانک کر میری گردن دُکھنے لگی تھی۔

اس نے دوسرے کنارے سے اشارہ کیا اور ہمارا نوکر شکارا لے کر اسے لینے چلا۔

میں اٹھ کر چھوٹے سے برآمدے میں کھڑی ہوگئی۔ وہ آیا مسکراتا ہوا —— زردی مائل قمیص، ویسی ہی پتلون، چوڑی دھاریوں کا کھلا ڈھیلا کوٹ پہنے ہوئے —— گلے میں ایک شوخ رنگ کا مفلر تھا —— وہ کیسا بھلا معلوم ہو رہا تھا —— آکر صوفے پر بیٹھ گیا۔

" اِدھر آبیٹھئے !"

—— میں اس کے پاس چلی گئی۔

" یہاں بیٹھ جائیے !"

—— میں اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

" یہ کچھ بھیجا ہے امی نے " —— اس نے ایک چھوٹا سا ڈبہ کھولا۔ میں نے دیکھا کہ ایک چھوٹی سی سنہری گھڑی چمک رہی تھی۔

" اور انہوں نے مجھے یہ تاکید بھی کی تھی کہ میں خود ہی آپ کو پہناؤں، لائیے اپنی کلائی —— "

میں نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیئے —— اس نے میرا داہنا ہاتھ اپنی گود میں رکھ لیا۔ اور گھڑی باندھ دی —— میں نے اپنا ہاتھ وہیں رہنے دیا۔

" ارے یہ تو داہنا ہاتھ تھا، میں بھی کتنا بدحواس ہوں" میں ہنس پڑی۔

اس نے بائیں ہاتھ پر گھڑی باندھ دی۔ میرے دونوں ہاتھ اس کی گود میں رکھے تھے۔ میرا دل بے تحاشہ دھڑک رہا تھا، اور ایسی سرد شام کو مجھے پسینہ بھی آگیا۔

" کیسی ہے ؟"

" بہت پیاری ہے" میں بولی

" آپ سے بھی زیادہ ؟" اس نے آہستہ سے کہا اور سارے جسم کا خون سمٹ کر میرے چہرے پر آگیا۔

—— میں نے گردن جھکالی۔ اس نے سگریٹ سلگائی اور حسبِ معمول ایک لمبا سا کش کھینچا اور سارا دھواں میرے منہ پر چھوڑ دیا۔

" مجھے اس کی بُو ذرا اچھی نہیں لگتی " میں نے منہ بنا کر کہا۔

" مگر مجھے تو اچھی لگتی ہے، —— ارے یہ سب لوگ کہاں گئے ؟"

—— میں نے بتادیا ——

" بھئی میرا جی تو کشتی چلانے کو چاہتا ہے، اُدھر نعیم صاحب کشتی سمیت لاپتہ ہیں "

" ابھی آجائیگا، کچھ دیر انتظار کیجئے "

" تو پھر اتنی دیر کیا کیا جائے —— اچھا ایک آدھ ریکارڈ ہی سُنا دیجئے !"

—— میں اٹھی اور سوچنے لگی کون سا ریکارڈ بجاؤں۔ —— نہ جانے کیا خیال آیا کہ وُہی سہگل کا ریکارڈ —— "میں کیا جانوں کیا جادو ہے" لگا دیا۔ اور اس کے سامنے صوفے پر جا بیٹھی —— ریکارڈ بج رہا تھا —— " من پوچھ رہا ہے اب مجھ سے —— نینوں نے کہا ہے کیا تجھ سے "۔ —— میں نے اسکی طرف دیکھا، وُہ ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس دفعہ میں نظریں اس کے چہرے سے نہ ہٹا سکی —— " جب نین ملے —— نینوں نے کہا، اب نین بسیں گے —— نینوں میں "۔

اس کے بعد مجھے پتہ نہیں کہ ہم نے کتنی دفعہ اس ریکارڈ کو بجایا۔ اور کتنی دیر تک ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ مجھے پتہ نہیں تھا، میں کہاں بیٹھی ہوں —— بس میری نظروں کے سامنے وہ آنکھیں تھیں —— جو مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں بالکل مدہوش ہوگئی —— نعیم کی آواز نے مجھے چونکا دیا —— میں جیسے ایک دلفریب خواب سے چونک پڑی، شاید وہ کشتی لے کر واپس آگیا تھا اور اشفاق کو بلا رہا تھا۔

" آئیے، ایک چکر اَور لگا آتے ہیں "۔ نعیم نے آواز دی

" ابھی آیا "—— اشفاق نے کوٹ اَور مفلر وہیں صوفے پر ڈالے اَور مجھے دیکھتا ہوا چلا گیا۔ میں کچھ کھوئی ہوئی سی بیٹھی رہی —— پھر اس کا مفلر اُٹھا لیا۔ اور اس سے کھیلتی رہی جب اس سے تھک گئی تو کوٹ اٹھا لیا۔ اور کچھ نہیں سمجھ میں آیا۔ تو جیبیں ہی ٹٹولنی شروع کر دیں، اوپر کی جیب میں ایک کاغذ تہ کیا ہوا پڑا تھا۔ میں نے اسے کھولا —— میری نظریں اس پر جم کر رہ گئیں —— کسی مقامی جوہری کی رسید تھی —— ایک سنہری گھڑی کی فروخت کی —— قیمت بھی لکھی تھی —— اڑتالیس روپے بارہ آنے —— اَور تاریخ بھی آج ہی کی تھی، —— میں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی —— میری آنکھوں کے سامنے حروف ہلنے لگے —— کیا یہ سچ ہے ؟ —— کیا اشفاق جھوٹ بول رہا تھا۔ —— اور امی کا نام وَیسے ہی لے رہا تھا، جھوٹا کہیں کا —— پہلے درجے کا مکار —— مجھے اس پر اس قدر غصہ آرہا تھا کہ بس، —— اونہہ، امی جان نے بھیجی ہے —— اَور خود پہنانے کو تاکید کی تھی —— بھلا انہیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ ہر مہینے میرے لئے ایک تحفہ بھیجیں —— غم و غصہ سے میری آنکھوں میں آنسو گئے —— آخر اس قدر جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وُہ تحفہ دینا چاہتا تھا، مگر اسے اندیشہ تھا کہ شاید میں قبول نہ کروں۔ اس لئے اُس نے یہ ڈھونگ رچایا۔ میرے سامنے اب دو ہی باتیں تھیں یا تو گھڑی واپس دے دوں اور یا اتنے ہی روپے اس کی جیب میں ڈال دوں —— اسے قبول کرنے میں میری شکست پنہاں تھی، اگر یہ مجھے اپنی طرف سے پیش کرتا تو شاید میں لے لیتی —— مگر اسے واپس کرنے میں مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں اسے ہمیشہ کے لئے نہ کھو دوں، میں نے یہی فیصلہ کر لیا کہ کچھ بھی ہو۔ مگر شکست ہرگز نہ مانوں گی، کیا میں وہی نجمہ نہیں جس کی خودداری کالج بھر میں مشہور ہے، اَور جس کی ضد کے سامنے کوئی بھی نہیں ٹھہرتا —— جس نے کبھی کسی کا احسان نہیں اٹھایا —— کیا میں بدل گئی ہوں —— کیا میں اس بے پروا اَور مغرور سے ہار جاؤنگی ؟ بالکل نہیں —— میں نے مٹھیاں کس لیں اور مصمم ارادہ کر لیا کہ بجائے کوٹ میں ڈالنے کے گھڑی اسے علیحدہ بلا کر واپس کر دوں —— !

ڈیڑھ دو گھنٹے تک وُہ واپس آگیا، ابا بھی واپس آ گئے تھے وہ بار بار نظریں بچا بچا کر مجھے دیکھ رہا تھا مگر میں نے ایک مرتبہ بھی اس کی جانب نہیں دیکھا۔

کھانے کے بعد جب وہ جانے لگا تو میں پہلے ہی ڈرائینگ روم میں پہنچ گئی، وُہ جلدی میں تھا اَور شاید اُس نے مجھے نہیں

دیکھا ـــ اور جلدی جلدی کوٹ پہننے لگا۔

"ذرا سُنیئے!" مَیں نے آہستہ سے کہا۔ میری مُٹھی میں گھڑی تھی ـــ وُہ لپکا ہوا میری طرف آیا۔

"آج آپ چُپ چُپ کیوں تھیں؟"

"دیکھئے!" میں نے آواز اور سنجیدہ بنا کر کہا "بات در اصل یہ ہے کہ ـــ!"

"بات یہ ہے کہ بات کچھ بھی نہیں ـــ" اس نے بات کاٹتے ہوئے جلدی سے کہا۔

وُہ مسکرا رہا تھا۔ "بتایئے بھی اب بات کیا ہے؟"

مَیں نے اپنی مٹھی کھول دی!

"ارے یہ گھڑی تم نے اُتار دی ـــ مجھے آخر کتنی دفعہ پہنانا ہوگی ـــ؟"

پیشتر اس کے کہ میں کچھ بولتی، اس نے جلدی سے گھڑی باندھ دی۔ اور میرے دونوں ہاتھ دبا کر بولا۔ "کیا کہنا چاہتی تھیں آپ؟" ـــ اس کی آنکھوں میں مسرت ناچ رہی تھی۔

کیا تو میں غصّے سے بھری بیٹھی تھی اور کیا اس کا ہنس مکھ چہرہ دیکھ کر مجھے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے کسی نے مجھ پہ جادو کر دیا ہو۔ سارے شکوے شکائیتیں بھول گئی۔ جیسے کوئی بات تھی ہی نہیں۔

"اب بتایئے بھی، وُہ کون سی ایسی بات تھی؟"

میں بدستور خاموش کھڑی اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

"اپنی طرف سے تو بڑی سنجیدہ بنی ہوئی ہیں ـــ افسوس یہ ہے کہ میرے پاس سگریٹ ختم ہوگئے ہیں، ورنہ ضرور آپ کو دھوئیں میں نہلا دیتا۔"

"بات یہ تھی کہ کل آپ ضرور آئیں گے نا؟"

"بس صرف اتنی ہی؟ مَیں سمجھا خدا جانے کون سا سنگین معاملہ ہے۔ اچھا آنکھیں بند کیجئے۔"

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

"اور مٹھی کھولیئے!"

ـــ مَیں نے مُٹھی کھول دی۔

"جب تک میں چلا نہ جاؤں، دیکھئے مت!"

ـــ اس نے میری ہتھیلی پر کچھ رکھدیا۔ اور جلدی سے باہر نکل گیا۔

مَیں نے آنکھیں کھولیں۔ ایک چھوٹا سا پیکٹ تھا جس میں ذرا ذرا سے جمے ہوئے پھل تھے۔

××× ××× ××× ×××

دوسرا روز اس نے ہمارے ساتھ ہی گزارا، اگلے روز علی الصبح اسے جانا تھا۔ اس لئے شام کو رخصت ہونے لگا۔ ابّا اور امی سہ پہر سے اس سے باتیں کر رہے تھے۔ کچھ پیغام ابّا نے دیئے ہونگے، اور کچھ امی نے۔

اور ہاں کچھ دیر کے لئے وُہ حامد سے بھی ملنے گیا۔ جس سے وہ بڑے تپاک سے باتیں کرتا۔ مَیں نے ارادہ کر لیا کہ کل ہی ابا سے کہلوا دونگی کہ انہیں صاف جواب دے دیں۔

کافی رات جا چکی تھی ـــ وُہ جانے کے لئے بار بار اٹھتا تھا مگر اسے کچھ دیر کے لئے اور ٹھہرا لیتے تھے ـــ میں چاہتی تھی اس سے علیحدہ بھی باتیں ہوں۔ وہاں تو اس نے مجھے صرف اتنا کہا۔ کہ میں اسے لاہور میں ملتی رہا کروں۔

چلتے وقت اس نے بچّوں کو پیار کیا، امّی نے اس کی پیشانی چوم لی۔ ابّا نے اسے تھپتھپایا ـــ جیسے کسی کو شاباش دے رہے ہوں۔ مجھے ہنسی آگئی ـــ وُہ شکارے میں بیٹھ گیا۔

کچھ دیر سب کے سب باہر کھڑے رہے۔ پھر اندر چلے آئے میں اکیلی برآمدے کے ستون سے لگی اسے جاتے دیکھ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ کشتی جھیل کے وسط میں پہنچ کر پھر واپس ہوگئی۔ میں حیران رہ گئی ـــ کشتی آکر بالکل میرے سامنے رُکی۔

وُہ آہستہ سے بولا "میں ہیٹ لے کر ابھی آیا ـــ تم ذرا یہیں ٹھہرو" ـــ گویا وہ جان بوجھ کر ہیٹ چھوڑ گیا تھا، چالاک کہیں کا۔

میں بھی اُس کے ساتھ کمرے میں گئی ——— اس نے ہیٹ اٹھایا اور بولا" میں نے سوچا آپ سے علیحدہ مل آؤں۔"

"شکریہ!"

"آپ مجھے لاہور ضرور ملا کریں گی؟"

میں نے اثبات کے طور پر سر ہلا دیا۔

"اچھا، خدا حافظ!" اس نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

میں چُپ تھی۔

"اس میں بسورنے کی بات ہی کون سی ہے، بھئی ہنسو نا!"

"خدا حافظ!" میں نے گھٹی ہوئی آواز سے کہا۔

"ارے میرا رُومال کہاں گیا؟"

——— اس کا رومال تو میرے چرمی بیگ میں محفوظ تھا۔

"یہ لے لیجئے!" مَیں نے اپنا رُومال اس کی جیب میں لگا دیا۔

"اُوہ! ایک بات تو مَیں بھول ہی گیا تھا" ——— اس نے سلگتی ہوئی سگریٹ کا ایک خوب لمبا سا کش لیا۔ میں نے دونوں ہاتھ منہ پر ڈھانپ لئے۔

"نہیں، نہیں!" میں نے منہ چھپاتے ہوئے کہا۔

اُس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر زبردستی دھوآں میرے چہرے پر چھوڑ دیا ———:

"اچھا،" اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

جاتے ہوئے اس نے دروازے میں کھڑے ہو کر ہیٹ سمیت مجھے جھک کر سلام کیا، میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

——— وہ کشتی میں اس پار جا رہا تھا۔ میں ستون سے لگی اسے دیکھ رہی تھی۔ میرے دل میں امنگیں ناچ رہی تھیں۔

جھیل کے شفاف پانی پر چاند کی کرنیں رقصاں تھیں۔

چَپ! ——— چَپ!! ——— چَپ!!!

تیزی سے کشتی کے چپوؤں کی آواز آرہی تھی، بالکل میرے دل کی دھڑکن سے ملتی جلتی۔

مجھے جھیل کبھی اسقدر پیاری نہیں لگی تھی، ——— چاندنی کبھی اتنی حسین نہیں دکھائی دی تھی ——— دور کوئی کشمیری ملاح بڑی مست آواز میں گا رہا تھا ——— کسی چیز میں بھی سکون نہیں تھا ——— پہاڑوں کی اوٹ میں بھورے بھورے بادلوں میں بجلی تڑپ رہی تھی، پانی کی لہریں مستانہ وار جھوم رہی تھیں ——— سفیدے کے درختوں میں ہوا کی سرسراہٹ صاف سنائی دے رہی تھی ——— آسمان پر تارے ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے ——— ہر ایک چیز میں زندگی تھی، تڑپ تھی ——— میرے سامنے کائنات رقص کر رہی تھی،

میں مسکرائی ——— بالکل اس طرح جیسے کوئی جواری اپنا سب کچھ لُٹا کر مسکرا دیتا ہو ——— میں سب کچھ ہار بیٹھی تھی ——— مگر یہ شکست کتنی دلفریب تھی؟

ملک راج آنند

نغمۂ کشمیر

قریب دس سال کا عرصہ ہوا جب ہم کشمیر کی سیر کو گئے تھے، یہ واقعہ جو میں بیان کر رہا ہوں اسی وقت پیش آیا تھا۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اس واقعہ کی یاد میرے دل میں اسی طرح تازہ ہے۔ اس واقعے کا نظارہ کئی روز تک میری آنکھوں میں پھرتا رہا۔ اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اسے لکھ ہی ڈالوں۔

مجھ سمیت ہماری ٹولی میں کل چار آدمی تھے۔ ایک نوجوان سکھ تھا۔ جس کی شرافت اور رعب میں دست قدرت اور ریدِ خیاط دونوں کی صنعت اور کاریگری پہلو بہ پہلو نمایاں تھی۔ دوسرا ایک نازک مزاج شاعر تھا۔ اور تیسرا ایک کشمیری گھرانے کا آدمی تھا۔ جو لوگ اب ترک وطن کرکے میدانوں میں جا بسے تھے۔ ان لوگوں نے وہاں جا کر اپنی رہائش خوب کامیاب بنالی تھی۔ جیسا کہ عموماً کشمیری لوگوں کا قاعدہ ہے۔ حالانکہ عموماً قدرت ان پر نہایت مہربان اور فیاض ہے۔ مگر انسان کی صدیوں سے انسانوں پر بے رحمی اور ظلم سے یہ لوگ اکتا گئے ہیں — ان سب کے علاوہ ایک پہاڑی چھوکرا بھی تھا۔ جو ہمارے لئے کھانا تیار کیا کرتا تھا۔

ہم نے ایک تانگے پر اپنا سب اسباب لاد لیا۔ اور تین سو پچھتر میل کا فاصلہ سڑک کے راستے جموں سے ہمالیہ کے اس پار تک کئی مرتبہ کے قیام کے بعد پر سکون راوی۔ اور پُر آب چناب کو پار کرکے طے کیا — بانہال کی چوٹی پر پہنچ کر ہم ہوا سے باتیں کرنے لگے۔ ہاں اسی ہوا سے جو کشمیر کی خوبصورت وادی سے نزاکت لطافت اور دکھ سے لدی ہوئی زعفران کی ذریں اور شاداں خوشبو سے بھرپور۔ جس میں لوگوں کے بغیر صلہ کی محنت و مشقت کی آہیں بھی شامل تھیں۔ آ رہی تھی۔

ہم لوگ ویری ناگ کے قدرتی فوارے کی طرف اُترے جس میں سے پانی قطرہ قطرہ ہو کر ندی میں گرتا ہے۔ یہ ندی اسلام آباد پہنچ کر دریائے جہلم کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ دریائے جہلم ساری وادی کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہوا جھیل وُولر میں بہتا ہے۔ پھر دو سو میل پہاڑی فاصلے کرکے میدان میں پہنچ جاتا ہے۔

ویری ناگ کے بعد ہم لوگ ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچے۔ اس گاؤں کی گلیاں نہایت تاریک اور پیچ در پیچ ہیں۔ سارے کا سارا گاؤں مٹی کے چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں سے بنا ہوا تھا ایک بات اس گاؤں میں خوب تھی۔ قریباً تمام گھروں کی چھتوں پر زنگار رنگ کے پھول عجب بہار دیتے تھے۔ گاؤں سے گزر کر ہم ایک کھلی وادی میں پہنچے۔ اس وادی کی کچی سڑک پر دو رویہ شمشاد و چنار کھڑے کیا بھلے معلوم ہوتے تھے۔

سرینگر پہنچ کر ہم لوگوں نے ایک ہوس بوٹ میں قیام کیا GUIDES کی ہدایت سے ہم نے چھوٹی چھوٹی وادیوں اور کشمیر کی پہاڑیوں کی سیر کا ارادہ کر لیا۔ ان لوگوں کو ہز ہائینس مہاراجہ آف کشمیر کی گورنمنٹ نے خاص طور پر انگریز سیاحوں کی رہنمائی کے لئے مقرر کر رکھا ہے۔ مگر ہندوستانی انگریزی خواں لوگوں کو بھی ان سے فائدہ اٹھانے میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔

ہم سونمرگ کی وادی میں گئے جہاں صبح کی سرخی پہاڑوں کی چوٹیوں پر مستور برف سے مانند ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ برف سے لدی ہوئی چوٹیاں زجیلہ سے چھوٹا تبت تک چلی گئی ہیں جہاں دریائے سندھ کا غضبناک شور و غل رات کے سکوت کو متواتر توڑتا رہتا ہے۔ جبکہ وہ برف کے تودوں اور بڑی بڑی پتھریلی

چٹانوں کو تہ و بالا کرتا ہوا خوفناک راستے سے پنجاب کو بہتا ہے۔"

ہم ایک دشوار گزار راستے سے امرناتھ کے غار تک پہنچے جہاں ایک برف کے بلوریں تودے نے پانی کے ٹپکنے سے الینا و عجیب کی شکل اختیار کر لی تھی۔ جس کو پوجنے کے لئے باطل پرست لوگ ہر سال مقررہ وقت پر اکٹھے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اسے شو دیوتا کا لنگ بتاتے ہیں۔

ہم گل مرگ گئے۔ جو وادی ہے جنگلی پھولوں کی۔ لیلان مرگ بھی گئے۔ جہاں کنول کے اداس اور پری پیکر پھول میلوں تک کھلے ہوئے عجیب بہار دیتے ہیں۔ ہم اپرّوالٹ پر چڑھے۔ یہ کشمیر کی سب سے بلند چوٹی ہے۔ جسکے اختتام پر ایک نہایت ہی عمدہ شفاف اور بلوریں چشمہ ہے۔

ہم نے گاندربل دیکھا اور ہری پربت بھی۔ شالیمار دیکھا اور نشاط باغ بھی۔ ہم ہر جگہ گئے اور کشمیر کو ہر طرح سے دیکھا۔ دن دن بھر مہینوں تک ہم نہایت ہی خوشگوار اور پرسکون لمحات کی تلاش میں پھرا کئے۔

سوائے اسکے کہ ہم وادی کے ندی نالوں میں اپنی کشتی کے لئے کسی مناسب قیام گاہ کی تلاش میں مارے مارے پھرتے اب ہمارے لئے اور کچھ باقی نہ رہا تھا۔ ڈل میں۔ باغیچوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں۔ غرض جہاں کہیں ہمارے خیالات کو کشش ہوتی ہمارے ملاح نے کشتی کے قلب نما چپو ملا دئے۔ اور ادھر کا رخ کیا

ہمارے ساتھی شاعر کا چچیرا بھائی ایک نہایت ہی معتبر اور معزز آدمی تھا۔ خصوصاً بحیثیت راجہ کا ایک درباری ہونے کے جب اس نے ہم کو ڈل کے ایک الگ تھلگ کونے میں دیکھ لیا۔ پھلوں سے گوشت اور دیگر ہر قسم کی خورد و نوش سے اس نے ہماری خوب آؤ بھگت کی۔ ڈل کے پاس ہی ایک جزیرے میں جو اس کی ملکیت تھا۔ اس نے ہم کو رہائش اختیار کرنے کے لئے کہہ دیا۔ ہم نے بہت عذر ڈھونڈے۔ بہانے کئے۔ یہاں تک بھی کہہ دیا کہ اب تو ہمارا دورہ ختم ہونے کو ہے۔ اور ہم اپنی کشتی میں واپس ہو رہے ہیں۔ لیکن بھلا وہ ہماری باتوں میں کاہے کو آنے لگا تھا

اسے تو یقین تھا کہ راجہ کے درباری ہونے کی حیثیت سے اس کی بات ٹالی نہ جائے گی۔ حالانکہ خود اس نے یہ بات رسمی طور پر ہی کہی تھی چنانچہ وہ ہم سے کہنے لگا۔ بھائی اگر تم میری اس چیز کو قبول نہ کرو گے تو میں خود تمہارے ساتھ تمہاری کشتی میں چلونگا۔ ایک ہی جگہ رہتے رہتے میری طبیعت کچھ اکتا گئی ہے۔ میری مرضی ہے۔ کہ میں کچھ عرصہ کے لئے یہ امیرانہ رہائش چھوڑ دوں۔ اور تم جیسی زندگی بسر کروں۔

ہم نواب ظفر اللہ خاں کے جو اس کا اصلی نام تھا بہت ممنون تھے۔ اس کی نوازشوں اور مہربانیوں کے شرمندۂ احسان تھے اس لئے ہم اس کی اس بات سے بھی انکار نہ کر سکے۔ وہ ہم پیار اور مہربانی دکھاتے ہوئے کہنے لگا۔ "میں اکیلا ہی نہیں۔ بلکہ میرے دو مشفق دوست بھی ہمراہ چلیں گے۔ اور کشتی وغیرہ کا سب خرچ میرے ذمے ہوگا۔"

چنانچہ نواب اور اس کے دونوں ساتھیوں سمیت (جن میں سے ایک تو سوداگر چام تھا۔ اور دوسرا کشمیر ہائیکورٹ کا ایک جج) ہم شام کے وقت روانہ ہوئے۔

شام کا دھندلکا بڑھ رہا تھا۔ دریا دھیمے دھیمے بہہ رہا تھا ہماری کشتی بہے جا رہی تھی۔ ہمارے ملاح۔ اس کی بیوی، بہن اور اس کی ایک چھوٹی لڑکی۔ کسی کو بھی کشتی کھینے میں مدد نہ دینا پڑی۔ ہم لوگ زمین اور آسمان کے بین بین جا رہے تھے۔ جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ نواب اور اسکے دوست خاموش تھے۔ خواب بیداری میں بمشکل ہم اپنے دل کی گہرائیوں تک پہنچے تھے۔ کہ ہمیں کھانے کے لئے کہا گیا۔

نواب نہایت ہی پر تکلف اور عمدہ کھانے لے آیا۔ یہ کھانے اسکے اپنے ملازموں نے تیار کئے تھے۔ زردہ تھا رنگین و خوشبودار، مرغ کے شوربے سے بھی کستوری کی لپٹیں آ رہی تھیں۔ پانی پینے کو پرانے وقتوں کے شاہی پیالے تھے۔

ہمارے الم غلم اور معطر کھانوں کے تناول سے خوش ہو جانے پر نواب نے ہمارے دل بہلاؤ کے لئے کچھ باتیں شروع کیں اس نے ہمیں چند گندی گندی کہانیاں سنائیں۔ وہ کہانیاں

سنا سکیں بہت سی گندی اور فحش گالی گلوچ سے کام لے رہا تھا کسی اور کو نواب کے اس مغلظ کلام سے نفرت ہوئی یا نہ معلوم نہیں کہ انکہ مجھے تو باور جوا سکے کہ میں کوئی متقی و پرہیزگار نہیں۔ ان باتوں سے بہت نفرت ہوئی۔ میں اپنے خیالات کو ستاروں کی دنیا میں لے گیا۔ اور رات کی گہرائی میں کھو گیا۔

علی الصبح ہماری آنکھ کھلی تو ہم نے دیکھا۔ کہ ہماری کشتی رات کی سیاہی سے نکل کر روشنی کے سمندر میں چمک رہی ہے۔ جہاں تک ہماری نظر کام کرتی تھی۔ ہمارے چاروں طرف آب لاجوردی پھیلا نظر آتا تھا۔ بالکل سیماب بیقراں کی مانند پہاڑوں کے طلائی حاشیئے کے بیچوں بیچ۔

نواب نے گانے سے ہماری تواضع کرنا چاہی۔ لیکن اس کی آواز نہایت کرخت اور بھدی سی تھی۔ لے دے کے صرف دو آدمی اس کی داد کے لئے بیٹھے رہے۔ وہ اسکے دو دوست تھے کیونکہ ہم تو کشتی کے مختلف حصوں میں کھانے کی دیکھ بھال اور لباس وغیرہ کی تیاری میں پھر رہے تھے۔ میں پانی کی پر سکون اور مطمئن سطح کو دیکھنے میں محو تھا۔ بالکل مسحور و مفتون۔ میں پانی کی لہروں پر جھکا ہوا تھا۔ جو اپنے ملائم اور ہلکے سروں سے سوتے ہوئے کنول کے پھولوں کو جگا رہی تھیں۔ میں نے کہا کاش میں بھی ان ہی میں سے ایک ہوتا۔ میں نے سر کے بل دریا میں غوطہ لگایا۔ نہا کر اطمینان سے نواب اور اسکے دوستوں کے نغمے سننے لگا۔ یہ لوگ ایک چھتر کے سائے میں بیٹھے گا رہے تھے۔

دس بجے تک ہم جھیل کو پار کر کے بانڈیپور پہنچ گئے۔ یہ ایک بے رونق اور معمولی سا گاؤں ہے۔ عین اس سڑک پر واقع ہے جو گلگت کو جاتی ہے۔ گلگت پر حکومت برطانیہ کا سرزمین ہند میں سب سے آخری قلعہ ہے۔ جس سے آگے ایشیائی صحرا شروع ہو جاتا ہے۔

نواب نے گاؤں کے تحصیلدار کو دس عدد چوزے، پانچ درجن انڈے اور کچھ پھل لانے کو کہا۔ وہ ہمیں گاؤں کے چیدہ چیدہ معزز گھروں میں لئے پھرا۔ ہمیں یقین دلانا چاہتا تھا۔ کہ اسے غریب لوگوں سے نفرت ہے۔ اور وہ لوگ اس کی نظروں میں بالکل حقیر ہیں۔

ہمارا ملاح دوڑتا ہوا ہمارے پاس آیا۔ اور کہنے لگا۔ کہ ہم لوگوں کو دوپہر سے پہلے پہلے جھیل کے درمیانی حصے کو عبور کر لینا چاہیئے۔ کیونکہ اس نے کہا۔ اس جھیل میں دوپہر کو بڑی تیز آندھی چلا کرتی ہے۔ جس سے کشتی کے زیر و زبر ہو جانے کا بہت امکان ہے۔"

نواب نے کشمیری بولی میں اسے کچھ صلواتیں سنا دیں۔ کشمیری زبان بھی عجیب زبان ہے۔ اس میں گالیاں دعا و مناجات سے کہیں زیادہ مؤثر ہوتی ہیں۔

ہم نے بھی ملاح کے نقطۂ خیال کو صحیح گردانتے ہوئے اس کی تائید کی۔ لیکن نواب بھلا کیوں ماننے لگا وہ چلو میں کسی بیگاری کو ملاح کی مدد کے لئے کشتی کھینے کو بلا لونگا۔ . . . چنانچہ نواب نے واپس چلنے میں دیر کر ہی دی۔

کوئی نصف گھنٹہ کے بعد ملاح پھر آیا۔ ہم پہلے ہی نواب کی بہت بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ وجہ یہ تھی۔ کہ نواب کسی جائے نشست و شو کو دیکھنے گیا ہوا تھا۔ نواب کا خیال وہاں پہنچکر بدل گیا۔ اس نے کہا چلو ذرا خط بنوا کر حمام میں غسل بھی کرتا چلوں — بہت دیر کے بعد جب نواب نمودار ہوا۔ تو ملاح کی بار بار اور تاکیدی التجاؤں کے ساتھ ہماری سفارشوں کو بھی اس نے سُن ہی لیا۔ ہم پر بڑی شفقت ظاہر کرتے ہوئے اس نے ایک نوجوان کشمیری کو راہ چلتے روک لیا۔ اس سے کہنے لگا کہ ملاح کے ساتھ کشتی کو کھے کر سرینگر کی طرف لے چلو۔

"لیکن سرینگر تو یہاں سے بیس میل دور ہے سرکار،" اس نوجوان نے کہا۔ "اور میری ماں چونکہ فوت ہو گئی ہے۔ مجھے گھر جانے کی جلدی ہے۔

"بس چپ رہ۔ سؤر کہیں کا۔ تجھے میرے حکم سے انکار کرنے کی بھی جرأت ہو گئی؟"۔ نواب نے گھرکتے ہوئے کہا، "جھوٹا بکواسی"۔

"جی نہیں نواب صاحب"، کشمیری نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "آپ تو اللہ میاں کی طرح بڑے بزرگ اور مہربان ہیں۔

براہ مہربانی مجھے معاف کیجئے میں ابھی ابھی بیس میل پیدل طے کرکے آرہا ہوں۔ پہاڑی علاقہ میں چلتے چلتے میرے پاؤں بھی دکھنے لگے ہیں۔ چچا کے ہاں گھوڑی لینے گیا تھا۔ مجھے کیا معلوم میری ماں مر جائیگی۔ ابھی اسکے جنازے کے لئے ملا کو بھی بلانے جانا ہے۔۔۔"

"چل۔ جلدی کر کشتی پر"۔ نواب نے کڑک کر کہا۔ "نہیں تو تجھے تھانیدار کے ہاتھوں کوڑوں سے پٹوا دونگا۔ جانتا نہیں تو راجہ کے ایک امیر کے کام سے انکار کر رہا ہے۔ ارے تیری اتنی مجال"

"لیکن سرکار۔۔۔۔" نوجوان بڑبڑانے لگا۔ اسکے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

نواب کی گھرکیوں اور گھونسے کے خیال سے وہ رونے لگا۔ بالکل بچوں کی طرح۔ وہ جوان مٹا کٹا آدمی روتے ہوئے کیسا بیہودہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں تو آنسوؤں کا نام نہ تھا۔ بلکہ بلک بلک کر کہہ رہا تھا۔ "ہائے میری اماں ہائے میری اماں"

اس کی آواز کچھ ایسی مصنوعی تھی۔ کہ اس سے کشمیریوں کی خاندانی بزدلی ظاہر ہو رہی تھی۔ اور یہ محض اس وحشیانہ حکومت کا نتیجہ تھا۔ جسکے حاکم یکے بعد دیگرے ان پر ظلم توڑتے آئے تھے۔

نواب کچھ ایسا موٹی چمڑی کا انسان تھا۔ کہ اسے لڑکے کے مجروح دل کا قطعاً بھی احساس نہ ہوا۔ اس نے اس کی بڑی بڑی آنکھوں کو جن میں آنسو نام کو نہ تھے دیکھا۔ اس کی آہ و بکا کو سنا اور کھل کھلا کر ہنس دیا۔

"چلئے نواب صاحب چلیں"، ہم نے کہا "ہم خود ہی ضرورت پڑے پر ملاح کے ساتھ ڈانڈ لگا لیں گے"۔

"ٹھہریئے جی آپ ذرا" نواب نے لڑکے کو بائیں کان سے پکڑ کر کہا۔ اور اسے کشتی کی طرف کھینچ لے گیا۔

بیگاری نے جو محض نواب کی گھرکی سے ہی رونے لگا تھا اب کان کے سانٹے جانے پر زور، زور سے چلانا شروع کر دیا۔ نواب کی ہنسی اب مسکراہٹ میں تبدیل ہو چکی تھی۔

کشمیری لڑکے نے اپنا کان نواب کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ اور شاید اس خیال سے کہ اس نے نواب کے حکم سے انکار کرکے اسکا دل دکھایا ہے۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ ہاتھ جوڑے اور زمین پر ناک سے لکیریں بنانے لگا۔ وہ اپنے گناہ کا کفارہ ادا کر رہا تھا۔

اس پر نواب کی ہنسی حد سے بڑھ گئی۔ اور وہ اس قدر ہنسا کہ اسکے تمام اعضاء کی بناوٹ بدنما معلوم ہونے لگی۔

"دیکھئے تا ذرا"، نواب نے اپنی ہنسی کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اس نے بیگاری کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ جو اب پہلے سے بھی بدتر حالت میں تھا۔ وہ بالکل بچوں کی طرح زمین پر لوٹنے لگا۔ اور نہایت ہی درد بھری آواز سے رونے اور چلانے لگا

"مت رو بیوقوف کے بچے"، نواب نے اپنی پرنم آنکھوں کو دباتے ہوئے کہا۔ اور ملاح کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگا۔ "اٹھا لو اس گنوار کو اور کشتی میں ڈال لو"،

ملاح نے نواب کے حکم کی تعمیل کی۔ نواب کشتی میں سوار ہوا اور ہم بھی اسکے بعد۔ بیگاری نے اب فرض اٹل سمجھ کر کچھ ارادہ کر لیا روتے ہوئے اس نے ہاتھوں کو تھوک کر گیلا کیا۔ اور چپو سنبھال لئے

نواب کی خوشی کی کوئی حد نہ تھی۔ پاگلوں کی طرح ہنس رہا تھا۔ اینٹھتے اور لرزتے ہوئے اسکے دوستوں نے بازوؤں سے پکڑ کر اسے سائبان کے نیچے بیٹھا دیا۔

کشتی روانہ ہوئی۔ چپوؤں نے پانی کو چیرنا شروع کیا بیگاری اچانک ہی روتے روتے چپ ہو گیا۔ بالکل اس طرح جیسے اس نے اچانک ہی رونا شروع کر دیا تھا۔

"دیکھئے"، نواب نے کہا۔ اس کی پاگلانہ ہنسی سے اسکے شکم کو کچھ اس طرح جھٹکا لگا۔ کہ بجلی کی سرعت سے اس کا پیٹ بل کھا گیا "دیکھئے"، اس نے پھر کہا۔ اس کی آنکھوں کا رخ یکدم بدل گیا۔

اس کا چہرہ تمتما کر یکایک نیلگوں ہو گیا۔ اس کا منہ کھل گیا۔ اور گردن بل کھا کر رسی بن گئی۔ دونوں ہاتھ اپنی اپنی جگہ

روانہ ہو گئے۔

ہم لوگ اس کی طرف لپکے۔ اسکے ایک دوست نے اسکے کل پر ہاتھ رکھ دیا۔ دوسرا اس کی پیٹھ ٹھونکنے لگا۔

ایک ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ ہی نواب نے چیخ ماری اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔

کشتی چلی جا رہی تھی۔ ندی کے ساکن پانی پر ہمارے دل بیٹھ گئے۔ ہم بالکل گونگے ہو گئے۔ . . . یہاں تک کہ بیگاری پھر چلانے لگا۔

" ہائے میری اماں۔ ہائے میری اماں "

محمد فاضل

تفاوت

"بندو! ہمارے ہاں بچوں کے لئے روزانہ کتنا دودھ آتا ہے؟"

"چار سیر بیگم صاحبہ!"

"دیکھو! آج شام مسز خان ہمارے ہاں تشریف لا رہی ہیں۔ اُن کے ساتھ دو کتے بھی ہیں۔ اور وہ دودھ اور ڈبل روٹی کے سوا کچھ نہیں کھاتے خالص ولایتی نسل کے ہیں۔ اس لئے اب پانچ سیر دودھ اور چار ڈبل روٹیاں روزانہ اُن کے لئے بھی آیا کریں گی"

"بہت اچھا بیگم صاحبہ!"

"تو اس طرح روزمرہ کا کل کتنا دودھ ہوا؟"

"نو سیر حضور!"

"ہاں ٹھیک ہے۔ یاد رکھنا۔ مسز خان جب واپس جانے لگیں گی، تو ایک دن پہلے میں تمہیں بتا دوں گی۔ ان کے چلے جانے کے بعد پھر روزانہ چار سیر ہی آیا کرے گا"

"بہت اچھا حضور!"

"اور دیکھو بندو! ہم نے بازار سے دریافت کیا ہے۔ یہاں سرینگر میں تمام چیزیں بہت مہنگی ہیں۔ لیکن ہمارا خرچ بہت زیادہ ہے۔ جس قدر ممکن ہو۔ خرچ میں کفایت کیا کرو!"

"میں تو پہلے ہی بہت احتیاط برتتا ہوں بیگم صاحبہ! اگر آپ کہیں اسراف ہوتا دیکھیں۔ تو مجھے بتا دیں"

"نہیں نہیں بندو۔ تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ تم اسراف کر رہے ہو۔ میں نے محض احتیاطاً کہہ دیا۔ دراصل اشیاء اس قدر مہنگی ہو رہی ہیں کہ بہت ہی زیادہ کفایت کی ضرورت ہے۔ مثلاً اگر تم۔ ڈرائیور۔ بہرا اور بچوں کے ماسٹر صاحب چائے بغیر دودھ کے پی لیا کرو تو کیا حرج ہے؟"

"ک . . . . . کچھ . . . . . . نہیں . . . . . ح . . . . . حضور!"

"تو آئندہ تم ایسا ہی کیا کرو اور نو سیر دودھ گرم کر کے کوٹھی میں پہنچا دیا کرو۔ میں خود بچوں اور کتوں میں تقسیم کر دیا کروں گی"

چانگ تاین یی

مترجمہ سراج الدین احمد نظامی

نفرت

پھٹے پرانے کپڑوں والی چھوٹی سی جماعت زرد ریت پر گرتی پڑتی چلی جارہی تھی، مرد آگے آگے تھے۔ عورتیں اور بچے پیچھے پیچھے۔

اُن کی نگاہیں سامنے کی سڑک پر جمی تھیں جو لا انتہا معلوم ہوتی تھیں تین دن اور دو راتوں سے وہ اسی سڑک پر چل رہے تھے۔ سورج کو دیکھ کر انہوں نے معلوم کرلیا تھا کہ وہ صحیح سمت کو جارہے ہیں، مگر سڑک آگے بڑھتی چلی جاتی تھی، ہر مرتبہ جب وہ اُسکے اختتام پر پہنچتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ وہ پھر اُن کے سامنے پھیلتی چلی جارہی ہے، کسی نے کہا: "ہم لیو کے قصبہ میں کب پہنچیں گے۔"

"شاید کل"

گردوغبار کے ڈھیروں نے سڑک کے کنارے ایک زرد جھاگ کی مانند متموج لکیر بنادی تھی۔ سورج کی تیز و تند شعاعیں اُنہیں شعلوں کی طرح جلارہی تھیں، یہ شعاعیں بھی زمین سے اُٹھنے والی زردگرد کے لباس میں ملبوس تھیں؛ تاہم انہیں بڑی بے رحمی سے جلارہی تھیں، مسافروں کے جسموں کی رنگت گہرے بھورے رنگ کی ہوگئی تھی، اور جلنے کی بُو بھی آرہی تھی، کسی نے کہا: "کیا ہمیں لیو کے قصبہ میں کچھ کھانے کو ملجائیگا!"

"کون ہمیں کھانے کو کچھ دیگا!"

ایک شکایت سے لبریز بھرائی ہوئی آواز آئی: "کاش میں مرجاؤں — جلد — ابھی! زندگی عذاب کے سوا کچھ نہیں!"

عورتیں ایک دوسری سے سرگوشیاں کرنے لگیں: "باپو ہائی پھوٹ رہا ہے،"

باپو ہائی نے بھرائی ہوئی آواز میں شکایت کی: "میں تنہا ہوں — بالکل تنہا!"

جب سے اُس کی بیٹی تینول مری تھی، وہ ہمیشہ روتا رہتا تھا۔ اور کہتا تھا: "اگر میں کسی کو پکڑ لوں — لعنت! اگر کوئی سپاہی میرے ہتھے چڑھ جائے — تینول۔ میری تینول!"

بچوں نے اُسے غصہ میں دیکھ کر ہنسنا چاہا، لیکن اُن کی ہنسی اُن کے گلے میں ہی مرگئی، مرد بالکل خاموش رہے، یہی تھے جنہوں نے چند دن ہوتے باپو ہائی کو اُس کی بیٹی تینول لا کے دی تھی؛ اُس کا عریاں جسم نیلا کالا ہوگیا تھا۔ اور سوجا ہوا تھا؛ اُس کی رانیں خون آلودہ تھیں، وہ تشنج کے باعث مرگئی تھی۔

مرد اپنی بیویوں کو یاد کرنے لگے؛ جنہیں وہ ہمیشہ کے لئے کھو چکے تھے۔ اور اُن کے چہرے سیاہ پڑ گئے، کیا یہ تپش کے سبب سے تھا۔ کہ اُن کے دل تیزی سے دھڑک رہے تھے اور اُن کے گھٹنے کانپ رہے تھے! وہ بالکل نہ جانتے تھے، وہ دانت پیسنے لگے۔

زمین سے ایک عجیب سی بُو اُٹھی، بارود کی بُو کی طرح یا ایک سڑی ہوئی لاش کی طرح! لیکن وہاں کچھ نظر نہ آتا تھا، سورج کی گرمی سے افق پر دھواں سا اٹھ رہا تھا جو بڑے آرام سے کانپتا معلوم ہوتا تھا یا یوں دکھائی دیتا تھا۔ کہ گرمی کے باعث اس میں سے آگ پر لٹکنے والے ایک بڑے سے پکوان کے کناروں کی طرح چھوٹے چھوٹے حلقے اُٹھ رہے ہیں۔

سب خاموش تھے۔ صرف ریت پر ان کے قدموں کے گھسٹنے کی آواز آرہی تھی۔ ریت دریا کے کنارے کی کائی کی طرح از حد ملائم تھی۔ جونہی وہ قدم اٹھاتے ریت میں دھنس جاتا۔ وہ

بڑی کوشش سے کھینچ کر باہر نکالتے۔ اچانک ایک بچے نے کہا "کسی کے رونے کی آواز آ رہی ہے"۔

"بے وقوف" اس کی ماں نے کہا۔ لیکن اس کی آواز میں تشویش کا اظہار تھا۔

عورتیں بھوتوں سے ڈرتی تھیں۔ وہ اس دنیا میں تنہا تھیں۔ گرد و غبار نے زمین و آسمان کو ڈھانپ رکھا تھا۔ شعلہ زا آفتاب اور گرد و غبار کے سوا وہاں کچھ نہ تھا۔ سوائے ان کے اور کوئی ذی نفس کہیں نظر نہ آتا تھا۔

"کیسی آواز۔ اس جگہ ابھی تک کون زندہ رہ سکتا ہے"

لیکن بچے کی تسلی نہ ہوئی۔ اس نے ایک مختصر سی خاموشی کے بعد پھر آہستہ سے کہا۔ "میں نے سچ کہا ہے"

ہاں یہ سچ تھا۔ کوئی شخص کسی جگہ کراہ رہا تھا۔

"بھوت روزِ روشن میں باہر نکل رہے ہیں"

عورتوں کی کمر میں ایک کپکپی دوڑ گئی۔

"میرے — میرے۔ میں تمہاری منت کرتا ہوں"

"کون ہے" مردوں نے ہر طرف دیکھنا شروع کیا۔ پھر کہنے لگے "یہ رہا!"

وہ مٹی کے ایک چھوٹے سے ٹیلے پر چڑھے۔ ایک آدمی ایک چھوٹے سے درخت کے نیچے لیٹا تھا۔ اُسکے جسم کا اوپر کا حصہ عریاں تھا۔ اُس کا پاجامہ پھٹا ہوا تھا اور سارا جسم بالکل سیاہ ہو چکا تھا۔ اس نے تکلیف سے بولتے ہوئے کہا۔ "مجھے مار ڈالو۔ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ میں برداشت نہیں کر سکتا"

"تمہیں کون مارنا چاہتا ہے؟"

"مجھے مار ڈالو۔ میں تمہاری منت کرتا ہوں۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا — میں۔ یہ —"

تب وہ جان گئے کہ اس آدمی کا جسم سیاہ کیوں تھا۔ اور ان کا رواں رواں کانپنے لگا۔ اس کی پشت اور چھاتی تلوار کے زخموں سے بھرپور تھی۔ اور ہزاروں چیونٹیاں ان زخموں میں جمع ہو گئی تھیں۔ اور کچے گوشت کو کاٹ رہی تھیں۔ وہ اتنی زیادہ تھیں۔ کہ زخموں کی گہرائی معلوم نہ ہو سکتی تھی۔ وہ سینکڑوں کی تعداد میں اسکے جسم پر ادھر ادھر دوڑتی پھرتی تھیں۔ ایک دوسری سے اپنے لرزاں محالوں کے ساتھ باتیں کرتی آگے بڑھ جاتیں

یہ چیونٹیاں اپنے مورچہ میں سے جو ایک درخت کی جڑ میں تھا، لمبی لمبی قطاروں میں آگے بڑھتیں۔ گہرے زخموں تک پہنچتیں اور جگہ حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے لڑتی پھرتی تھیں یا ایک زخم سے دوسری کی طرف چل دیتی تھیں۔ لیکن وہاں جگہ حاصل کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ہر جگہ بھری تھی۔ انہوں نے اس آدمی کے جسم کو ایک حبشی کی طرح سیاہ کر دیا تھا۔

وہ آدمی ابھی مرا نہیں تھا۔ چیونٹیاں اسے زندہ کھا رہی تھیں۔ وہ کہنے لگا۔ "مجھ پر رحم کرو۔ میں برداشت نہیں کر سکتا — نہیں کر سکتا — میں — "

وہ بڑی مشکل سے سانس لیتا ہوا کراہتا گیا۔ لوگوں نے یہ جانے بغیر کہ اب کیا کریں۔ اس کی طرف دیکھا۔ ان کا رواں رواں کانپ اٹھا۔ انہیں ایسا معلوم ہوا۔ کہ چیونٹیوں کے لشکر ان کے سروں اور دلوں میں گھس رہے ہیں۔

"تم کون ہو؟" ان میں سے ایک نے ہکلاتے ہوئے پوچھا لیکن اتنا کہتے ہی اسے اپنا سوال احمقانہ معلوم ہونے لگا۔

اس آدمی نے کراہ کر مچھر کی بھنبھناہٹ کی طرح کمزور آواز میں جواب دیا۔ "ایک بیگاری، اُنہوں نے مجھ سے زبردستی کام لیا ہے —"

ان میں سے ایک دلیر آدمی نے اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے بیگاری کے جسم پر پھونک ماری۔ دوسرے آدمی بھی اُسکے ساتھ مل کر پھونکنے لگے۔ چیونٹیاں بے ترتیبی سے منتشر ہو گئیں۔ بیگاری کے جسم پر چیونٹیوں کی سیاہ لکیریں سی بن گئیں۔ اور ادھر سے ادھر لڑھکنے لگیں۔ جیسے شفاف پانی میں سیاہی! ہزاروں چیونٹیاں باہر آ گئیں۔ بعض نے اپنے تئیں زخموں میں گاڑ دیا۔ اور بعض خون کے ساتھ چمٹی رہیں۔

اس آدمی نے سانس کے لئے جد و جہد کرتے ہوئے

بڑی مشکل سے اپنی داستان سنائی۔ وہ بیگار میں پکڑ لیا گیا تھا ایک دن وہ تھکان سے چور ہوکر کام نہ کر سکا۔ وہ اُسے کوڑے مارنے لگے۔ اور جب اس نے اپنی جان بچانے کی کوشش کی۔ تو اُنہوں نے تلوار سے اس کی پشت اور چھاتی پر سات آٹھ زخم لگا دئے۔ اب وہ تین دن سے اس جگہ پڑا تھا۔ شاید چار دن سے اسے اب ٹھیک ٹھیک یاد نہ رہا تھا۔ جب وہ اپنی داستان سنا چکا۔ تو ایک مرتبہ پھر منت کرکے کہنے لگا۔

"مجھ پر رحم کھاؤ اور جتنی جلدی ہو سکے۔ میری بدنصیب زندگی کو ختم کردو"

وہ انہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں اُٹھ نہ سکتی تھیں۔ بچے قریب آ گئے۔ اور ادھر اُدھر بھاگنے والی چیونٹیوں کو پاؤں تلے روندنے لگے۔ عورتیں بھی ایک لمحہ کے لئے اس کے گرد جمع ہو گئیں۔ لیکن جب اُنہوں نے اس کی حالت دیکھی۔ تو دیوانوں کی طرح چیخنے لگیں۔ اور ایک ہاتھ سے چہرہ ڈھانپ کر دوسرے سے اپنے بچوں کو کھینچکر پرے لے گئیں

مردوں نے جلد جلد اُس مرنے والے آدمی کے زخم دھوئے خون ملا ہوا پانی زرد زمین پر گرنے لگا۔ ایک نے کہا۔ "اسے ٹیلے سے نیچے لے چلنا چاہیئے"۔

اسکے سوا وہ اور کچھ نہ کر سکتے تھے۔ کہ اُسے اٹھا کر اپنے ساتھ اپنے نہ ختم ہونے والے سفر پر چل پڑیں۔ اُنہوں نے نگاہ دوڑا کر اپنے سامنے لا انتہا سڑک، زرد آسمان، جھلس دینے والے آفتاب کے نیچے جلتی ہوئی زمین اور تپتے ہوئے افق کو دیکھا، اس دنیا میں صرف وہی جاندار ہستیاں تھیں، اور نہ کوئی انسان موجود تھا۔ نہ کتا نہ کوئی پرندہ! کیا وہ اس بدنصیب کو بھی اپنے ساتھ لے کر چل پڑیں!

زخمی آدمی نے اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لئے اُن کی منت کرتے ہوئے کہا۔ "مجھ پر رحم کھاؤ —— میرے ہم وطنو —— اسے ختم —— "

لیکن اب وہ اُسے اُس چھوٹے سے ٹیلے سے نیچے اُتار چکے تھے، ایک شخص نے کہا: "اُس کی مصیبت ہماری مصیبتوں سے زیادہ ہے، وہ ہمارا ہموطن ہے۔ میرے بھائی ہم اکٹھے جئیں گے اور اکٹھے ہی مریں گے"

یہ سنکر ایک نے اپنا لبادہ بیگاری کا جسم ڈھانپنے کے لئے اُتار دیا، لیکن وہ پسینہ میں بھیگا ہوا تھا۔ اس لئے اُس نے زخموں کے درد کو اور شدید بنا دیا۔ اُس نے اُسے لینے سے انکار کر دیا۔

بعض عورتوں کو اُن کے شوہر یاد آ گئے، جو اُس کی طرح بیگار میں پکڑے گئے تھے۔ اور جن کی آج تک کوئی خبر نہ آئی تھی، وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے اور کوسنے دینے لگیں؛ مردوں پر ایک خاموش غضب نے قبضہ کر لیا، اُنہوں نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں، اگر اُس وقت کوئی سپاہی اُس راستہ سے گزرتا۔ خواہ وہ بندوق یا تلوار سے مسلح کیوں نہ ہوتا، تو وہ اُس پر ٹوٹ پڑتے، اُس کی گردن مروڑ دیتے، اور ازحد بے رحمی سے اُسے کاٹ کے رکھ دیتے۔

ایک پُرغم خاموشی چھا گئی، لوگ مرنے والے بیگاری کے گرد جمع ہو کر، منہ سے کوئی لفظ نکالے بغیر اُسے بغور دیکھتے رہے، اُس نے منہ سے آہ تک نہ نکالی، عورتوں نے سانس روک لی۔ بچے یہ دیکھ کر کہ کوئی خاص بات ہونے والی ہے، پنجوں کے بل کھڑے ہو گئے، اور اپنے والدین کے حلقے کے اوپر سے جھانکنے کی کوشش کرنے لگے، مگر وہ کچھ نہ دیکھ سکے۔

اُس بیگاری کے ہونٹ آہستہ آہستہ سفید ہونے لگے

معاً بابو آئی نے ایک خوفناک چہرہ بنا کر بھرائی ہوئی آواز میں چلا کر کہا، "اُسے دیکھو! یہ گئے —— یہ گئے۔ اسے دیکھو! خدا کے لئے۔ اگر کوئی سپاہی ہمارے ہاتھ لگ جائے —— میری تینول!

کوئی بھی اُس کی طرف متوجہ معلوم نہ ہوتا تھا، لیکن اپنے دلوں میں وہ کہہ رہے تھے۔ کہ نہ صرف یہ بیگاری؛ نہ صرف اُس کی تینول، بلکہ وہ سب کچھ جو ہمارا ہے۔ ہمارے بیٹے ہماری بیویاں، ہماری بہو بیٹیاں۔ ہمارا گھر بار، ہماری زمینیں —— سب کے سب اُس کی تینول کی طرح تباہ ہو چکے ہیں اس بیگاری کی طرح ——

اور اُن میں سے ہر ایک اپنے دل میں کہنے لگا۔۔ اگر کوئی سپاہی ہمارے ہاتھ لگ جائے ---"

اُس لمحہ، اگر اُن کی قوت مشاہدہ گرد کی وجہ سے کمزور نہ ہو گئی ہوتی، تو وہ ضرور اُس چیز کو دیکھ لیتے۔ جو تین سیاہ لکڑیوں کی طرح اُن کی طرف آ رہی تھی، سڑک اُن کے سامنے ڈھلوان تھی، تین سیاہ لکڑیاں مشکل سے اوپر چڑھتی آ رہی تھیں، یہ تینوں سپاہی تھے۔ جن کی وردیاں خستہ حال اور پھٹی ہوئی تھیں۔

گرد، جو ہوا سے بخارات کی طرح اُڑتی تھی، ایک لٹو کی طرح گھومتی ہوئی ان تینوں سپاہیوں کے سامنے سے گزر گئی، پہلے اُس نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے کر چھپا دیا، پھر ظاہر کر دیا، اور اس سارے عرصہ میں وہ نزدیک ہوتے گئے۔

درمیان والے سپاہی کی، جو دوسرے دو کا سہارا لے کر چل رہا تھا، ایک ٹانگ زخمی تھی۔ اُن دونوں میں سے ایک دبلا پتلا اور سوکھے سڑے خدوخال والا تھا۔ اور دوسرے کا چہرہ اور ہونٹ متورم تھے۔ متورم چہرے والے نے اُداسی سے اپنے سامنے نگاہ دوڑائی اور اچانک رک کر چلایا۔ "شہری!" دوسرے دو خوف سے ششدر ہو کر کہنے لگے، "ہماری خیر نہیں!"

وہ خوب جانتے تھے۔ کہ شہری اُن کا کس قسم کا خیر مقدم کریں گے، مگر وہ بھاگ کر جائیں کہاں! واپس لوٹنا ناممکن تھا، ایک دن اور دو راتوں سے وہ روٹی کا ٹکڑہ کھائے یا پانی کا قطرہ پیئے بغیر صرف اپنے ہونٹوں کا پسینہ چاٹتے، اس زرد ریت اور اس سڑک پر گرتے پڑتے چل رہے تھے، وہ کہنے لگے "لعنت! کاش ہمارے پاس ہماری مشین گن ہوتی۔ ہم انہیں بتا دیتے کہ ہم ایسے کمینوں کی کیا پرواہ کرتے ہیں!"

وہ شکست خوردہ تھے! اُن کی جماعت منتشر ہو چکی تھی اور وہ مشین گن جس کی وہ تمنا کر رہے تھے۔ اب دشمن کے قبضہ میں تھی، دبلے سپاہی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "مقدر! دشمن بھی ہم سے نفرت کرتا ہے۔ اور لوگ بھی نفرت کرتے ہیں!

آخرکار، پھٹے پرانے کپڑوں والے گروہ میں سے، جیسے وہ اب نزدیک آتے جا رہے تھے، ایک نے اُنہیں دیکھ لیا، وہ چلایا

"سپاہی! وہ دیکھو!"

سب نے ایک ساتھ سر ایسے پھرائے، جیسے کوئی فوج اپنے سردار کے حکم پر حرکت کرتی ہے۔

تب، پلک جھپکنے میں، وہ سب دیوانہ وار دوڑتے ہوئے سپاہیوں کی طرف بڑھے۔ ایک نوجوان سب سے پہلے اُن کے قریب پہنچ گیا، پھسلا اور گر پڑا۔ لیکن جونہی وہ لڑھکا اُس نے دبلے سپاہی کی ٹانگ کو مضبوطی سے پکڑ کر نیچے گرا لیا۔ اور گوشت نوچ لینے کی غرض سے اُسکے کاندھے پر کاٹا، دونوں کے دانت بُھرے گڑ گئے۔ اور تقریباً ہڈی کو چھونے لگے، دبلے سپاہی نے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی؛ لیکن اُس کا جسم اُسکے آہنی بازوؤں میں بُری طرح جکڑا ہوا تھا۔ اُسکے لئے سر پھیرنا یا جواب میں کاٹنا ناممکن تھا، متورم چہرے والا اور زخمی ٹانگ والا سپاہی زمین پر گرد میں پڑے تھے۔ اور اُن پر گھونسوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔

"ان کی کھال کھینچ دو!"

"انہیں مار مار کر ختم کر دو!"

اُن میں سے ایک نے اپنی گرفت ذرا ڈھیلی کی اور چلایا "انہیں مارنے کی زحمت نہ اُٹھاؤ۔ انہیں زندہ دفن کر دو!"

سب مڑ کر اُس کی طرف دیکھنے لگے، گھونسوں کی بوچھاڑ ایک لمحہ کے لئے رک گئی۔

گروہ سے دور، بابو ہاتی نے غمگین آواز میں کہا۔ "انہیں مار ڈالو --- ان نجس کتوں کو --- انہیں مار ڈالو۔ اور ان کا گوشت کھا جاؤ، ان پر لعنت۔ انہیں مار ڈالو --"

یہ خیال سب کو پسند آیا، وہ چلائے۔ "ہاں، ہاں! آخر ہمیں عمدہ گوشت مل گیا! اور سستا بھی!" اُن کی آوازوں سے کسی قسم کی مسرت نہ ٹپکتی تھی۔ صرف خوفناک غصہ ظاہر ہوتا تھا۔

زخمی ٹانگ والے نے اپنا سر زمین کے ساتھ لگا دیا، اُسکے جبڑے کھنچنے لگے۔ زرد دانتوں کی دو قطاریں باہر نکل آئیں، گویا اُسکے منہ سے جدا ہو گئی ہوں، ریت کے ذرے تازہ بھنے ہوئے گرم دانوں کی طرح، زبردستی اُسکے منہ میں گھس گئے۔ اُس نے ایک مدہم آواز میں کہا۔ "بھائی پہلے مجھے مارو،"

اُن میں سے ایک نے وحشیانہ لہجہ میں کہا: "ہم اسے پہلے کیوں ماریں!"

زخمی سپاہی نے جس کا جوڑ جوڑ کانپ رہا تھا، بڑی کوشش سے جواب دیا۔ "میں مر رہا ہوں — میں — "

"ہم تمہیں یوں نہ مارینگے، ہم تمہیں عذاب دیکر مارینگے" ہم تمہیں عذاب دیکر ماریں گے — ہاں، تم پر لعنت! وہ سب جرائم جو تم نے —— "

"اُنہوں نے بیگناہوں کو لوٹا ہے!"

"ان کی تلاشی لو!"

لیکن ان تینوں بدبختوں کے پاس سے کچھ نہ نکلا، ہاں صرف پانسوں کی ایک جوڑی ملی۔ جو متورم چہرے والے سپاہی کی جیب میں تھی۔

"ان کی جرابیں دیکھو — ان کی جرابیں!"

وہ جانتے تھے۔ کہ جب سپاہی ہار جاتے ہیں۔ تو وہ اکثر بنک کے نوٹ اپنی جرابوں میں چھپا لیتے ہیں۔

جرابیں اُن کی ٹانگوں سے چمٹی تھیں، اُنہوں نے بڑی بے دردی سے اُنہیں کھینچا۔ اور کھال جرابوں کے ساتھ اترتی چلی آئی، متورم چہرہ والے نے آہستہ سے کہا، "اب تو تم نے دیکھ لیا۔ کہ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں"

بچوں نے، جواب نزدیک آ گئے تھے؛ ریت اٹھا کر اُن سپاہیوں پر پھینکی، اُنہوں نے سر پھرا کر بچنے کی کوشش کی، بچے ہنس پڑے، اُن کی ہنسی بھی کرخت اور بے کیف تھی، ریت سپاہیوں کے کانوں، نتھنوں اور منہ میں گھس گئی، بچوں کے والدین بھی ہنس پڑے اور کہنے لگے۔ "بجس کتے! — اب ان کی اکڑ فوں کہاں گئی!"

"دیکھنا خیال رکھنا، کہیں بھاگ نہ جائیں!"

"فکر نہ کرو"

"کتے، آج تک ان کے دن اچھی طرح بسر ہوتے رہے ہیں، مگر اب —"

"عورتوں کو بھی انہیں پیٹنا چاہیئے، عورتوں کو مت بھولو"

"ٹھیک ہے، اُنہیں ادھر لاؤ، عورتوں کو بھی ظاہر کرنے دو کہ وہ کیا محسوس کرتی ہیں"

"انہیں لاؤ!"

"مجھے ذرا مدد دو!"

وہ زور آزمائی کرتے اُنہیں گھسیٹ کر تباہ شدہ معبد میں لے گئے، زخمی سپاہی بیہوش ہونے کے قریب تھا۔ اُس کا منہ کھلا تھا، اُسکی آنکھیں نیم وا تھیں۔ اور اُس نے اپنے تئیں ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔ متورم چہرہ والے کی آنکھوں میں خوف اور افسوس تھا۔ کیا وہ پانی کی ایک بوند چکھے بغیر اور خشک روٹی کا چھوٹا سا ٹکڑہ کھائے بغیر مر جائینگے۔ اُنہوں نے بہت مصیبت جھیلی تھی۔ وہ جنگ سے کیوں بھاگے، یہ نہ ختم ہونے والا راستہ کیوں اختیار کیا۔ بھوک پیاس کی تکلیف کیوں اٹھائی، سوائے اسکے کہ زندہ رہیں۔ اور اب — لعنت — ہم مر گئے!

وہ خوب جانتے تھے۔ کہ شہری اور دیہاتی اُنہیں کیا سمجھتے تھے، وہ جانتے تھے۔ کہ ان میں کسی سے دوچار ہونا تباہ ہونے کے مترادف ہے، لیکن یہ بات اُن کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ کہ لوگوں کے دلوں میں اُن کے خلاف اتنی وحشیانہ نفرت کیوں ہے، اُنہوں نے خود بڑے مصائب برداشت کئے تھے اس لئے وہ اُن تکالیف کو بھول گئے تھے۔ جو اُنہوں نے دوسروں کو پہنچائی تھیں، وہ اکثر بھوکے رہے تھے، انہوں نے مدت سے کسی عورت کی صورت تک نہ دیکھی تھی، وہ محاذِ جنگ پر ہر قسم کے خطرات کا سامنا کرتے رہے تھے، وہ توپوں کی دندناہٹ اور سنگینوں کے حملوں کے درمیان سینہ سپر ہو کر لڑے تھے،

جہاں سے اگر وہ بھاگنے کی کوشش کرتے۔ تو بے رحمی سے اُسی وقت گولی سے اڑا دیئے جاتے! اس وقت اُن کے خیالات اپنے خاندان، اپنے والدین اور اپنے بیوی بچوں پر جمے تھے، لیکن یہ لوگ اُن کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے!

متورم چہرہ والے سپاہی نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا: پہلے زخمی ٹانگ والے کی طرف اور پھر سوجے رخساروں والے کی طرف، موخرالذکر کا چہرہ گھونسوں سے نیلا پڑ گیا تھا۔ اُس کی پیشانی سے خون بہہ کر اُس کی آنکھیں مارے خوف کے پھول گئی تھیں۔ کتنی عجیب بات ہے! محاذِ جنگ پر وہ کبھی اتنا خوفزدہ نہ ہوا تھا! مشین گن صرف محاذِ جنگ پر ہی اُنکے پاس تھی، وہ کہنے لگا۔ "کتنی بدنصیبی ہے۔ ہماری مشین گنیں ہمارے پاس ہوتیں۔ تو کون ہمیں چھیڑنے کی جرأت کرتا! وہ گھٹنے ٹیک کر اپنا سب کچھ ہمارے حوالے کر دیتے، اور یہ عورتیں — لعنت!"

"کھیل ختم ہو چکا ہے، خنزیر کے بچے! ان باتوں سے کیا فائدہ"

زمین سے بخارات اُٹھ رہے تھے، اُن کے سر اور ٹانگیں زرد ریت پر گھسٹنے کی وجہ سے زخمی ہو گئی تھیں، اور اُن کی خاکستری پتلونیں خون آلودہ ہو گئی تھیں؛ ایک عورت چلائی۔ "انہیں زندہ دفن کر دو! اُنہوں نے بہت خباثت کی ہے — بہت ہی —"

عورتوں کو اپنے خاوند اور بچے یاد آ گئے، وہ ان تینوں سپاہیوں کو اپنے ہاتھوں سے توڑنا مروڑنا چاہتی تھیں، اُنہیں کاٹنا اور اُن کی ہڈیاں توڑ دینا چاہتی تھیں۔ لیکن جب وہ اُن کے سامنے ہوئیں۔ تو خاموش کھڑی ہو کر بے بسی سے رو دیں

"انہیں زندہ دفن کر دو!"

تینوں قیدیوں نے تپتی ہوئی زمین کی طرف دیکھا، وہ بھوک اور پیاس سے دم توڑتے ہوئے زندہ دفن کر دیئے جائیں گے، اُنہوں نے اپنے ہونٹوں پر سے نمکین پسینہ چاٹا، دبلے سپاہی نے منت کرتے ہوئے کہا، جس طرح کوئی خدا کے سامنے گڑگڑاتا ہو۔ "مجھے تھوڑا سا پانی دو، پہلے مجھے پانی دو۔ اور بعد میں دفن کر دو —"

بوڑھے نے ایک دیوانے کی طرح کہا۔ "پانی! پانی! کتے! تمہیں پانی دوں!"

"میں تیرا بھرتا بناؤنگا؛ میں تمہیں مار ڈالونگا!"

"تم پر لعنت! تمہاری تینوں — وہ —"

یہ کہہ کر وہ اسیر پر پڑا، اور اپنا نرسل کی طرح دبلا پتلا بازو اٹھا کر، متورم چہرہ والے کے رخسار پر گھونسہ دے مارا، اُسکے رخسار پر ایک سرمئی نیلا نشان پڑ گیا؛ بوڑھے نے اُس پر تھوک دیا۔ اور تھوک ایک کیڑے کی طرح نیلے نشان پر سے نیچے بہنے لگی۔

سپاہی نے آزاد ہونے کی کوشش کی۔ لیکن نوجوانوں نے اُسے مضبوطی سے تھامے رکھا۔

"تمام سپاہی کمینے ہیں،" ایک بڑھیا نے کہا۔ جو اُن کے پیچھے زمین پر بیٹھی تھی؛ اور جسکے منہ کے کونوں میں کف تھا۔ "تمام سپاہی —"

دبلے سپاہی نے اپنا سر پھرا کر اُس عورت کی طرف دیکھنے کی کوشش کی، لیکن اُسکے سر نے اُس کا کہنا نہ مانا، زخمی سپاہی نے جس کی آنکھیں نیم وا اور چہرہ کھنچا تھا، لرزاں آواز میں کہا "مجھے مار ڈالو بجائے اسکے کہ تم — میرے ہموطنو مجھے مار ڈالو —"

ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے بھی اُس کی بات نہیں سُنی، اُس نے ایک مدھم آواز میں پھر کہا۔ "میرے ہموطنو، میرے ہموطنو، مجھے مار ڈالو، جتنی جلدی تم سے ہو سکے۔ جلد —"

بابو ہائی نے منہ میں جھاگ اور رال بھرے ہوئے کہا "تم اتنی آسانی سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے!"

زخمی آدمی نے بڑی کوشش سے اپنی آنکھیں کھولیں۔ تاکہ وہ اُن میں سے کسی کے آگے منت کر سکے، لیکن اُسے جتنے چہرے نظر آئے۔ سب وحشیانہ دکھائی دیتے، وہ ایک لمحہ کے لئے خاموش رہا، پھر آنکھیں بند کر لیں، پھر بڑی جرأت کر کے پوری طاقت سے چلایا۔ "میرے ہموطنو، ہم اس وقت کہاں ہیں! — میری ماں سے کہنا۔ کہ وہ روئے نہیں — میری بوڑھی

ماں ہے — وہ ابھی تک نہیں جانتی — اُسے کہنا کہ میرا خیال نہ کرے —"

وہ سیاہ ہاتھ جس نے اُسے پکڑ رکھا تھا، کانپنے لگا۔

"کیا یہ ہو سکتا ہے۔ کہ ان کی بھی مائیں ہیں۔ اور مصیبت سے خوفزدہ ہیں۔ یہ بد نصیب! یہ آدمی جو —"

"جتنی جلدی تم سے ہو سکے جتنی جلدی۔ میرے ہم وطنو دوسری دنیا میں — میں —"

اُن میں سے ایک نے اُسکے منہ پر تھوک کر کہا۔ دوسری دنیا۔ تم جو اپنا وقت قتل و غارت میں گزارتے رہے۔ تم جو ہاتھ میں رائفل لئے ہر جگہ لوٹ مچاتے رہے، تم جو جنگلوں میں امیر کبیر بن گئے!،،

دبلے سپاہی نے مشکل سے سر پھیر کر بایو ہائی کا چہرہ دیکھا، اُسکے ابھرے ہوئے رخساروں کی ہڈیاں دیکھیں جنہیں دیکھ کر اُسے اونٹ کا کوہان یاد آگیا، وہ ریت جو اُسکے نتھنوں میں تھی۔ اب اُسکے چہرہ کی لکیروں میں چلی گئی تھی۔ اور اُسکے ہونٹوں پر جم گئی تھی؛ اُس کی آنکھیں ایک مردہ مچھلی کی آنکھوں کی مانند چڑھی تھیں — ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ ان دو دشمنوں کو چیرنا پھاڑنا چاہتا ہے۔ دبلے آدمی نے دل سے کہا۔ یہ کیا کہ رہا ہے! کون امیر کبیر بن گیا ہے! ہم پر کئی مصائب ٹوٹے ہیں۔ ہماری مصیبتیں ان سے زیادہ ہیں، بھوک اور پیاس کی تکلیف! یہ لوگ اپنے غصہ کو ہم پر نکالنے کی کوشش کیوں کرتے ہیں! ،، وہ رو دیا اور کہنے لگا ،، لعنت! کیا یہ ہمارا قصور ہے۔ کہ جنگ چھڑی! کیا ہم اسکے خواہشمند تھے۔ ہمیں کون سی دولت مل گئی ہے!

"اور تم بڑے معصوم ہو، وہ تمہیں معصوم ہی تو بناتے ہیں"

،، یہ جرنیل ہیں جنہیں ہر چیز پر اختیار ہے۔ باقی رہے ہم — تو ہم —"

عورتیں چلائیں ،، اس کی باتیں نہ سنو، اُنہوں نے ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم کیا ہے، تمام سپاہی کمینے ہیں!

،، ہم مجبور ہیں، جرنیل ہمیں دوسروں کو قتل کرنے کا حکم دیتا ہے اور ہم — ہم —"

"اس کی باتیں نہ سنو!"

"ہم کیا کر سکتے ہیں! ہم تو —"

وہ خود بھی کسان تھے، انہیں بھی کبھی سپاہیوں سے اتنی ہی نفرت تھی، اُنہوں نے بھی اپنے گاؤں کے کھیت چھوڑے تھے۔ کیونکہ وہ دائمی بھوک برداشت نہ کر سکتے تھے؛ شاید اس وقت اُن کے والدین بھی اس زمین اور آسمان کے درمیان آوارہ پھر رہے تھے، اس چھوٹے سے پھٹے پرانے کپڑوں والی جماعت کی طرح، شاید اُن کے والدین بھی سپاہیوں سے نفرت کرتے تھے۔ اور اگر انہیں مل جاتے تو انہیں زندہ دفن کر دینا یا چیر پھاڑ دینا چاہتے کہ وہ اپنی دنیا سے راندے ہوئے ہیں۔ شاید اُن کے والدین اب انہیں اپنا بیٹا نہ بنائیں، اُن کے بھائی اور بہنیں انہیں اپنا بھائی نہ جانیں اور اُن کی بیویاں اُنہیں اپنا شوہر نہ سمجھیں، اُن کے تمام دوست منتشر ہو چکے تھے۔ اور ان تینوں کو اس جلتی ہوئی دنیا میں تنہا چھوڑ گئے تھے۔

"ہم نہیں — ہم —"

دبلے سپاہی کے چہرہ پر ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے

"ہیں! وہ رو رہا ہے!"

بچے حیران رہ گئے، یہ کیا! وہ رو رہے تھے۔ وہ خون اور لوہے کے بنے ہوئے انسان!

اُس دیوزاد آدمی نے، جس نے دبلے سپاہی کو پکڑ رکھا تھا، اپنی گرفت آہستہ آہستہ ڈھیلی کر دی، پسینہ کے قطرے اُس کی پیشانی سے اُسکے قیدی کے شانوں پر گرنے لگے۔

گرد، جس نے آسمان کو دھندلا کر دیا تھا، اور زیادہ ہو گئی۔ زرد آفتاب فرفری ہو گیا۔ اور جب گرم ریتلی ہوا اُن کے گرد چکر لگانے لگی۔ تو اُنہوں نے محسوس کیا۔ کہ اُن کا دم گھٹا جا رہا ہے، متورم چہرہ والے سپاہی نے آہستہ سے کہا۔ ،، جنگ کون چاہتا ہے۔ سپاہی بھی کسی کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں اور اُن کی بھی مائیں ہیں — ہمارے گاؤں میں —"

"تم کہاں کے رہنے والے ہو!"

"مارتن کے قصبہ کے۔"

"اور تم"

متورم چہرہ والے آدمی نے دونوں کی طرف سے جواب دیا۔

"یہ دونوں چیتو کے گاؤں کے رہنے والے ہیں"

"سپاہی بننے سے پہلے تم کیا کرتے تھے!"

اُس نے افسوس کے ساتھ کہا۔ "ہم کھیتی باڑی کرتے تھے، ہمارے گاؤں کے سب لوگ"

"خاموش!"

"کھیتی باڑی کرتے تھے! لیکن تم نے ایک سپاہی کا لعنتی پیشہ کیوں اختیار کیا! تمہارا نام کس نے درج کیا،"

"کیا تمہارا خیال ہے۔ کہ ہم خوشی سے سپاہی بنے تھے! گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا، اگر ہماری جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے!"

سب خاموش تھے، ہوا بن میں سائیں سائیں کرتی پھرتی تھی: افق دھندلا ہو گیا تھا، اور زمین اور آسمان میں فرق کرنا مشکل تھا۔ ہر چیز سورج کی روشنی میں گھلتی معلوم ہوتی تھی۔

عورتوں، مردوں اور بچوں نے خاموشی سے ان تینوں سپاہیوں کی طرف دیکھا، اُن کا خیال تھا۔ کہ سپاہی کسی دوسری دنیا کے انسان ہوتے ہیں، مگر یہ کیا! اُنہوں نے بھی کھیتوں میں کام کیا ہے!

اُنہوں نے بھی کھیتوں میں کام کیا ہے! ان آدمیوں کے اس خیال نے اُن کے دماغ میں اچانک ایک چمک پیدا کر دی، کیا یہ ممکن تھا۔ کہ ایسے کمینے سپاہی کسانوں کی طرح اُسی خمیر سے بنے تھے۔ ! مزدور! عورتوں نے کہا۔ "لیکن یہ کیوں کہ جب تمہارے پاس کھانے کو کچھ نہ ہو۔ تو تم قتل کرو اور ہر جگہ لوٹ مچاؤ"

"کیا تم نہیں جانتے کہ تم نے دوسروں پر کتنے مظالم توڑے ہیں!"

"جب تم نے کھیتوں میں کام کیا ہے تو پھر ہم کیوں —"

"خاموش! بدنصیب سپاہی پھر بولنے لگا ہے۔ ہمارے گاؤں کے تمام لوگ بھوکوں مر رہے تھے! وہ زندہ رہنا چاہتے تھے، لیکن وہ کھانے کی چیزیں کہاں سے لیتے، دنیا میں کھانے کو کافی ہے، لیکن وہ سب کسی اور کی ملکیت ہے —"

ہم نے سوچا ہم بھوکوں کیوں مریں۔ ہم نے سپاہی بننے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہمارا خیال تھا۔ کہ جنگ ایک یا دو سال رہیگی اور پھر ہم پنشن لے لینگے اور باقی زندگی چین سے گزاریں گے ہمارے جرنیلوں نے ہمیں اُن دشمنوں کو مارنے کا حکم دیا جنہیں ہم بالکل نہ جانتے تھے، سوائے اسکے وہ بھی ہماری طرح گوشت پوست کے انسان تھے۔ ہمیں بالکل پتہ نہ تھا۔ کہ ہم ایک دوسرے سے کیوں لڑتے ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید ہمارے جرنیل کی کسی اور جرنیل سے دشمنی ہے۔ سب لوگ اور عام شہری ہم سے نفرت کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے دلوں میں کسی کے لئے نفرت نہیں۔ ہم شکست خوردہ ہیں، اور ہم تینوں بھاگ آئے ہیں۔ کیونکہ ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں، بس۔ لیکن —"

"لیکن اب ہماری موت آن پہنچی ہے۔ ہمیں زندہ دفن کر دیا مار ڈالو، تمہاری مرضی — ہر حالت میں —"

وہ پھر رک گیا، اُسکے زرد دانت نظر آنے لگے، اور اُس کی آنکھیں تکان سے لبریز

اُسے راست میں لینے والے آدمی نے پریشانی سے دوسروں کی طرف دیکھا، اب جب کہ ان بدنصیبوں کی زندگی اُن کے رحم پر موقوف تھی۔ کیا انہیں بدلہ لینا چاہیئے تھا! کیا انہیں اپنا غصہ ان تینوں پر نکالنا چاہیئے۔ جنہوں نے کھیتوں میں کام کیا ہے اور جو اُن کی طرح سادہ لوح انسان ہیں۔

وہ اسی طرح، کسی فیصلہ پر پہنچے بغیر، ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے، اُن کے زرد اور بے رونق چہروں سے غم و غصہ جاتا رہا۔ اور اُس کی جگہ ہمدردی نے لے لی: وہ کیا کریں! اُن کی زندگی درد اور بھوک پیاس سے لبریز تھی، لیکن ان سپاہیوں کی زندگی بھی تو ویسی ہی تھی، وہ زندہ رہنا چاہتے تھے! اور یہ تینوں بھی! کیا ان بدنصیبوں کو اذیت دینے سے بدلہ مل جائیگا!

تینوں نوجوانوں نے، جنہوں نے انہیں پکڑ رکھا تھا۔

انہیں چھوڑ دیا۔

"لعنت! لعنت!" بابو ہاتی نے کہا، اُسکے آنسو بہنے لگے وہ اُن سے انتقام لینا چاہتا تھا، مگر اب نہ جانتا تھا۔ کہ کیا کرے

زخمی ٹانگ والا سپاہی کراہ رہا تھا، اُسکے رخساروں کی رگیں بڑھتی ہوئی تکلیف سے ابھر آئی تھیں۔

"کیا حال ہے ٹاتی!"

"درد!" ٹاتی نے آہستہ سے کہا، گویا وہ ڈرتا ہو۔ کہ کہیں اُس کی آواز نہ سن لی جائے، اُس کی ٹانگ کا زخم سُن ہو گیا تھا اور اُس نے اُسکے آدھے جسم کو اکڑا دیا تھا۔ اُسے کوئی چیز زخم میں رینگتی ہوئی معلوم ہوئی۔

"درد! آہ یہ آتشک کے زخم ہیں میں جانتا ہوں!"

اُنہوں نے اپنی آنکھیں ٹاتی کے ٹانگ پر گاڑ دیں، اُس نے اپنی تپلون کھینچی، اور اُنہوں نے دیکھا۔ کہ زخم پر سفید پٹی بندھی ہے۔ جو قرمزی خون اور زردی مائل پیپ سے تر ہے۔

"اُسے ــ"

ٹاتی نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پٹی اتارنی چاہی۔ لیکن یہ ممکن نہ تھا، پٹی خون کے ساتھ جلد سے چمٹی تھی۔

"عذاب جان ہے۔ کیوں بھائی!"

متورم چہرہ والے سپاہی نے ارد گرد کے لوگوں کی طرف دیکھا؛ وہ پانی مانگنا چاہتا تھا۔ مگر اُس کی جرأت نہ پڑتی تھی، اُس نے کہا۔ "زخم کو ابھی رہنے دو!"

دوسرے نے لرزاں ہونٹوں سے کہا۔ "لیکن یہ مجھے بہت تکلیف دے رہا ہے"

"اگر ہمارے پاس تھوڑا سا، صرف تھوڑا سا ــ" اس سے آگے متورم چہرہ والے سپاہی کی "پانی" کہنے کی جرأت نہ پڑی۔

ٹاتی نے زخم پر تھوک دیا، تھوک ریت میں ملی اور نمکین تھی۔

"پٹی کھول دو!"

اُس نے پٹی کا کپڑا کھینچا، یہ گوشت کو ساتھ لیتا آیا، اُس کی ٹانگ سے خون بہنے لگا اور زمین پر ٹپکنے لگا۔

زخم سیدھا ٹانگ میں بہت گہرا چلا گیا تھا، اور اُس میں کئی کیڑے رینگ رہے تھے، موٹے موٹے کیڑے سرخ خون اور زردی مائل پیپ میں لوٹ رہے تھے۔ ابھی کپڑا بمشکل اترا تھا۔ کہ کیڑوں نے ہلنا شروع کر دیا۔ اور زخم سے باہر نکل کر ٹاتی کے ہاتھ پر چڑھنے لگے، اور وہاں ایک پتلی سی سرخ لکیر بنا دی، بعض زمین پر گر پڑے۔ اور گرم زمین پر لوٹنے لگے۔

دیکھنے والوں نے دانت پیسے، یہ نہ جانتے ہوئے کہ کیا کریں؛ کیا وہ اُس کی مدد کریں یا نہ کریں۔

ٹاتی نے زور سے اپنے زرد دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹے اُسے درد کی ایک شدید ٹیس محسوس ہوئی، جب یہ گزر گئی۔ تو اُس نے دم روک دیا۔ اور اپنی لرزاں انگلی زخم میں ڈال دی۔

"لعنت!" وہ ایک بھاری آواز میں چلایا جس طرح کوئی اوڑھنی میں سے چلا رہا ہو۔

اُن کیڑوں کو اُس نے چٹکی میں مسل کر زمین پر پھینک دیا، اُس کی انگلیاں پسینہ سے تر ہو گئیں۔ اور جب یہ زخم کے کناروں سے لگیں۔ تو اُسے اتنا شدید درد ہوا کہ وہ سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا، متورم چہرہ والے نے دل میں کہا۔ کہ میں اُن سے پانی مانگوں لیکن اُنہیں تو ہم سے نفرت ہے۔ وہ ہمیں اذیت پہنچانا چاہتے ہیں۔ اُس نے سر اٹھا کر ٹاتی کا چہرہ دیکھا، اُسکے رخسار ابھی تک کانپ رہے تھے، کاش اُسکے پاس مشین گن ہوتی، تو وہ اُسے ابھی اس دکھ سے نجات دلا دیتا۔

اب زخم کے اندر صرف چند کیڑے رہ گئے تھے، دُبلے سپاہی نے اُنہیں پکڑنے میں مدد دی۔ اور آرام سے کہا۔ "کیا اس سے تمہیں تکلیف ہوتی ہے!"

سب کے سب افسردہ چہروں کے ساتھ اُنہیں خاموشی

سے دیکھتے رہے، انہوں نے تلوار کے زخموں کو یاد کیا۔ جو مرنے والے بیماری کے جسم پر چیونٹیوں سے بھرپور رہتے۔ جتنی جلدی وہ مرجائے بہتر ہے اور جتنا ممکن ہو تھوڑے درد کے ساتھ، مگر یہ سپاہی۔ میں یہ نہیں جانتا کہ وہ ہماری طرح تکلیف کیوں اٹھاتے!"

دبلا سپاہی ابھی تک احتیاط سے کپڑے پکڑ کر مسل رہا تھا۔

"یہ بہت ہیں!"

زخم سے خون اور پیپ بدستور بہہ رہی تھی۔ تاشی نے اُس پر تھوک دیا؛ اور سفید پٹی کو باندھنے کے لئے اٹھایا، لمبے آدمی نے کہا۔ "تم پانی کے بغیر ایسا نہیں کرسکتے"

پانی! تینوں سپاہیوں نے اپنی حیرت زدہ آنکھیں لمبے آدمی پہ گاڑ دیں؛ پانی کہاں سے مل سکتا ہے! وہ دو راتوں اور ایک طویل دن تک پیاس سے دیوانے ہو کر اس جھلس دینے والی ریت پر چلتے رہے ہیں۔ وہاں پینے کو کچھ نہ تھا، زخم کہاں سے صاف کریں انہیں ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ انہوں نے دس سال سے پانی نہیں پیا، سوائے پسینے کے جو نمکین تھا، آسمان زرد تھا۔ ریت زرد تھی سورج شعلے اگل رہا تھا اور ہوا جلا رہی تھی، کیا ایسی دنیا میں پانی مل سکتا تھا!

تینوں سپاہیوں نے پسینہ چاٹا۔ جو اُن کے ہونٹوں پر چھوٹے چھوٹے قطروں میں نمودار ہو رہا تھا۔

یاپو ہائی نے گہری آہ بھری اور چلایا۔ "لیکن تم ایسے عذاب میں کیوں گرفتار ہو"

"ہمارا عذاب ابھی ختم نہیں ہوا —"

ایک ہی دنیا اور ایک جیسی بدبختی میں رہ کر وہ ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو گئے تھے، یہ کیوں؟ اور اب وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے تھے۔ اور پھر اُسی دنیا میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ جو سب کے لئے یکساں تھی؛ ایک دنیا جہاں صرف زرد آسمان زرد زمین اور جلانے والا آفتاب تھا، جہاں کھانے پینے کو کچھ نہ تھا۔ لمبے آدمی نے پوچھا۔ "تم نے کتنے دنوں سے پانی نہیں پیا۔ چھ آنکھیں مبہم طور پر اُس کی طرف دیکھنے لگیں، لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولے، اُن کے گلے اتنے خشک ہو گئے تھے کہ اُن سے بمشکل کوئی آواز نکل سکتی تھی، اُن کے پیٹ میں درد ہو رہا تھا لیکن وہ یہ نہ جانتے تھے۔ کہ یہ کوئی بیماری ہے یا بھوک!

لمبا آدمی چلا گیا، اُس کا چہرہ وفورِ جذبات سے تاریک سا ہو رہا تھا۔ سب اُسے خاموشی سے دیکھتے رہے، اور جب وہ اُن میں سے گزرا تو انہوں نے اُسکے لئے راستہ چھوڑ دیا۔

اس مکمل خاموشی میں انہیں ایسا معلوم ہوا کہ کسی چیز کے تڑخنے کی آواز آرہی ہے، انہوں نے سوچا کہ شاید زمین سورج کی شدید گرمی کے باعث پھٹ رہی ہے۔

ایک لمحہ بعد لمبا آدمی واپس آگیا، اُسکے پاس مٹی کا ایک برتن تھا، وہ کہنے لگا۔ "لے کتیا کے بچے پی!"

کیا یہ سچ تھا۔ اُس کا مطلب کیا تھا۔ تینوں سپاہیوں نے حیرت سے اپنی آنکھیں کھولدیں، معاً اُن میں سے ایک نے لمبے آدمی کو اپنے بازوؤں میں پکڑ لیا، اور گرمجوشی سے بغل گیر ہو گیا اُن سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

اُن میں سے ہر ایک نے اُس برتن میں سے جی بھر کر پانی پیا، ٹاشی نے اپنے زخم پر بھی چھڑکا۔

آخر وہ پریشانی جاتی رہی، ہر ایک کا خیال تھا کہ مجھے ضرور ان بدنصیبوں کی مدد کرنی چاہیئے۔ لیکن کسی نے بھی کچھ نہ کیا، وہ سب جانتے تھے۔ کہ یہ بھی اُنہیں کی طرح تین انسان تھے اور اُن سے بھی ویسا ہی سلوک کرنا چاہیئے، اب اُن کے دلوں میں اُن سے انتقام لینے کا خیال نہ تھا، وہ کہتے کہ وہ بھی ہماری طرح مصیبت میں ہیں، لیکن کسی نے بھی اُس رحم کو جو وہ محسوس کرتے تھے عملی جامہ نہ پہنایا۔

وہ اتنی جلدی نفرت کو محبت میں بدل دینے پر شرمندہ ہو رہے تھے، وہ سوچتے۔ "کیا ہم ان تینوں کو تکلیف میں دیکھتے رہیں یہ تینوں ہمارے بھائی ہیں!"

سب نے اُس لمبے آدمی کی طرف دیکھا۔ جس نے پہل کی تھی۔ اور جس نے اُنہیں بچا لیا تھا، وہ تینوں کو رہا کرنے میں مصروف

ہو گئے۔

متورم چہرہ والے نے سانس کے لئے ہانپتے ہوئے کہا: "شکریہ۔ شکریہ۔ میرے ہمو طنو میں تمہیں کبھی نہ بھولونگا — مجھے پینے کو کچھ مل گیا ہے —— اب ہمیں زندہ دفن کر دو یا ہماری کھال کھینچ دو، جیسے تمہاری مرضی — میں کچھ نہ کہونگا — میں تمہیں ہرگز نہ بھولونگا — "

ملبے آدمی نے بے چینی سے کہا۔ "تم ایسی باتیں کیوں کرتے ہو! آخر —— "

تینوں سپاہیوں نے خیال کیا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہے ہیں

"بہرحال تم اور ہم — ہم سب — ایک ہی کشتی میں سوار ہیں"

ابھی اُس نے یہ کہا ہی تھا۔ کہ ٹاشی بے ہوش ہو گیا، اُسکا سر ایک پندرہ یا سولہ سال کے لڑکے کے ساتھ جا لگا، لڑکے نے اُس کا سر ہاتھوں سے تھام لیا: وہ نہ جانتا تھا۔ کہ کیا کرے، پہلے اُس نے ایک طرف دیکھا۔ پھر دوسری طرف، گویا اُس نے کوئی قیمتی چیز پکڑ رکھی ہو جسکے ٹوٹ جانیکا خطرہ ہو!

"ٹاشی! ٹاشی!"

ٹاشی کا سر لڑکے کے ہاتھوں سے پھسل کر زمین پر آ رہا، وہ کانپا، اُس کا خیال تھا کہ یہ ٹوٹ گیا ہے، اُس نے ارد گرد دیکھا، گویا وہ معافی مانگ رہا ہو۔

ایک لمبے گروہ سے اٹھے ہوئے ہاتھ نے اُس کی پیشانی کو چھو کر کہا۔ بخار!"

"اُوہ — ہائے! "ٹاشی کراہا، وہ زمین پر لوٹنے لگا، اُس نے اپنے ہاتھ ریت میں گاڑ دیئے۔ اُس کا منہ کھلا تھا۔ اور وہ دانتوں سے زمین کو کاٹ رہا تھا: اُس نے آنکھیں آدھی بند کر لیں، اُس نے بے شمار چمکیلی رنگین تصویریں اپنے سامنے پھرتی دیکھیں۔ اُن کے درمیان اُسے اپنا گھر دکھائی دیا۔ اُس کی فاقہ زدہ ماں رو رہی تھی، وہ پھر کراہنے لگا، اور دانت پیسنے لگا۔

"ٹاشی تھوڑا سا پانی پی لو!"

ہوا تیزی سے چلنے لگی، اور اُن کے چہروں کو اور پشت کو جلانے لگی، انہوں نے خیال کیا۔ کہ اُنہیں جلتے ہوئے گوشت کی بو آ رہی ہے، گرمی کوئی مجسم چیز معلوم ہوتی تھی ......

...... ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ آسمان سے بارش کی طرح نازل ہو رہی ہے اور زمین سے بھاپ کی طرح اٹھتی اور افق پر بادل کی طرح چھا رہی ہے، قرمزی آفتاب گرد کے گہرے بادلوں میں نصف نظر آتا تھا۔

بچوں نے دیکھا کہ بیگاری کی بھی نازک حالت ہے، وہ سرگوشیاں کرنے لگے۔ "بیگاری! اُسے دیکھو — وہ — وہ" وہ ابھی ابھی مرا تھا۔

عورتوں نے اُسکے جسم پر کھڑے ہو کر سر جھکا کر اشک آلود آنکھوں کے ساتھ فاتحہ پڑھی، اُن کے گرد و پیش کی ہر چیز خاموش معلوم ہوتی تھی۔ اسی خاموشی میں مرد سڑک کے کنارے بیگاری کی قبر کھودنے چلے گئے، اُنہوں نے منہ سے ایک لفظ نہ نکالا، گویا وہ خوفزدہ تھے۔ کہ کہیں وہ جاگ نہ پڑے

آخر اُنہوں نے بڑے آرام سے اُسے قبر میں اتار دیا، اور زرد ریت سے اُس کا جسم ڈھانپ دیا۔ وہ آہستہ سے کہنے لگے۔ آرام کرو، ہم تمہاری موت کو نہ بھولیں گے، دوسرے سال — "

دوسرے سال! دوسرے سال وہ آپ کہاں ہونگے! لیکن انہیں زندہ رہنا چاہیئے اور کھانے کو خوراک اور پینے کو پانی تلاش کرنا چاہیئے!

اُنہوں نے ایک قریبی درخت سے چند خشک ٹہنیاں توڑیں اور یادگار کے طور پر قبر کے اوپر گاڑ دیں، پھر دبلے اور متورم چہرہ والے سپاہی سے پوچھا۔ "اب تم کہاں جاؤ گے!"

"کون جانتا ہے! اب جبکہ ہم تباہ ہو چکے ہیں۔ ہمیں ضرور کسی جگہ خوراک تلاش کرنی چاہیئے۔

تو آؤ سب اکٹھے چلیں، شاید ہمیں لیو کے قصبہ میں کچھ کھانے کو مل جائے۔

پھٹے پرانے کپڑوں والا گروہ، مرد، عورتیں اور بچے اور اُن کے پیچھے وہ تین سپاہی، پھر اُسی نہ ختم ہونے والی سڑک پہ چلے

لمبے آدمی اور چیچک رو آدمی نے ٹانئی کو اٹھا لیا، اُن کے جسم گرم ریت میں دھنس گئے، وہ بڑے آرام سے سفر کر رہے تھے گرد میں اور نیچے زرد زمین پر گرتے پڑتے چلے جاتے تھے۔ اور اپنے پیچھے گرد کا ایک بادل چھوڑتے جاتے تھے۔

ٹانئی کا چہرہ سفید ہو رہا تھا، وہ اپنے تئیں سیدھا نہ رکھ سکتا تھا؛ اُسکے بازو اُن آدمیوں کے کندھوں سے جنہوں نے اُسے سہارا دے رکھا تھا؛ نیچے گر پڑے، اور وہ زمین پر آ رہا۔ اُس کا سر گرد میں پڑا تھا، اُس کا دم گھٹ رہا تھا، اُسکے نتھنوں کے سانس سے ریت رقص کرنے لگی۔

"تمہارا کیا حال ہے ٹانئی — ٹانئی —"

ٹانئی نے کف آلودہ سیاہ ہونٹوں سے کہا "مجھے مار ڈالو! میں اب کھڑا نہیں رہ سکتا بھائی — مجھے مار ڈالو — بھائی —"

سب رک گئے۔

ٹانئی درد سے چلّایا۔ "میرے ہمولنو، میرے ہمولنو! میرے پیارے بھائیو، میں اب برداشت نہیں کر سکتا۔ آہ — آہ — میرے بھائیو!"

آفتاب مغرب کی جانب غروب ہو رہا تھا، تھوڑی دیر بعد اُنہوں نے سڑک کے پہلو میں دوسری قبر کھودی اور اُس میں ٹانئی کو دفن کر دیا، متورم چہرہ والے سپاہی نے اپنی جیب سے دو پانسے نکالے۔ اور انہیں ٹانئی کے جسم پر پہلو میں رکھ دیا، اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے اور مدھم آواز میں کہنے لگا۔ "اگلے دن تم نے مجھ سے یہ مانگے تھے - اور میں نے تمہیں نہیں دئے تھے، اب تم انہیں لے لو۔ ٹانئی - تمہاری بوڑھی ماں - میں اُس سے کہدونگا - میں اُسے تسلی دونگا - میں اُسے تسلی دونگا!"

اُس نے ایک مرتبہ پھر پانسوں کی طرف دیکھا، گویا اُس نے محسوس کیا ہو کہ وہ یہاں زیادہ محفوظ نہیں، اُس نے انہیں اٹھا لیا - اور مرنے والے کی جیب میں ڈال دیا۔

لمبے اور چیچک رو دونوں نے یہ معلوم کر کے کہ اب وہ اُس کا بوجھ کندھوں پر نہیں اٹھا سکیں گے؛ ایک آہ بھری، اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اُن کے نتھنے کانپنے لگے، اُنہوں نے اپنی آنکھیں اوپر آسمان کی طرف اٹھائیں تاکہ اُن کے آنسو نیچے نہ گریں۔

پاپو ٹانئی غم سے چلایا۔ "لعنت! ہماری سب کی یکساں حالت ہے، لعنت! آہ میری قینول!"

دبلے سپاہی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہم کتنے بیوقوف ہیں!"

سب خاموش رہے، لیکن سب سمجھ گئے کہ اُس کا کیا مطلب ہے۔

"مشین گن چھن گئی! لعنت! کاش وہ ہمارے پاس ہوتی، تو ہم بتا دیتے کہ ہم کسی کی کیا پرواہ کرتے ہیں!"

اُنہوں نے اپنے گردوپیش، گویا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے شعلے اگلتا ہوا سورج، زرد ریت اور تپتی ہوئی افق دیکھی، اُنہوں نے ایک ساتھ آبلے پڑے ہوئے قدم اٹھائے اور چل پڑے اُنہوں نے خوراک کے متعلق کوئی بات نہ کی، نہ یہ کہ انہیں دوسرے گاؤں میں کیا ملے گا، بس وہ تپتی ہوئی ریت پر آگے روانہ ہو گئے۔

— ·· —

میکسم گورکی

مترجم حسن عباس

ڈورا

سینٹوریم میں تپ دق کے آٹھ مریض تھے ، اس مرض کے شکار عموماً متلون اور وہمی ہوتے ہیں۔ ان کا مزاج چڑچڑا تو نہیں لیکن وہ انتہائی خوف ، غم اور غصّہ کی وجہ سے لاپرواہی اختیار کرلیتے ہیں۔ تپ دق کے جراثیم بھی عجیب ستم گر ہیں ، یہ انسان کو گھن کی طرح کھانے کے ساتھ ساتھ ہی اس کے اندر زندہ رہنے کی ایک تڑپ سی پیدا کر دیتے ہیں۔

کریمیا کے ایک بورڈنگ ہاؤس میں تپ دق کے آٹھ مریض ڈورا نامی ایک نرس کی حفاظت میں تھے ۔ وہ خاصی لمبی ، جوان اور نازک جسم کی تھی ، اس کا چہرہ شگفتہ اور سُرخ سُرخ ہونٹوں پر ایک حسین مسکراہٹ ہمیشہ کھیلتی نظر آتی تھی ، وہ بالکل الھڑ تھی اور اسی لیئے جب کبھی وہ چالاک بننے کی کوشش بھی کرتی تو بالکل بگلی سی معلوم ہوتی اگر کوئی مریض اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرتا تو وہ بڑی سادگی سے اس بدقسمت موت کے چنگل میں گرفتار انسان کا ہاتھ پرے ہٹا دیتی اور کہتی ۔ " دیکھو تمہارے لئے ایسا کرنا مناسب نہیں۔"

اکثر لوگوں نے اس سے محبت کرنے کی کوشش کی ۔ ایک ماہی گیر نے بھی جال بچھایا مگر بے سود ۔ وہ اس کے ظاہری حسن ، سڈول جسم اور نرم مزاجی پر لٹو تھے ، لیکن وہ اپنی زندگی کے سرمائے کو سنبھالے بیٹھی تھی ۔ اس دولت مند انسان کی طرح جو جانتا ہے کہ سرمایہ لگانے کا بہترین موقع کونسا ہے ۔

رات کو جب سب سو جاتے تو وہ ایک سیاہ رومال ، جس کے کونے پر ایک گلاب کا پھول کاڑھا ہوا تھا ، سر کے گرد لپیٹ کر باہر چھجے پر آجاتی اور گھٹنوں کے بل ہو کر آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر کہتی :-

" اے یسوع مسیح ، اے سینٹ نکولس ، خدا کے ادنیٰ خادم ...."

ڈورا کی طبیعت میں کوئی شعریت نہ تھی ، پھولوں سے کوئی لگاؤ نہ تھا ۔ ایک دن دق کی شکار ایک پادری کی بیوی نے آسمان پر بکھرے ہوئے ستاروں کی تعریف کی تو ڈورا نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ آسمان آملیٹ کی مانند ہے۔

ایک دن نوائی مریض اس سینٹوریم میں داخل ہوا۔ وہ بڑی مشکل سے ہانپتا ہوا سیڑھیاں چڑھ کر چھجے پر پہنچا اور ڈورا سے مخاطب ہو کر بولا :- " دیکھو ، میں کتنا اچھا آدمی ہوں "ـــــ اُس نے مسرت بھرے لہجے میں یہ الفاظ کہے اور پھر اس کے سینے کا ابھار دیکھ کر بولا ۔" تمہاری صحت کتنی اچھی ہے ، کیا تم مجھے بھی دوبارہ تندرستی حاصل کرنے میں مدد دو گی ؟"

" کیوں نہیں " ڈورا نے جواب دیا۔

اس مریض کا چہرہ اُلو سا اور آنکھیں بالکل بلی ایسی تھیں مڑی ہوئی ناک اور سیاہ مونچھیں ـــــ وہ بالکل مسخرہ معلوم ہوتا تھا۔

اس دن سے ڈورا کی طبیعت میں بہت فرق آگیا ۔ اسے اب ہماری حفاظت کا اتنا خیال نہ تھا ، ہمارے شکایت کرنے پر بھی وہ یونہی دانت پیستی رہتی ، اتنا ضرور تھا کہ اب اس کی آنکھوں میں غیر معمولی طور پر ایک مستی سی جھلکیاں لیتی نظر آتی ، جیسے کسی نے ان میں مدھ بھر دی ہو ـــــ وہ تو شاید جان بوجھ کر گونگی اور اندھی بن گئی تھی ، اس کا کام صرف چھجے پر اُس اُلو کی سی شکل والے طالب علم فلوتپ کے ساتھ باتیں کرنا تھا ۔ وہ کھانستا اور ہانپتا نظر آتا تھا ، دن میں بھی اکثر وہ فرصت کے وقت اس کے پاس رہتی اور شام کو سورج غروب ہوتے ہی اس کے کمرے میں چلی جاتی۔

اسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ مر رہا ہے ـــــ تبسم

فرشتے وہ میں موت ؛ وہ اکثر کوئی فرحیہ راگ گنگنانے کی کوشش
نا لیکن کھانسی حائل ہو جاتی۔

" اِن حماقتوں کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے میرے رفیق ؟" وہ
ہوا مجھ سے دریافت کرتا ــــ صبح ، شام ، پیدائش ، موت ،
ہار اور محبت ؟ ــــ محض حماقتیں ؟ ــــ ایک چھبیس سالہ نوجوان
لئے ، میری مراد اپنی ذات اور ...... اور ڈورا ......"

اس وقت چمچیوں وغیرہ کے اٹھانے رکھنے کی آواز آتی اور
ہر فقرہ اخاموش اُس کا فرمان بجالانے کے لئے سامنے آ کھڑی
ہتی۔

" میری پیاری ہتھنی ، مجھے کچھ انگور لا دو ، جلدی ــــ" وہ اسے
کم دیتا اور میری طرف نگاہیں پھیر کر کہتا ، " اُلّھڑ اور بے وقوف
لڑکی !"

اُسے دوسرے مریضوں سے نفرت تھی ، اور خود بھی وہ انہیں
پسند تھا ، میرا وہ دوست تھا کیونکہ ہم دونوں کا لٹریچر سے
بہت لگاؤ تھا اور اسی وجہ سے ہم ایک دوسرے کے بہت نزدیک
تھے۔

" لٹریچر انسان کی بہترین ایجاد ہے لیکن یہ زندگی سے جتنا دور
ہے اُتنا اچھا......"

اسکی باتیں سُن کر مجھے احساس ہوا کہ جسم کی نسبت اسکی روح
زیادہ بیمار ہے ، زخم خوردہ ہے۔ بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہونے
کے ۲۶ ویں دن اس کی رُوح نے جسم کو آزاد کر دیا۔ نزع کے عالم
میں اس کی زبان پر یہ الفاظ تھے ــــ " فیما ، ...... میری پیاری
...... ساری زندگی تجھ سے محبت کی ...... صرف تجھ سے ......
فیما ...... پیاری فیما "

میں اس وقت اس کی چارپائی کی پائینتی کی طرف بیٹھا تھا۔
ڈورا سرہانے بیٹھی اپنی انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی
کر رہی تھی۔ وہ اپنی بغل میں ایک پارسل دبائے تھی۔

" یہ کیا کہہ رہا ہے ؟" اس نے جلدی سے اُٹھ کر کہا۔ فیما ......
فیما کون ...... ؟"

" ایک لڑکی جس سے اُس نے کبھی محبت کی ہوگی ، وہ اب اسی
کا نام لے رہا ہے " میں نے کہا۔

" فیما سے محبت ؟" ڈورا نے بلند آواز میں کہا " نہیں وہ
تو مجھ سے محبت کرتا رہا ہے ــــ وہ جب سے یہاں آیا مجھ سے
محبت ......"

نزع کے عالم میں طالب علم کے لب پھر وہی الفاظ دوہرا
رہے تھے۔ ڈورا زرد ہو رہی تھی۔ اس کے ابرو کھنچ گئے اور رومال
سے منہ صاف کرتے ہوئے اس نے وہ پارسل میری طرف پھینک
کر کہا۔ " یہ ہے اس کا کفن " ــــ اس کے بعد فوراً وہ خاموش
کمرے سے باہر نکل گئی۔

بیس منٹ بعد زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار فلوپ کی
گنگناہٹ بند ہو گئی۔ اس نے ایک آہ کھینچی۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ
کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن اس کے لب الفاظ ادا نہ کر سکے۔ اس کا جسم
اپنی کمزور ہڈیوں سمیت اکڑ گیا ــــ وہ ہمیشہ کے لئے بے حس
ہو چکا تھا۔

میں ڈورا کو تلاش کرنے باہر نکلا۔ وہ چھجے پر کھڑی اپنی نگاہوں
سے دُور ، بہت دُور ، آسمان اور سمندر کی تاریکی کو آپس میں خلط ملط
ہوتے دیکھ رہی تھی۔ دفعتہً اس نے میری طرف نگاہیں پھیریں

" ڈورا ، فلوپ مر چکا ، اسے کفن تو پہنا دو !"

" نہیں ، ہرگز نہیں "، اس نے کہا " میں اس قسم کے انسان
کو چھونا نہیں چاہتی ، بھلا دیکھو تو ، وہ ہمیشہ یہی کہتا رہا۔ کہ اسے
مجھ سے محبت ہے لیکن درحقیقت ......"

" لیکن تمہیں معلوم تھا کہ وہ جینے کا نہیں ؟"

" کیوں نہیں ، میں کوئی اندھی تھوڑی ہوں۔ میں نے اس کا کفن
خریدنے کے لئے اپنا سارا اندوختہ صرف کر دیا۔ پہلے ہی دن اسکی صورت
دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا تھا۔ کہ وہ دنوں کا مہمان ہے لیکن آخر سب
کو مرنا ہے۔ یونہی جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ ؟ وہ کہتا تھا کہ میں نے
کبھی کسی لڑکی سے محبت نہیں کی۔ لیکن دیکھو مرتے وقت وہ کیا
گنگنا رہا تھا۔ انسان مر جائے لیکن کسی کو یوں فریب نہ دے۔

انہوں نے بڑی مدھم آواز میں یہ الفاظ کہے۔ جیسے اس کا ذہن کسی اور طرف متوجہ ہو۔ پھر ایکا ایکی اس نے ایک آہ بھری ـــــ درد سے لبریز ـــــ جیسے کوئی لبالب بھرا ہوا گرم مشروب ایک ہی گھونٹ میں پی لے اور اس کا منہ جل جائے۔

"آؤ فوما!"

"تمہیں مگر تمہیں اس کا اتنا ہی درد ہے۔ تو خود ہی اسے کفن پہنا دو۔ میں تو جانے کی نہیں۔"

"مجھے مُردے کو کفن پہنانا نہیں آتا۔"

"میری بلا سے! میں اس کی کوئی اپنی تھوڑا ہوں۔"

"لیکن وہ بچارا تو مر چکا۔"

"میں تو اسے ایک نظر بھی دیکھنا گوارا نہ کروں گی ـــ کسی کو فریب دینا۔"

میں نے ہزار کوشش کی۔ لیکن ڈورا اپنی ضد پر قائم تھی وہ پیچھے پر اکیلی کھڑی رہی۔

جب میں فلوپ کو کفن پہنا رہا تھا۔ تو میرے کانوں میں آہ وزاری کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے باہر صحن پر نکل آیا۔

بعض اوقات انسان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہ نکلتے ہیں۔ ڈورا رو رہی تھی۔ اور فرش پر گھٹنوں کے بل ہو کر وہ آہیں بھرتی کپکپی کے ساتھ اپنا سر مار مار کر کہہ رہی تھی۔

"میرے ظالم محبوب ..... میرے پیارے ..... مجھے نہ بھولنے والے ...."

علامہ اقبالؒ پر لکھی ہوئی تصنیفات

سیرتِ اقبالؒ

از محمد طاہر فاروقی ایم اے۔ قیمت مجلد تین روپے آٹھ آنے ـــــ علامہ اقبال ملک کے سچے رہنما تھے۔ انکی زندگی ہمارے لئے مشعلِ راہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اس شاعرِ ربانی۔ فقید المثال اور عدیم النظیر ہمدردِ بنی نوعِ انسان کی تعلیمات اور سیرت پر اردو میں پہلی مستند اور جامع کتاب ہے۔ ابتدا میں علامہ اقبال کے سوانح حیات، پھر آپ کی شاعری کے مختلف دور، تخیل کے تدریجی ارتقا اور تصانیف پر ادبی و تنقیدی حیثیت پر بحث کی گئی ہے اور علامہ اقبال کا پیغام جو تمام دنیا کے نام ہے بیان کیا گیا ہے۔ اخیر میں مذہبی، سیاسی اور معاشرتی مسائل پر علامہ کے نظریات نہایت تفصیل سے پیش کئے ہیں اقبال اور کلامِ اقبال کا لب لباب معلوم کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

فلسفہ بیخودی

یہ کتاب بھی طارق صاحب نے اردو نظم میں تحریر فرمائی ہے اس میں علامہ اقبال کی زندہ جاوید مثنوی "رموزِ بیخودی" کے اسرار و حکم بیان کرنے کے علاوہ فرد و ملت کے ربط و ضبط اور حیاتِ اجتماعی کے فیوض پر زیادہ بسیط پیرایہ میں روشنی ڈالی گئی ہے تفسیرِ خودی کے ساتھ ہی ساتھ اس کتاب کا مطالعہ بھی سونے پر سہاگہ کا حکم رکھتا ہے۔ کتابت طباعت عمدہ ضخامت ۸۰ صفحات۔ قیمت مجلد صرف بارہ آنے۔

تفسیرِ خودی

از عبدالرحمٰن طارق بی۔ اے قیمت [illegible]

یہ کتاب تمام و کمال اردو نظم میں لکھی گئی ہے۔ اندازِ بیان نہایت دلکش اور زبان صاف و واضح ہوا ہے، اس میں علامہ سر اقبالؒ کی شہرۂ آفاق مثنوی اسرارِ خودی کے حقائق و مقاصد بیان کرنے کے علاوہ لفظِ خودی پر اس قدر جامع و مانع اور بصیرت افروز بحث کی گئی ہے کہ آپ یقیناً اسے اردو زبان کا پہلا عظیم الشان معجزہ تسلیم کریں گے جیسا

اقبال اور دخترانِ ملت

از اے۔ آر۔ طارق۔ اس رسالہ میں ایک مبسوط تبصرہ علامہ اقبال کے اُن تمام فارسی اور اردو اشعار کی تشریح و توضیح پیش کی گئی ہے جو انہوں نے خاص طور پر عورت کی شان و عظمت اور تعلیم و تربیت کے متعلق ارشاد فرمائے ہیں۔ اس عنوان پر یہ ایک نہایت بسیط اور عجیب مقالہ ہے۔ اور قابلِ مطالعہ۔ قیمت مجلد صرف [illegible]

DUE DATE

Cl. No. *Acc. No.*

Late Fine Ordinary books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1/-** per day. Over Night book **Re. 1/-** per day.
